ماہنامہ

حنا

JULY 2005

خاص نمبر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامیات

حمد — برگ یوسفی — 7
نعت — رعنا شہزاد — 7
پیارے نبی کی پیاری باتیں — سید اختر ناز — 8

انٹرویو

ہاکی پلیئر بابر عبداللہ کی باتیں — بابر محمود — 15
ماڈل و اداکارہ جیا علی سے ملاقات — عبداللہ — 21

انشانامہ

ہم تقریر سے کتراتے ہیں — ابن انشاء — 13

ناولٹ

گلاب رت کے فراق لمحے — زریں اطہر — 96

ناول

ساحلوں کی اداسی — زرنین آرزو — 26
عشق کے روگ ہزار سائیں — سیما بنت عاصم — 176

مکمل ناول

گواہی دل کی — شمع جبیں — 44
پہلی بات ہی آخری — نبیہ نقوی — 140

چودھری سردار محمود نے نواز پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ "حنا" 205 سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔ فون نمبر: 7321690-7310797 ای میل lhracd@hotmail.com

افسانے

خاص نمبر

مقدر کا ستارہ — سباس گل — 85
عشق میں کیسی مجبوری — تحسین اختر — 124
آؤ دیا جلائیں — فوزیہ غزل — 195
تعویذ محبت — صائمہ محبوب الٰہی — 206
رت ہی بدل گئی — عینی رضا — 218

سلسلے مستقل

حاصل مطالعہ — فرزانہ سلیم — 230
بیاض — تسنیم طاہر — 234
رنگ حنا — بلقیس بھٹی — 243
حنا کی محفل — عین غین — 247
میری ڈائری سے — صائمہ محمود — 249
حنا کا دسترخوان — ثمینہ احتشام — 251
خبرنامہ — عبداللہ — 253
کس قیامت کے یہ نامے — ادارہ — 255

ماہنامہ "حنا" میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کا کسی بھی حصے کی اشاعت یا الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے کسی بھی انداز میں پیش کرنے سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے

کچھ باتیں ہماری

قارئین کرام! حنا کا شمارہ جولائی ۲۰۰۵ء پیش خدمت ہے۔

بجٹ کے بعد سے اشیائے صرف کی قیمتوں میں ہوشربا اضافہ ہو رہا ہے اور ہر چیز کی قیمت آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ جس کی وجہ سے عام آدمی مایوسی، فرسٹریشن اور ڈپریشن کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حالات سے تنگ آ کر خودکشی کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ فرسٹریشن کے شکار لوگ بجائے حالات کا مقابلہ کرنے کے خود آگے بڑھ کر موت کو گلے لگاتے ہیں؟ شاید یہ کہ ہم میں حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہیں رہی ہے اور ہم ہتھیار پھینک کر موت کی آغوش میں ہمیشہ کے لیے سو جانا پسند کرتے ہیں۔

ذرا سوچیے کہ کیا یہ رویہ درست ہے؟ یاد رکھیے ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوتا ہے۔ بات صرف اور صرف اس کو تلاش کرنے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو زندگی بخشی ہے وہ اس کی ایک نعمت ہے۔ ہمیں اس نعمت کی قدر کرنا چاہیے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ زندگی کے میدان میں دوسری اننگز نہیں ہوتی۔ زندگی آپ کی سب سے قیمتی متاع ہے۔ اس کو مایوسی کا شکار ہونے سے بچائیے۔ خود بھی خوش رہیں اور اپنے اردگرد بھی خوشیاں بکھیریں۔ پھر دیکھیے اللہ تعالیٰ کیسے کامیابی آپ کا مقدر کرتا ہے۔

اس شمارے میں: اداکارہ جیا علی سے ملاقات۔ اس ماہ کی شخصیت میں بابر عبداللہ کی باتیں۔ شمع جبیں اور نبیہ نقوی کا مکمل ناول۔ زریں اطہر کا ناولٹ۔ سباس گل، تحسین اختر، فوزیہ غزل، عینی رضا اور صائمہ محبوب الٰہی کے افسانے۔ زرنین آرزو اور سیما بنت عاصم کے سلسلے وار ناولوں کے علاوہ حنا کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر
سردار محمود

حمد باری تعالیٰ

باتیں ہوں جب کہ لوح و قلم کے شعور کی
لکھے گا کون حمد، خدائے غفور کی
ہر سمت اس کے حسن و تجلی کا ہے ہجوم
دل کی نظر نہیں ہے یہ مشعل ہے طور کی
وہ ہمہ اوست ہو کہ ہو وہ وحدت الوجود
شاہد ہر ایک چیز ہے اس کے حضور کی
اس رحمت تمام نے خالق ہے جس کا نام
بندوں کی سمت چشم توجہ ضرور کی
سنتا ہے سب کی وہ کہ سمیع و علیم ہے
وہ پاس کی صدا ہو کہ آواز دور کی
مجھ کو تو اس کی شاد کریمی پر ناز ہے
ہے حاجت قصور تمنا نہ حور کی
ممکن کہاں ہے معرفت حق یہاں مگر
ہر سو نشانیاں ہیں اسی کے ظہور کی
اے دنیا والو بزم چراغاں سے فائدہ
دل میں جلاؤ شمع مگر اس کے نور کی
مستغنی عبادت عالم ہے اس کی ذات
ذات خدا ہے برگ انا و غرور کی

برگ یوسفی

نعت ﷺ

ناشر قرآن ہے وہ شارح قرآن وہؐ
ہر زمانے کے لیے بس حاصل ایمان وہؐ
دشمن جاں آپ کے اپنے پرائے تھے مگر
دشمنان جان کو دیتے رہے فیضان وہؐ
ہر مخالف آپ کا فتنے جگاتا ہی رہا
پڑ گئی جس پر نظر دینے لگا پھر جان وہؐ
بن گئے مینار عظمت کا زمانے کے لیے
دے گئے صحرا نشینوں کو عجب اک شان وہؐ
انبیا تھے شادماں سارے ملائک منتظر
جس گھڑی پہنچا زمیں سے عرش کا مہماں وہؐ
بادشاہی بھی فقیروں کی نظر میں کچھ نہیں
رحمت للعالمین نے دے دیا عرفان وہ
انبیاء کا تاجور ہے شان اس کی منفرد
دین کی تکمیل اسؐ پر دین کا سلطان وہؐ
حشر کے دن عاصیوں کی آپؐ پر ہوگی نظر
مغفرت کے باب میں شہزاد ہیں برہان

رعنا شہزاد علی خان

سید اختر ناز

پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں

ممانعت

سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے مقام بقیع میں دوسرے شخص کو پکارا۔ "اے ابوالقاسم!"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُدھر دیکھا تو وہ شخص بولا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پکارا تھا بلکہ فلاں شخص کو پکارا تھا (اس کی کنیت بھی ابوالقاسم ہوگی)"

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میرے نام سے نام رکھ لو مگر میری کنیت کی طرح کنیت مت رکھو۔"

(مسلم)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ نام رکھنا

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔ "ہم میں سے ایک شخص کے ہاں لڑکا پیدا ہوا اور اس نے اس کا نام محمد رکھا۔" لوگوں نے کہا۔ "ہم تجھے کنیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے نہیں رکھیں گے۔ (یعنی تجھے ابو محمد نہیں کہیں گے) جب تک تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت نہ لے۔"

وہ شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "میرا ایک لڑکا پیدا ہوا ہے تو میں نے اس کا نام محمد رکھا تو میری قوم کے لوگ اس نام کی اجازت، مجھے دینے سے انکار کرتے ہیں (جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجازت نہ دیں)۔"

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "میرے نام پر نام رکھو لیکن میری کنیت نہ رکھو کیونکہ میں قاسم ہوں، میں تمہارے درمیان تقسیم کرتا ہوں (دین کا علم اور مال غنیمت وغیرہ)۔"

(مسلم)

اللہ تعالیٰ کے ہاں بہترین نام

سیدنا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تمہارے ناموں میں سے بہترین نام اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ہیں، عبداللہ اور عبدالرحمٰن۔"

بچے کا نام عبدالرحمٰن رکھنا

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم میں سے ایک شخص کے لڑکا پیدا ہوا تو اس نے اس کا نام قاسم رکھا تو ہم لوگوں نے کہا کہ ہم تجھے ابو القاسم کنیت نہ دیں گے اور تیری آنکھ ٹھنڈی نہ کریں گے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور یہ بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اپنے بیٹے کا نام عبدالرحمٰن رکھ لے۔"

(مسلم)

ہاتھ پھیرنا اور اس کے لیے دعا کرنا

عروہ بن زبیر اور فاطمہ بنت منذر بن زبیر سے روایت ہے کہ ان دونوں نے کہا کہ سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا (مکہ سے) ہجرت کی نیت سے اس وقت نکلیں تو ان کے پیٹ میں عبداللہ بن زبیر تھے، جب وہ قبا میں آکر اتریں تو وہاں سیدنا عبداللہ بن زبیر پیدا ہوئے، پھر انہیں لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو گھٹی دیں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا سے لے لیا، اپنی گود میں بٹھایا پھر ایک کھجور منگوائی۔ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ہم ایک گھڑی تک کھجور ڈھونڈتے رہے۔

آخر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کو چبایا پھر (اس کا جوس) ان کے منہ میں ڈال دیا تو پہلی چیز جو عبداللہ کے پیٹ میں پہنچی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لعاب تھا۔ سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ پر ہاتھ پھیرا اور ان کے لیے دعا کی اور ان کا نام عبداللہ رکھا اور جب وہ سات یا آٹھ برس کے ہوئے تو سیدنا زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اشارے پر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کے لیے آئے تو جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آتے دیکھا تو تبسم فرمایا پھر ان سے (برکت کے لیے) بیعت کی۔ (کیونکہ وہ کمسن تھے)

عبداللہ نام رکھنا

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ابو طلحہ کا ایک لڑکا بیمار تھا تو سیدنا ابو طلحہ باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ لڑکا مر گیا۔ جب وہ لوٹ کر آئے تو انہوں نے پوچھا۔

"میرا بچہ کیسا ہے؟" (ان کی بیوی) ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کہا۔

"اب پہلے کی نسبت اس کو آرام ہے۔" (یہ موت کی طرف اشارہ ہے اور کچھ جھوٹ بھی نہیں)

پھر ام سلیم شام کا کھانا ان کے پاس لائیں تو انہوں نے کھایا، اس کے بعد ام سلیم سے صحبت کی۔ فارغ ہوئے تو ام سلیم نے کہا۔

"جاؤ بچہ کو دفن کردو۔"

پھر صبح کو ابو طلحہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سب حال بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ "کیا تم نے رات کو اپنی بیوی سے صحبت کی تھی؟"

ابو طلحہ نے کہا "ہاں" پھر آپ نے دعا کی۔ "اے اللہ! ان دونوں کو برکت دے۔"

پھر ام سلیم کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو ابو طلحہ سے کہا۔ "اس بچہ کو اٹھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے جاؤ۔" اور ام سلیم نے بچے کے ساتھ تھوڑی کھجوریں بھیجیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بچے کو لے لیا اور پوچھا۔

"اس کے ساتھ کچھ ہے؟"

لوگوں نے کہا۔ "کھجوریں ہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجوروں کو لے کر چبایا پھر اپنے منہ سے نکال کر بچے کے منہ میں ڈالا پھر اس کا نام عبداللہ رکھا۔

(مسلم)

انبیاء اور صالحین کے نام

سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب میں نجران میں آیا تو وہاں کے (انصاری) لوگوں نے مجھ پر اعتراض کیا۔

"تم (سورہ مریم میں) پڑھتے ہو کہ "اے ہارون کی بہن" (یعنی مریم علیہا السلام کو ہارون کی بہن کہا ہے) حالانکہ (سیدنا ہارون، موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے اور) موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام سے اتنی مدت پہلے تھے (پھر مریم ہارون علیہ السلام کی بہن کیونکر ہو سکتی ہیں؟)

جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

(یہ وہ ہارون تھوڑی ہیں جو موسیٰ کے بھائی تھے) بلکہ بنی اسرائیل کی عادت تھی (جیسے اب سب کی عادت ہے) کہ وہ پیغمبروں اور اگلے نیکوں کے نام پر نام رکھتے تھے۔"

(مسلم)

بچے کا نام ابراہیم رکھنا

سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میرا ایک لڑکا پیدا ہوا تو میں اس کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام ابراہیم رکھا اور اس کے منہ میں ایک کھجور چبا کر ڈالی۔

(مسلم)

بچے کا نام منذر رکھنا

سہل بن سعد کہتے ہیں کہ ابو اسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیٹا منذر جب پیدا ہوا تو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنی ران پر رکھا اور (اس کے والد) ابو اسید بیٹھے تھے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی چیز میں اپنے سامنے متوجہ ہوئے تو وہ بچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ران پر سے اٹھا لیا گیا تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال آیا تو فرمایا۔

"بچہ کہاں ہے؟"

سیدنا ابو اسید نے کہا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے اس کو اٹھا لیا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اس کا نام کیا ہے؟"

ابو اسید نے کہا۔ "فلاں نام ہے۔"

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "نہیں۔ اس کا نام منذر ہے۔" پھر اس دن سے انہوں نے اس کا نام منذر ہی رکھ دیا۔

(مسلم)

"برہ" کا نام جویریہ رکھنا

سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔ "ام المومنین جویریہ رضی اللہ عنہا کا نام پہلے برہ تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام جویریہ رکھ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم برا جانتے تھے کہ یہ کہا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم برہ (نیکو کار بیوی کے گھر) سے چلے گئے۔"

(مسلم)

"برہ" کا نام زینب رکھنا

محمد بن عمر بن عطاء کہتے ہیں۔ "میں نے اپنی بیٹی کا نام برہ رکھا تو زینب بنت ابی سلمہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے اور میرا نام بھی برہ تھا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اپنی تعریف مت کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم میں بہتر کون ہے۔"

لوگوں نے عرض کیا۔ "پھر ہم اس کا کیا نام رکھیں۔"

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "زینب رکھو۔"

(مسلم)

انگور کا نام "کرم" رکھنے کا بیان

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کوئی تم میں سے انگور کو "کرم" نہ کہے اس لیے کہ "کرم" مسلمان آدمی کو کہتے ہیں۔"

(مسلم)

سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "(انگور کو) کرم مت کہو بلکہ عنب کہو یا حبلہ کہو۔"

(مسلم)

افلح، رباح، یسار اور نافع نام رکھنے کی ممانعت

سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اپنے غلاموں کے چار نام رکھنے سے منع فرمایا۔ افلح، رباح، یسار اور نافع۔"

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں اس مدت تک آگ نہ جلتی تھی۔"

میں نے کہا "اے خالہ! پھر تم کیا کھاتیں؟"

انہوں نے کہا "کھجور اور پانی۔ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ ہمسائے تھے۔ ان کے دودھ والے جانور تھے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دودھ بھیجتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہ دودھ ہمیں بھی پلا دیتے۔"

(صحیح مسلم)

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں "رسول اللہ کی وفات ہو گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم روٹی اور زیتون کے تیل سے ایک دن میں دو بار سیر نہیں ہوئے۔" (یعنی صبح اور شام دونوں وقت سیر ہو کر نہیں کھایا)

(صحیح مسلم)

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل دو دن تک گندم کی روٹی سے سیر نہیں ہوئی مگر ایک دن صرف کھجور ملی۔"

(صحیح مسلم)

سیدنا ابو حازم کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا۔ وہ اپنی دونوں انگلیوں سے بار بار اشارہ کرتے تھے اور کہتے "قسم اس کی جس کے ہاتھ میں ابو ہریرہ کی جان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والے کبھی تین دن پے در پے گندم کی روٹی سے سیر نہیں ہوئے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے۔"

(صحیح مسلم)

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اور میرے دانوں کے برتن میں تھوڑے جو تھے اسی میں سے کھایا کرتی یہاں تک کہ بہت دن گزر گئے۔ میں نے ان کو ماپا تو وہ ختم ہو گئے۔" (معلوم ہوا کہ مجہول اور مبہم شے میں برکت زیادہ ہوتی ہے)

(صحیح مسلم)

سیدنا سماک بن حرب کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو خطبہ پڑھتے ہوئے سنا انہوں نے کہا "وہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا ذکر کرتے تھے جو کہ لوگوں نے دنیا کو حاصل کیا پھر کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سارا دن بھوک سے بے قرار رہتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھجور نہ ملتی جس سے اپنا پیٹ بھریں۔"

(صحیح مسلم)

جنت میں لے جانے والے اعمال

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جنت میں لے جانے والے اعمال یہ ہیں۔

اللہ کی عبادت ایسے خلوص سے کرو کہ اللہ کے سوا نہ صرف یہ کہ کسی غیر کی عبادت نہ کرو بلکہ اللہ کی جو عبادت کرو، اس میں شرکت غیر کا شائبہ تک نہ ہو، خالصتاً" اللہ کی عبادت ہو اور اللہ کی خوشنودی کے لیے ہو۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور رشتہ داروں سے میل جول اور حسنِ سلوک کرو۔"

رزق حلال

ایک اور ارشاد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایک شخص لمبا سفر کر کے غبار میں اٹا ہوا آتا ہے اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر ربی ربی کہتا ہے، دعا کرتا ہے مگر اس کا کھانا، پینا، لباس اور نشوونما سب حرام کی کمائی سے ہے تو اس کی دعا کہاں قبول ہو گی۔"

انشاءنامہ

ہم تقریر کرنے سے گھبراتے ہیں

ابن انشاء

ہم تقریر کرنے سے کتراتے ہیں بلکہ مشاعرہ بھی اسی باعث نہیں پڑھتے کہ شعر ارشاد کرانے سے پہلے شاعر کا تقریر کرنا اب قریب قریب آداب میں داخل ہو گیا ہے، یہ بات نہیں کہ ہم تقریر نہیں کر سکتے۔ ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ لیکن اس کے لیے ذرا اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تو یہی کہ ہماری ٹانگوں کو کسی ستون یا کرسی کے پائے سے کس کر باندھنا پڑتا ہے، کیونکہ ہمارے دوسرے اعضائے رئیسہ کی طرح یہ بھی ایسی خدا ترس واقع ہوئی ہیں کہ جہاں تقریر کا موقع آیا تھر تھر کانپنے لگیں۔ نرم دلی کے باعث توازن میں بھی رخنہ آجاتی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ لب ہلائے کہ تب ہلائے۔ دوسری وجہ یہ کہ ہمیں دلائل پر قابو نہیں رہتا۔ دلائل ہمارے ذہن میں ایسے بے فکرے ہوتے ہیں کہ لب تک آنے کے لیے ایک دوسرے پر پلے پڑتے ہیں۔ بعض تو موقع محل بھی نہیں دیکھتے اور بلا سیاق و سباق وارد ہو جاتے ہیں۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ کئی ایک نے بیک وقت ہماری زبان پر آنے کی کوشش کی تو ایک کچھا سا بن کر ہمارے حلق میں اٹک گئے۔

ایسے میں سطحی نظر والوں کو ہماری تقریر اگر الجھی ہوئی معلوم ہو تو وہ قابل معافی ہیں۔ حلق تر رکھنے کے لیے ہمیں پانی بھی بار بار پینا پڑتا ہے پیتے تو اور لوگ بھی ہیں، لیکن ہمیں اپنی ضرورت کے پیش نظر منتظمین جلسہ سے گزارش کرنی پڑتی ہے کہ اسٹیج پر نلکا لگا دیا جائے۔ اب کتنے لوگ ہیں جو ایسا اہتمام کر سکیں۔

ابھی پچھلے دنوں ایسا اتفاق ہوا کہ بزم تاریخ والوں نے ایک مباحثہ کرایا۔ موضوع ایسا تھا کہ ہمیں بے اختیار تقریر کرنے کی خواہش ہوئی۔ ہم نے اس خواہش کا اظہار کیا تو سیکریٹری صاحب بولے۔

"آپ کا تقریر کرنا ہمارے لیے فخر کا باعث ہوتا لیکن کیا کریں، کے۔ ڈی۔ اے والے نہیں مانتے۔ کہتے ہیں، شہر میں ویسے ہی پانی کی قلت ہے۔"

خدا جانے ہمارے تقریر نہ کرنے کی شہرت ایک مقامی کالج والوں تک کیسے پہنچ گئی کہ انہوں نے ہمیں ایک مباحثے کا جج بنا دیا۔ ہم نے بہت غور کیا کہ ہم تو خود بولنے سے قاصر رہتے ہیں۔ جج کیا کریں گے جواب ملا کہ ابھی پچھلے دنوں فلاں کالج والوں نے بھی تو ایک مشاعرے کی صدارت ایک ایسے صاحب سے کرائی جو شعر کہنا تو درکنار ایک مصرع بھی موزوں نہیں پڑھ سکتے۔

اس پر ہم لاجواب ہو گئے۔ دلائل ان لوگوں کے پاس اور بھی تھے، لیکن اندیشہ پیدا ہوا کہ جوں جوں وہ

سامنے آئیں گے۔ ہمارا ازالہ حیثیت عرفی ہی ہو گا۔ نیک نامی کا کوئی امکان نہیں۔ ہم نے کہا "اچھی بات ہے لیکن ایک بات کی ضمانت دیجیے کہ فیصلے کے بعد مقابلے میں شریک ہونے والے اور انعام نہ پانے والے ہمیں لتاڑیں گے نہیں۔" کیونکہ ایک بار تھیوسوفیکل ہال کی چھت پر ہم نے تقریروں کے ایک مقابلے میں منصفی کی تھی۔ ایک صاحبہ نے جن کے اسکول کو انعام نہ ملا۔ آنکھیں بند کر کے اور منہ کھول کر ایسی تقریر کی کہ اگر وہ ہماری شان میں نہ ہوتی تو ہم پہلا انعام ان ہی کو دیتے۔

ایک موقع پر ایک صاحبزادے کا رد عمل بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ ان کو انعام نہ ملا تو مٹھیاں بھینچ کر بولے۔

"اب دیکھوں گا آپ کیسے جیکب لائن میں سے گزرتے ہیں، روز چلے آرہے ہیں ترکی ٹوپی لگائے قوالی سننے۔"

جن لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارا تصوف سے شغف کم ہو گیا ہے وہ غلطی پر ہیں اب ہم قوالوں کو اپنے گھر بلا لیتے ہیں۔

ہمیں اسکول سے نکلے (خود نکلے تھے، نکالے نہیں گئے تھے) اتنے دن ہو گئے ہیں کہ کچھ اندازہ نہ تھا کہ زبان اردو کتنی ترقی کر گئی ہے ہم پرانے مولویوں سے پڑھے تھے جو لب سڑک اور فوق البھڑک وغیرہ تک کو غلط قرار دیتے ہیں ادب اور صحافت کے کوچے میں مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم ایسے سخت گیروں سے پالا پڑا جنہوں نے ایک افسانہ نگار کی عظمت کو محض اس لیے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ اس نے زور بیان میں ہیرو کی زبان سے یہ کہلوا دیا تھا کہ

"سلمیٰ! میرا پیار پہاڑ کی طرح اٹل ہے اور سمندر کی طرح بایاب ہے۔"

ایک اور مصنف پر وہ عمر بھر اس لیے خفا رہے کہ اس نے کہیں روانی میں لکھ دیا تھا کہ

"اس آگ نے مجھے جلا کر خس و خاشاک بنا دیا ہے۔"

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیے

ابنِ انشاء

طنز و مزاح، سفرنامے

اردو کی آخری کتاب
آوارہ گرد کی ڈائری
دنیا گول ہے
ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں
چلتے ہو تو چین کو چلیے

قدرت اللہ شہاب

یا خدا
ہاں جی

ڈاکٹر سید عبداللہ

مقاماتِ اقبال
طیف غزل
طیف اقبال
طیف نثر

مکمل فہرست طلب کیجیے

لاہور اکیڈمی ۳۵ سرکلر روڈ۔ لاہور

ہمارے زمانے میں یا تو زیر نگرانی کہتے تھے یا نگرانی میں، غور کرنے پر زیر نگرانی میں، کہنے کی حکمت کھلی، یہ تقریر کوئی فارسی خواں سن رہا ہو تب بھی سمجھ جائے گا اور فارسی سے نابلد ٹھیٹ اردو بولنے والے کو بھی مجال اعتراض نہ ہو گا۔ ایک اور صاحبہ غالباً" فارسی کی طالب علم تھیں، وہ صدر گرامی قدر گرامی کے نیچے بھی زیر ڈالتی گئی تھیں ان کا صدر گرامی کہنا ہمیں تو بہت بھلا معلوم ہوا۔ متعارف کے معنی میں ہم ایک لفظ روشناس بولا کرتے تھے ہمیں اندازہ نہ تھا کہ اس کا تعلق روشنی سے ہے۔ دو تین طالبات کو روشناس کہتے سنا تو صحیح مطلب سمجھ میں آیا۔ رجعت پسند میں ہم ہمیشہ زیر زبر ہی پڑھتے رہے۔ اپنی اس رجعت پسندی کا احساس اس وقت ہوا جب ایک مقررہ سے رُجعت پسند سنا۔ اگر اتنے دنوں میں زبر ترقی کر کے پیش تک نہ پہنچے تو زبان کی ترقی ہی کیا ہوئی۔ اسی مباحثے میں ہمیں پہلی بار معلوم ہوا کہ صحیح لفظ مدح سرائی نہیں مدّاح سرائی ہے۔

اسکولوں کی عمارتیں کم ہونے کی وجہ سے ہمارے بہت سے اسکول فٹ پاتھوں پر قائم ہیں۔ ہم نے اکثر دیکھا کہ ذرا استاد کلاس سے غائب ہوا اور کوئی بندر نچانے والا یا بلا درد دانت نکالنے والا یا چورن بیچنے والا ان کی جگہ آ بیٹھا۔ یہ بات فائدے سے خالی نہیں اس سے طلبہ کا ذخیرہ اشعار بڑھتا ہے۔

سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے

اور

بشر راز دل کہہ کر ذلیل و خوار ہوتا ہے

اور

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے

وغیرہ ایسے ابیات ہیں کہ عمر بھر کام آتے ہیں۔ ان اسکولوں کے طالب علم جب فارغ التحصیل ہو کر رکشا یا بس چلاتے ہیں تو ان اشعار کو رکشا اور بس کی پشت پر لکھواتے ہیں۔ یہاں ایک بی بی نے اپنی تقریر کا آغاز اس شعر سے کیا۔

دل میں ایک چبھتی ہوئی تقریر ہونی چاہیے
نالہ کیسا بات میں تاثیر ہونی چاہیے

تو ہم نے پوچھ لیا کہ آپ کس کالج سے تشریف لائی ہیں؟ فوراً" بتنے لگیں "آپ انجان بنتے ہیں، جس فٹ پاتھ پر آپ اپنے دفتر کی کھڑکی میں سے کنڈیوں کے جھٹکے چھینکتے ہیں وہیں تو ہماری کلاس لگتی ہے آپ نے مجھے ضرور دیکھا ہو گا۔"

اس بحث کا موضوع تھا کہ نئی پود کی بے راہ روی کی ذمہ داری والدین پر عائد ہوتی ہے۔ بعض طالبات نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے انگلیوں سے ادھر اشارے بھی کیے جدھر ان کے والدین بیٹھے تقریر سن رہے تھے، لیکن سب ہی ایسی نہیں تھیں۔ بعضوں نے ان کو بری کرانے کے لیے زور خطابت صرف کیا۔ ایک صاحبہ نے کہا کہ

"حضرت آدم علیہ السلام کے تو والدین ہی نہیں تھے، اس کے باوجود آپ لوگ جانتے ہیں کہ ان سے جنت سے نکالے جانے کے قابل بعض باتیں سرزد ہوئیں۔"

لیکن سب سے موثر استدلال ان صاحبہ کا تھا جنہوں نے کہا۔

"یہ نئی نسل نہایت ناخلف اور نالائق ہے۔ بدراہی کی حرکتیں خود کرتی ہے اور ذمہ دار والدین کو ٹھہراتی ہے۔ کاربد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر۔"

اس پر ہمیں بہت دن پہلے کی ایک بات یاد آئی اخبار (ڈان) کی ملکیت کا جھگڑا تھا، آرام باغ میں ایک جلسہ ہوا۔ ایک بہت محترم اور معمر لیڈر نے صدارت کی۔ ایک مقرر نے نہایت غیظ و غضب میں تقریر کی اور آخر میں فیصلہ صادر کیا کہ ڈان میرے باپ کی ملکیت نہیں، ڈان ایڈیٹر صاحب کے باپ کی ملکیت نہیں۔ ڈان (انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) صاحب صدر کے باپ کی ملکیت نہیں، بلکہ قوم کی ملکیت ہے۔

ہاکی پلیئر بابر عبداللہ کی باتیں

بابر محمود

۱۔ آپ کا نام؟
بابر۔

۲۔ گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟
بابر۔

۳۔ آپ کی تاریخ و جائے پیدائش؟
۵ مارچ ۱۹۷۷ء۔

۴۔ آپ کا سٹار؟
حوت Pacisis

۵۔ تعلیمی قابلیت؟
ایف۔اے۔

۶۔ طالب علمی کے زمانے میں کس مضمون سے نفرت تھی؟
معاشرتی علوم۔

۷۔ بہن بھائیوں کی تعداد اور آپ کا نمبر؟
نو بہن بھائی میرا نمبر آخری۔

۸۔ آپ کا عشق یا مشغلہ؟
ہاکی

۹۔ کیا آپ کے نزدیک عشق کے

بغیر زندگی نامکمل ھے؟
بالکل۔

۱۰۔ آپ کا آئیڈیل؟
شہباز سینئر۔

۱۱۔ آپ کا قیمتی اثاثہ؟
میرا بیٹا مویز Moeez۔

۱۲۔ آپ کے نزدیک خوبصورت رشتہ؟
ماں باپ کا۔

۱۳۔ آپ کے لیے قابل احترام؟
والدین۔

۱۴۔ آپ کی پسندیدہ کتاب؟
اسلامیات۔

۱۵۔ زندگی کی سب سے بڑی خواھش؟
اچھا پلیئر، اچھا انسان۔

۱۶۔ وہ خواھش جو غیرمتوقع طور پر پوری ھوئی ھو؟
ایشیا کا بیسٹ پلیئر بننے کی۔

۱۷۔ پسندیدہ ھوٹل؟
P.C بھوربن۔

۱۸۔ پسندیدہ ریسٹورنٹ؟
ولیج۔ لاہور۔

۱۹۔ پسندیدہ پاکستانی کھلاڑی؟
عمر اخاں، ہاکی کے میدان سے۔

۲۰۔ پسندیدہ غیرملکی کھلاڑی؟
Donier، ہالینڈ۔

۲۱۔ پسندیدہ گرائونڈ؟
نیشنل سٹیڈیم، لاہور

۲۲۔ پسندیدہ ایمپائر؟
De. O

۲۳۔ پسندیدہ سیرگاہ؟
زیارت، کوئٹہ۔

۲۴۔ شادی اپنی پسند سے کریں گے یا گھر والوں کی پسند سے؟
گھر والوں کی مرضی سے۔

۲۵۔ مستقبل میں آپ کا مشن؟
اچھا بزنس مین بننا۔

۲۶۔ اگر آپ ھاکی پلیئر نہ ھوتے تو کیا ھوتے؟
بزنس مین ہوتا۔

۲۷۔ آٹوگراف میں کیا تحریر کرتے ھیں؟
Be Honest.

۲۸۔ اگر آپ کو پاکستانی ھاکی ٹیم کا کپتان بنا دیا جائے تو؟
ٹیم کو منظم کروں گا۔

۲۹۔ آپ کو غصہ کب آتا ھے؟
جب کوئی منافق سامنے آتا ہے۔

۳۰۔ آپ کے پسندیدہ دوست ھاکی کے علاوہ کون سے ھیں؟
حسن، عفران۔

۳۱۔ آپ کے پسندیدہ دوست ھاکی ٹیم میں کون سے ھیں؟
وسیم، عرفان یوسف، قاسم۔

۳۲۔ ھاکی لیگ جس میں آپ کھیلتے ھیں اس کا نام؟
فورڈ ہائی کلب، انگلینڈ۔

۳۳۔ آپ کو اس مقام تک لانے میں کس کا ھاتھ ھے؟
حسن بابا۔

۳۴۔ کن لوگوں سے مل کر خوشی ھوتی ھے؟
تبلیغی جماعت والوں سے۔

۳۵۔ کن لوگوں سے مل کر نفرت ھوتی ھے؟
منافقوں سے۔

۳۶۔ مایوسی کب ھوتی ھے؟
جب ٹیم کے باہر ہوتے ہیں۔

۳۷۔ وہ خواھش جو حسرت بن گئی ھو؟
اولمپک کا جیتنا۔

۳۸۔ جیون ساتھی کی خوبی جو پسند ھو؟
Loving, Carring.

۳۹۔ سردیوں کی شام ھو تنھائی ھو کون سی سوچ دل کو گھیر لیتی ھے؟
اچھا مستقبل اپنے بچوں کے لیے۔

۴۰۔ صبح بیدار ھوتے ھی کسے دیکھنا پسند کرتے ھیں؟
اپنی ماں اور بیٹے کی۔

۴۱۔ کوئی ایسی شخصیت جو شدت سے یاد آتی ھو؟
شہباز بٹ اور حاجی طاہر میرا دوست جو وفات پا گئے ہیں۔

۴۲۔ کس شخصیت کی خاطر جان قربان کر سکتے ھیں؟
حسن بابا کے لیے۔

۴۳۔ آپ کی خوبی آپ کی خامی؟

خوش اخلاقی، کسی پر بھی بھروسہ کر لینا۔

۴۴۔دولت، محبت، شہرت میں آپ کا انتخاب؟

محبت اور شہرت۔

۴۵ آپ کی پسندیدہ عمارت

دوبئی پام ٹری۔

۴۵۔آپ کی پسندیدہ عادت؟

والدین کی خدمت کرنا جب کام سے فارغ ہوں۔

۴۶۔آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ھے؟

بوڑھا ہو رہا ہوں۔ جوانی جا رہی ہے۔

۴۷۔چاند اچھا لگتا ھے یا سورج؟

چاند۔

۴۸۔کوئی شعر جو بے حد پسند ہو؟

اک شرط یہ کھیلوں گی پیا پیار کی بازی
جیتوں تو تجھے پاؤں ہاروں تو میں تیری

۴۹۔پسندیدہ شاعر یا شاعرہ یا مصنف؟

پروین شاکر۔

۵۰۔پسندیدہ پھول؟

گلاب۔

۵۱۔ پسندیدہ خوشبو؟

Ex.Ex.

۵۲۔پسندیدہ لباس؟

شلوار قمیض۔

۵۳۔آپ کی زندگی کا خوبصورت ترین دن؟

جس دن بیٹا پیدا ہوا۔

۵۴۔زندگی کے وہ دن جو چاہتے ہوں کہ لوٹ آئیں؟

جو میریکیمپ کے دن۔

۵۵۔آپ کے گھر کی سب سے اچھی چیز؟

سب بہن بھائی اکٹھے رہتے ہیں۔

۵۶۔کوئی ایسی عادت جس سے آپ کے گھر والے بیزار ہوں؟

رات کو لیٹ سونا۔

۵۷۔زندگی کا ایسا لمحہ جب آپ بہت خوش ہوں؟

جب بیٹا پیدا ہوا۔

۵۸۔زندگی کا ایسا لمحہ جس سے آپ آج بھی خوفزدہ ہوں؟

جوان بھتیجے کا وفات پانا۔

۵۹۔ایک وہم جو پریشان کرتا ہو؟

کوئی نہیں۔

۶۰۔ ایک غلطی جس پر آپ نادم ہوں؟

کوئی نہیں۔

۶۱۔ پسندیدہ کھیل؟

ہاکی۔

۶۲۔ پسندیدہ موسم؟

سردی۔

۶۳۔آپ کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ ڈش؟

بریانی، ناپسندیدہ دال ماش۔

۶۴۔ آپ کا پسندیدہ مشروب؟

انرجی ڈرنک۔

۶۵۔ پسندیدہ کمپیئر؟

طارق عزیز۔

۶۶۔ پسندیدہ گلوکار یا گلوکارہ؟
نور جہاں۔

۶۷۔ کوئی فلم یا ڈرامہ جو ناپسند ہونے کے باوجود دیکھا ہو؟
کوئی نہیں۔

۶۸۔ پسندیدہ لیڈر سیاست کے میدان سے؟
پرویز مشرف، ذوالفقار علی بھٹو۔

۶۹۔ حکومت کا کون سا عہدہ لینا پسند کریں گے؟
وزیراعظم کا۔

۷۰۔ اگر ایک دن کی حکومت ملے تو آپ کیا کریں گے؟
کرپشن ختم کر دوں گا۔

۷۱۔ انسان کو بیوقوف بنانے کا آسان طریقہ کون سا ہے؟
مجھے نہیں پتہ۔

۷۲۔ وطن عزیز کا پسندیدہ شہر پسندیدگی کی وجہ؟
لاہور۔ کیونکہ لاہور لاہور اے۔

۷۳۔ رقم کو کس انداز میں بچت کرتے ہیں؟
کمیٹی ڈال کے۔

۷۴۔ اگر آپ کا پانچ کروڑ کا پرائز بانڈ نکل آئے تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟
فیملی کو سٹینڈ کروں گا۔

۷۵۔ پسندیدہ اخبار اور پسندیدہ میگزین؟

اخبار جہاں، پاکستان۔

۷۶۔کوئی ایسی سواری جس کے استعمال سے پیدل چلنا پسند کریں؟

موٹر سائیکل، رکشا۔

۷۷۔شدید تھکن کے باوجود کہاں جانے کو تیار رہتے ہیں؟

باتھ روم میں۔

۷۸۔موسیقی کون سی پسند ہے کلاسیکی یا پاپ؟

کلاسیکی۔

۷۹۔اس دور کا بدترین فیشن؟

کوئی نہیں۔

۸۰۔ایسی دعا جو ہر دم آپ کے لبوں پر رہتی ہو؟

یااللہ خیر۔

۸۱۔ شکر کب ادا کرتے ہیں؟

ہر وقت۔

۸۲۔شاپنگ کس جگہ کی اچھی لگتی ہے؟

دوبئی سے۔

۸۳۔قارئین کے نام آپ کا کوئی پیغام؟

سچ کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ کسی کا حق نہ کھائیں۔ دوسروں کا ساتھ دیں نہ دے سکیں تو خاموش رہیں، مخالفت نہ کریں۔

☆☆☆

اداکارہ جیا علی سے ملاقات

عبداللہ

پاکستان کی مشہور فلمسٹار ڈرامہ آرٹسٹ اور فیشن شوز کی معروف ماڈل جیا علی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اپنی پہلی فلم ''دیوانے تیرے پیار کے'' سے عالمگیر شہرت حاصل کرنے والی سانولی سلونی، سمارٹ سی جیا علی کی اداکاری کو اس قدر پسند کیا گیا کہ اس دور میں پہلی بار پاکستانی فلمسازوں نے اپنی ڈائریکشن، پلے بیک میوزک اور فلمی صنعت میں نئی جوڑی متعارف کروا کر اپنی عمدہ کارکردگی اور محنت کی بدولت پاکستانی فلم کا معیار فنی تکنیکیوں اور دلچسپ کہانی کے اعتبار سے انڈین فلموں کے مقابل بنا دیا۔

بدقسمتی سے پاکستانی فلمی صنعت اپنا وہ معیار برقرار نہ رکھ سکی لیکن اپنی پہلی فلم سے ہی شہرت کی بلندیوں کو چھونے والی جیا علی کا نام پوری دنیا میں پہچانا جانے لگا۔ انھوں ۲۰۰۳ء میں پاکستان کی بیسٹ ایکٹریس کا ایوارڈ حاصل کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈرامہ سیریل ''منزلیں'' میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر کے ڈراموں کی دنیا میں بھی اپنے فن کا لوہا منوایا۔ اب تک فلموں، ڈراموں کے علاوہ مختلف انڈین، پاکستانی شوز میں اپنے ملک کی نمائندگی کر کے پاکستانی فلمی دنیا کے سفیر کے فرائض بھی سرانجام دے رہی ہیں۔

گذشتہ دنوں ان سے ہونے والی تفصیلی گفتگو حنا کے قارئین کی نذر ہے۔

○ آرٹسٹ بننے کا شوق کیسے ہوا؟

☆ بچپن سے ہی ماڈلنگ کا شوق تھا اور چاہتی تھی کہ اس شعبے میں نام پیدا کروں۔ بچپن میں ضدی ہونے کی وجہ سے ہر بات اپنی منوایا کرتی تھی۔ جبکہ ذہین بھی تھی جس کی وجہ سے امی سے ڈانٹ بھی پڑتی تھی تو جب ایک ذہین انسان ڈاکٹر یا انجینئر نہ بنے تو پھر ظاہر ہے اداکار بن جاتا ہے۔

○ اداکاری کے شعبے میں متعارف کس نے کروایا؟

☆ فلم میں اداکاری سے پہلے فیشن شوز کیے۔ مسرت مصباح نے فیشن شوز کے ذریعے متعارف کروایا کیونکہ پہلے میں ان کے ساتھ ان کے پارلر میں کام کرتی تھی۔ پھر ماڈلنگ سے شہرت ملی تو اداکاری کا شوق پیدا ہوگیا۔

○ پہلی فلم سائن کرنے پر گھر والوں کا رویہ کیسا تھا؟

☆ بہت مشکل سے اجازت ملی تھی کیونکہ پانچ بھائیوں کی اکلوتی ہونے کی وجہ سے لاڈلی تھی۔ اس لیے ہر بات منوالیا کرتی تھی لیکن پہلی فلم کی اجازت کے لیے سجاد گل نے خود گھر آکر امی سے اجازت لی تھی۔

○ پہلی فلم کی سپرہٹ کامیابی پر کیا محسوس کیا تھا؟

☆ بہت اچھی محسوسات تھیں۔ ایک ساتھ اتنے زیادہ لوگوں میں نام بن گیا تھا لیکن بہت زیادہ پرستاروں کی موجودگی میں گھبرا بھی جاتی تھی۔ اس لیے فلم کے علاوہ میرا حلیہ ایسا ہوتا تھا کہ لوگ صرف میرے بالوں سے پہچانتے تھے کہ یہ جیا علی ہیں۔ فلم میں، میں نے مکمل طور پر ایک گھریلو لڑکی کا کردار ادا کیا جو کہ بہت معصوم تھی اس لیے وہ کردار بہت پسند کیا گیا لیکن اس فلم پر بہت محنت کی گئی تھی۔

○ آج کل ایسی فلمیں کیوں نہیں بن رہیں؟

☆ آج کل پاکستانی فلم کے حالات نہایت خراب ہیں نہ تو سرمایہ لگاتے ہیں اور نہ ہی محنت کرتے ہیں۔ کہانی، سکرپٹ اداکار، ہدایت کار سب مل کر ہی کسی فلم کی کامیابی کی ضمانت ہوتے ہیں لیکن آج کل یہ سب کچھ نہیں ہو رہا۔ اس لیے کامیاب فلمیں نہیں بن رہیں بلکہ پاکستانی فلم انڈسٹری نہایت تباہ کن صورتحال سے دوچار ہے۔

○ اچھا یہ بتائیں گھر میں کس کے زیادہ قریب تھیں؟

☆ امی کے زیادہ قریب تھی۔ ابو سے بھی دوستی تھی لیکن ابو کے بعد امی کی صحت کی طرف سے بہت فکرمند رہتی تھی۔ بچپن میں تربیت میں بھی والدہ کا زیادہ ہاتھ ہے کیونکہ ابو کے پاس وقت کم ہوتا تھا لیکن امی اصولوں کی سختی سے پابندی کرواتی تھیں۔ پڑھائی کے معاملے میں سختی کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ نہایت ڈسپلن سے رہتے تھے ورنہ پٹائی بھی ہو جاتی تھی۔

○ بچپن کے متعلق بتائیں؟

☆ میرا زیادہ تر بچپن باہر مختلف ممالک میں گزرا کیونکہ والد صاحب کی جاب ایسی تھی۔ میں سب بہن بھائیوں میں بڑی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ شرارتی تھی۔ بھائیوں کے ساتھ مل کر خوب شرارتیں کرتی تھی بلکہ امی کی سب دوستیں کہتی تھیں کہ اس نے سب بچوں کو شرارتیں سکھا دی ہیں جس کی وجہ سے اکثر ڈانٹ پڑتی تھی۔ ہر وقت کھیل کود کرتی بڑے تینوں بھائیوں سے بہت دوستی تھی۔ اکثر امی سے مار بھی پڑتی تھی کہ نہ خود پڑھتی ہے نہ انھیں پڑھنے دیتی ہے۔ بھائیوں سے دوستی کی وجہ سے اکثر امی انھیں کہا کرتی تھیں کہ ہم اس کی فوراً شادی کر دیں گے تم لوگوں نے بہت ناک میں دم کیا ہوا ہے تو وہ فوراً منہ بنا لیتے تھے۔

○ بچپن کا کوئی واقعہ سنائیں؟

☆ ابو نے معاشرے میں موو کرنا سکھایا۔ جب

پاکستان آگئے تو بھی میں سائیکل پر سکول جاتی تھی یا بس یا ویگن پر لیکن میری بالکل عادت نہیں تھی کہ بازار میں یا سکول جاتے ہوئے ہنستی یا شرارتیں کرتی لیکن سکول آتے جاتے کچھ لڑکے مسلسل تنگ کرتے تھے۔ ابو نے کہا کہ اب کچھ کہیں تو پٹائی کر دینا اور خود مجھ سے ذرا فاصلے پر پیچھے رہتے جب میں سکول جانے لگی اور وہ راستے پر آئے تو میں نے دو تین کی خوب اچھی طرح ٹھکائی کر دی۔ میری ہائیٹ بھی چونکہ زیادہ تھی اس کے بعد انھیں ایسی عقل آئی کہ دوبارہ تنگ نہیں کیا۔

○ لڑکوں کی پٹائی کرتے ہوئے خوف نہیں آیا؟

☆ نہیں اصل میں آپ کے اندر طاقت سے زیادہ اعتماد کا ہونا ضروری ہے۔ آپ کا اعتماد ہی آپ کی طاقت بن جاتا ہے اور وہ مجھ میں تھا کیونکہ مجھ ابو نے کہا تھا ایسا کرنے کے لیے۔

○ کیا بھائیوں پر رعب جماتی تھیں؟

☆ ہاں بڑی ہونے کی وجہ سے بھائیوں پر بہت رعب جماتی تھی جب بھی امی سے مجھے شرارتوں پر ڈانٹ یا مار پڑتی تھی تو میرا تمام تر غصہ چھوٹے بھائیوں پر اترتا تھا۔ یہ ان کی قسمت کہ اس وقت جو بھی سامنے آجائے

بقیہ صفحہ 258

اسی کی پٹائی میرے ہاتھوں ہو جاتی تھی۔

○ زندگی میں اتنا کچھ حاصل کرنے کے بعد کبھی خوف آیا؟

☆ نہیں خوف تو کبھی نہیں آیا بس اللہ کی ذات سے ڈرتی ہوں لیکن امی کی وفات سے پہلے جو انھوں نے شدید تکلیف بیماری کے دوران اٹھائی اس وقت ہر لمحہ خوف رہتا تھا کہ انھیں کچھ نہ ہو جائے۔ میرے سکرین سے کچھ عرصہ غیر حاضر رہنے کی وجہ بھی یہی تھی لیکن میں مطمئن ہوں کہ میں نے اپنی ماں کی بہت خدمت کی ہے اور شاید یہ اسی محنت کا ثمر ہے کہ امی کی وفات کے بعد مجھے اتنا کام مل رہا ہے کہ ایک لمحہ بھی فرصت کا نہیں ہے۔

○ کوئی کام جو مزید کرنے کی خواہش ہو؟

☆ نہیں میری ماں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس انڈسٹری میں کام کرنے کا زوال بہت برا ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے ہمیشہ سلیکٹیو کام کر کے ثابت کیا ہے کہ اچھا کام وہ ہے جو آپ کے بعد بھی زندہ رہے۔

○ شادی کے بارے میں کیا ارادہ ہے؟

☆ شادی انشاء اللہ ایک سال بعد کروں گی منگنی ہو چکی ہے۔

○ اپنی منگنی کے بارے میں کچھ بتائیں؟

☆ حقان ایک ترکش پائلٹ ہے۔ میری دوست نے ہماری ملاقات کروائی وہ ان کو بہت پہلے سے جانتی تھی جب یہ پاکستان ٹریننگ کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ان کی فیملی بھی مذہبی ہے جب میں حقان کو پہلی بار دیکھا تو مجھے بالکل اجنبی نہیں لگے۔ حالانکہ میں اسے دیکھنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی بلکہ شادی پر رضامند ہی نہیں تھی۔ پھر میری دوست نے سمجھایا کہ وہ ہمارے ملک میں مہمان ہے تم ایک بار مل لو۔ تو اس کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ میری دوست اتنی خوش ہوئی کہ خود مجھے اسلام آباد ایئرپورٹ پر لینے کے لیے آئی۔ پھر حقان کو میرے گھر والوں سے ملوایا تو انھیں بھی اتنا پسند آیا کہ فوراً او کے کر دیا اور بھائیوں نے بھی نہایت خوشی کا اظہار کیا کہ آخر میں نے کوئی فیصلہ کر ہی لیا۔ شاید میری والدہ کو اسی بات کا انتظار تھا وہ اکثر میری شادی کے متعلق پریشان رہتی تھیں۔

○ حقان کی شخصیت کے متعلق کچھ بتانا پسند کریں گی؟

☆ جی ہاں حقان نہایت اعلیٰ خصوصیات کے مالک ہیں اور دیکھنے میں بھی نہایت خوبصورت لگتے ہیں۔ جب میری دوستوں اور کزنز نے دیکھا تو فوراً کہا کہ یہ ماڈلنگ کرتے ہیں۔ میں نے کہا نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کی عادات اتنی اچھی ہیں کہ جب ہماری فیملی میں آتے ہیں تو میری کزنز اور فیملی کے ساتھ نہایت گھل مل جاتے ہیں اور میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں۔

○ آپ کے درمیان زبان کا مسئلہ پیدا نہیں ہوا؟

☆ نہیں حقان کی انگلش بہت اچھی ہے ہم انگلش میں بات کرتے ہیں لیکن جب میں پہلی بار حقان کی والدہ سے ملنے ترکی گئی تو زبان کا تھوڑا سا مسئلہ ہوا تھا کیونکہ وہ گھر میں ترکی بولتی ہیں۔

○ حقان کی فیملی کیسی ہے؟

☆ حقان کی والدہ بیماری کے باعث سفر نہیں کر سکتیں۔ اس لیے وہ مجھے والدین سے ملوانے ترکی لے گئے۔ تمام فیملی والے نہایت ہی اچھے اخلاق و عادات کے مالک ہیں اور سب سے بڑھ کر نہایت اچھی

سوچوں کے مالک ہیں۔ وہاں جا کر تمام معاملات وہ میری مرضی کے مطابق طے کرتے ہیں مجھے صبح جلدی اٹھنے کی عادت نہیں ہے جبکہ وہاں سب جلدی اٹھتے ہیں۔ لیکن مجھے مکمل آرام کا موقع دیا جاتا ہے۔ اتنی پذیرائی ملتی ہے کہ میں خود حیران ہوتی ہوں۔ اب میں بھی کچھ کچھ ترکی سمجھنے لگی ہوں۔

○ گھر میں مذہبی تعلیم کا رجحان تھا؟

☆ گھر میں سب بہن بھائیوں کو قرآن پاک کی تعلیم کے لیے اماں رکھی ہوئی تھیں۔ بھائی مجھ سے پڑھنے میں آگے نکل جاتے لیکن میں پڑھائی کے معاملے میں بہت ضدی تھی جس کی وجہ سے اماں جو قرآن پڑھاتی تھیں انھیں بھی بہت شکایت رہتی تھی۔

○ کیا شادی کے بعد فلموں میں کام جاری رکھیں گیں؟

☆ میرا خیال ہے کہ پاکستان میں کوئی اتنی اچھی فلمیں نہیں بن رہیں ہاں اگر کوئی اچھی فلم کی آفر ہوئی تو سوچوں گی۔ لیکن فیشن شوز جاری رکھوں گی آج کل بھی جو فیشن شوز کر رہی ہوں وہ اس لیے کہ جلدی جلدی شوق پورا ہو جائے کیونکہ شادی کے بعد ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ لیکن فیشن شو کرتی رہوں گی کیونکہ حقان نے اس کی اجازت بھی دی ہوئی ہے۔

○ اس وقت جینز پر آپ کی چنری نہایت خوبصورت ہے بلکہ اکثر آج کل آپ چنری میں دکھائی دیتی ہیں کوئی خاص وجہ؟

☆ ہاں اس کی وجہ یہ ہے کہ منگنی کے بعد سے دوپٹہ ہر وقت میرے بیگ میں ہوتا ہے۔

ساحلوں کی اُداسی

زرنین آرزو

اکیسویں قسط کا خلاصہ

اب آپ آگے پڑھیے

اشنا کی مہندی میں رمنا اور انی دونوں موجود تھیں۔ رمنا کا دل نہ چاہتے ہوئے بھی سمیر کی طرف کھنچنے لگا لیکن سمیرانی کے لیے بے چین تھا۔ اور اس س شادی کا خواہاں تھا۔ ادھر قمر النساء نے امی پر وقار کی حقیقت کھول دی۔ امی کی طبیعت خراب ہوگئی۔ زیب نے مشورہ دیا جب تک وقار اس مسئلے سے نکل نہیں جاتی تو اسے شہر سے دور اس کی سہیلی سکینہ کے گاؤں میں بھیج دیں۔ زیب اور قمر وقار النساء کے ساتھ گاؤں جانے کا فیصلہ کرتی ہیں۔

تاشو کی ماں زندہ ہے۔ تاشو اس حقیقت سے لاعلم ہے۔ تاشو کی ماں چونکہ ایک طوائف ہے اس لیے وہ دادی کے پاس کبھی کبھار ملنے آتی تھی اور دور سے تاشو کو دیکھ کر چلی جاتی تھی۔ لیکن اب اس ماں کی ممتا تاشو کو بانہوں میں لینے کو بے چین ہے۔ وہ تاشو سے ملنے کی کوشش کرتی ہے تو دادی اور حسام اس کی بے عزتی کرتے ہیں۔ معلیٰ، چودھری عبریز کی بیوی کے کردار میں اس کے گھر پہنچتی ہے تو وہ اس پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ چودھری عبریز کی پہلی بیوی کو بھی عبریز کی چچی نے اپنی بیٹیوں کے ساتھ مل کر مارا تھا۔

بائیسویں قسط

اِدھر تاشو لہرا کر قالین پر گری' اُدھر دروازہ زوردار آواز میں دھڑ دھڑایا۔ شاید کوئی اسے بچانے آ گیا۔ تاشو کے ذہن میں پہلا خیال یہی کوندا اور یہ خیال اس کے وجود میں حرارت کے ساتھ ساتھ توانائی بھی بھر گیا۔ دروازہ پھر بجا۔

''کون ہے؟'' تاشو کی طرف بڑھتا سیٹھ اکرام ناگواری سے دروازے کی جانب مڑ گیا۔ اس وقت کون بدبخت چلا آیا؟ اس نے تو ملازمین کو اچھی طرح تاکید کی تھی کہ کوئی اس کمرے کی طرف بھولے سے بھی نہ آئے تو پھر کس بدذات نے اس طرف آنے کی جرأت کی ہے۔ یقیناً کچھ ایسا ہو گیا جو کسی نے اس کا دروازہ بجانے کی ہمت کی ہے۔ دانت پیستے جیسے ہی سیٹھ اکرام نے دروازہ کھولا ایک زوردار گھونسا اس کے ناک کی خبر لے گیا۔ دوسرا گھونسا اس کے پیٹ پر پڑا۔ مارے درد کے وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا اور دوسری طرف الٹ گیا۔ اس کے ناک سے خون بہنے لگا۔

''کک..... کون ہو تم؟'' سیٹھ اکرام نے حواس بحال کرنے کی کوشش میں اس آنے والی افتاد کی جانب دیکھا۔ جواباً مقابل نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا۔

''تمھاری ہمت کیسے ہوئی میری بہن پر میلی نظر ڈالنے کی؟'' اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔

''میں تمھارا وہ حشر کروں گا کہ آج کے بعد تم کسی کی بہو بیٹی کی طرف آنکھ اٹھاتے بھی گھبراؤ گے۔'' حسام غصے سے کھول رہا تھا۔

''سنو اگر تم یہ روپوں کے لیے کر رہے ہو تو میں تمھیں منہ مانگی رقم دینے.....'' سیٹھ اکرام کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ حسام نے اسے گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔

یہ چوکیدار کہاں جا مرا؟ یہ ملازمین کہاں دفن ہو گئے؟ قالین پر نیم بے ہوشی کی حالت میں بڑے سیٹھ اکرام کے ذہن میں ابھی تک ناکامی کے سبب غصے کی پرچھائیاں تھیں۔

''تاشو۔'' اس کی مرمت کرنے کے بعد حسام تیزی سے تاشو کی طرف لپکا جو حیرت و استعجاب سے ساکت وہیں قالین پر بیٹھی تھی۔ تب سے اس کے ذہن میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا۔ اگر حسام بھائی فرشتہ بن کر نہ پہنچتے تو جانے اس کا کیا حشر ہوتا۔ یہ وہی حسام بھائی ہیں جن کے خلاف وہ دل میں تنفر اور کدورت لیے گھر سے نکلی تھی۔ جن کی محبت اور خلوص کو اس نے ڈھونگ اور دکھاوے پر محمول کیا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو ناں تاشو؟'' حسام بھائی نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا۔

بغیر کوئی جواب دیئے وہ ان کے سینے سے لگ گئی اور سسکیاں بھرنے لگی۔ آج اگر حسام بھائی نہ آتے تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہتی۔ اف یہ کیا ہو گیا؟ جس عورت کو اس نے ماں سمجھا اس عورت نے اس کی عصمت کا سودا کر دیا۔ ماں کا یہ کون سا روپ ہے؟ کیا ماں کی ممتا اتنی گھناؤنی اور کمینی ہو سکتی ہے کہ.....

''چپ ہو جاؤ تاشو..... مت روؤ۔'' انھوں نے بلکتی تاشو کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔

''یہ شکر کرو کہ ایک سگنل پر مجھے گاڑی میں تم بیٹھی دکھائی دے گئیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا تو میں نے تمھارا پیچھا کیا اور یہاں تک پہنچ گیا۔'' حسام کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ برآمدے میں بھاگتے قدموں کی آواز آ رہی تھی۔ پھر وہ آوازیں کمرے کے دروازے سے باہر آن رکیں۔ ان میں دو سیٹھ اکرام کے ملازمین تھے اور دو تاج بائی کے کارندے۔ اندر کمرے کی حالت آنے والوں کے

لیے غیر متوقع تھی۔

''حسام بھائی۔'' تاشو سہم کر حسام کی پشت کے پیچھے چھپ گئی۔

''اس لڑکی کو ہمارے حوالے کر دو۔'' آنے والوں میں سے ایک نے کر کہا۔

''خبردار جو کسی نے لڑکی کو ہاتھ بھی لگایا تو۔ وہ اپنی ہڈی پسلی تڑوا لے گا۔'' حسام بھلا کہاں ڈرنے والا تھا۔ وہ چاروں اندر آ گئے۔

''تم ایک طرف کونے میں کھڑی ہو جاؤ تاشو اب ان سے نپٹنا ضروری ہے۔'' حسام بولا تو تاشو سوکھے گلے سے بولی۔

''ہم یہاں سے نکل چلتے ہیں بھائی۔''

''ان کی درگت بنائے بغیر ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے۔'' حسام نے تاشو کو کونے کی طرف دھکیلا اور چوکنے انداز میں ان چاروں کی طرف دیکھنے لگا جنھوں نے اس کا گھیراؤ کر لیا تھا۔

وہ خود ان پر حملہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ داہنی طرف کھڑے شخص نے اچانک اس پر جست لگائی تو حسام ایک طرف ہٹ گیا اور ساتھ ہی اس کی کمر پر ایک زوردار لات رسید کر دی۔ وہ ''اونہہ'' کی آواز کے ساتھ اوندھے منہ جا گرا۔ اپنے ساتھی کی درگت بنتے دیکھ کر دوسرا حسام پر پل پڑا۔ پھر تیسرے اور چوتھے نے بھی حملہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ تین تھے اور حسام اکیلا۔ کبھی حسام کا پلہ بھاری ہو جاتا کبھی ان تینوں کا۔ حسام خاصا پھرتیلا تھا اور چونکہ وہ بلیک بیلٹ تھا اس لیے اس نے ان تینوں کی اچھی طرح دھلائی کی۔

ان چاروں سے فارغ ہوتے ہی حسام نے تاشو کا ہاتھ تھاما اور باہر کی طرف لپکا۔ لیکن تاشو جھجک کر رک گئی۔

''کیوں کیا ہوا؟'' حسام نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟''

''گھر اور کہاں؟'' حسام نے حیرت سے جواب دیا۔

''لیکن میں گھر نہیں جاؤں گی۔ میں ان سب کو اپنا منہ نہیں دکھاؤں گی۔ جس دھوکے باز عورت کی جھوٹی محبت پر میں نے ان سب کی سچی محبت اور خلوص کو ٹھکرا دیا..... تو وہ.....''

''یہ باتیں یہاں کرنے کی نہیں ہیں تاشو۔'' حسام بولا۔

''اور میں تو آپ سے بھی بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے تو آپ کی بہت بے عزتی بھی کی تھی لیکن اس بے عزتی کو نظر انداز کر کے آپ مجھے بچانے چلے آئے۔''

''میں نے اپنا بھائی کا فرض پورا کیا ہے تاشو۔''

''میں نے آپ سب سے جو سلوک کیا ہرگز قابل معافی نہیں۔ میں نے آپ سب کے خلوص پر شک کیا۔ وہ عورت واقعی بازاری ہے۔ اس نے میرا سودا کیا اور مجھے یہاں تک لے آئی۔''

''تاشو۔'' حسام بھائی نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔

''جو کچھ بھی ہوا اسے ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھول جاؤ اور گھر چلو۔ وہ سب تمھیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ خصوصاً دادی ماں۔ تم جانتی ہو ناں وہ تمھارے بغیر نہیں رہ سکتیں۔'' حسام اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔ وہ چوکیدار جسے وہ گیٹ پر بے ہوش کر آیا تھا نہ معلوم کب ہوش میں آ گیا اور تب سے برآمدے میں ستون کی اوٹ میں منتظر کھڑا تھا۔ جیسے ہی وہ لڑکا لڑکی برآمدے کے وسط

میں اس ستون کے قریب آئے تو لڑکی کی جذباتی باتوں پر لڑکا مکمل طور پر اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اسی دم اس نے موقع غنیمت جانا اور ستون کی اوٹ سے نکل کر ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے سے اس جوان کے سر پر بھرپور وار کیا۔ ایک ہی وار میں وہ چکرا کر وہیں ڈھیر ہوگیا اور لڑکی کی خوفزدہ سی چیخ نکل گئی۔

''حسام بھائی۔'' وہ تیزی سے حسام بھائی پر جھکی اور دھک سے رہ گئی۔ حسام بھائی کے سر سے خون نکل نکل کر فرش پر پھیل رہا تھا۔

''شاباش شیر خان۔'' عقب سے سیٹھ اکرام کی آواز ابھری۔ ساتھ ہی اس کے ہاتھ کی گرفت تاشو کی کلائی پر آپڑی۔

''تم کیا سمجھتی تھیں اس چھوکرے کے ساتھ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاؤ گی۔ یاد رکھو میرے چنگل سے نکل بھاگنا آسان نہیں۔'' وہ دانت پیستے بولا۔

تاشو حسام بھائی کو زخمی دیکھ کر پہلے ہی نیم مردہ ہو رہی تھی اس پر مستزاد اس خبیث آدمی کا سامنا۔ وہ بالکل ہی مایوس ہوگئی۔ اس کے ساتھ جو ہوتا سو ہوتا مگر وہ حسام بھائی کے لیے پریشان تھی۔

''خدا جانے وہ بچ بھی پائیں گے یا نہیں۔ انھیں بروقت ڈاکٹر کی ضرورت تھی۔''

''شیر خان اگر یہ شخص مر گیا تو پولیس کیس بن جائے گا اس لیے جاؤ اس کو کسی اسپتال کے باہر پھینک آؤ لیکن احتیاط سے۔''

''جو حکم سرکار۔'' شیر خان نے اثبات میں سر ہلایا اور زخمی کو کندھے پر ڈال لیا۔

☆☆☆

زیب النساء گھر لوٹی تو اسے گھر کی دیواریں اجنبی اجنبی سی لگیں۔ ایک دم ویران اور اداس۔ اس گھر کی در و دیوار سے اس کی خاموش چاہت کے فسانے لپٹے تھے۔ اس گھر کی فضا میں اس کے خاموش لبوں سے نکلنے والی گنگناہٹیں بسی تھیں۔ اور اب اس گھر میں قدم رکھتے جیسے اس کے اندر زمانے بھر کی وحشتیں ابھر آئی تھیں کہ اسی گھر کی فضاؤں نے دم بخود ہو کر اس کی چاہت کو لٹتے دیکھا ہوگا۔

بہت مضمحل اور بہت بے چین ہو کر وہ سیدھا امی کے کمرے میں چلی آئی اور ان کی گود میں چہرہ چھپائے کتنی دیر ساکت بیٹھی رہی۔ کتنے بہت سے آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر امی کی گود میں جذب ہوگئے۔ وہ اپنی بربادی کا گلہ کس سے کرے؟ وہ امی اور قمر آپی کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتی تھی۔ یہ تو اس کی بدنصیبی ہے جو ہر بار تاک کر وار کرتی ہے اور اسے بے دست و پا کر دیتی ہے۔ نعیم..... ایک ٹیس سی دل میں اٹھی تو اس کے لبوں پر خاموش چیخیں سی آن رکیں۔

''میں بہت خوش ہوں بیٹی نعیم جیسا سعادت مند داماد بہت کم لوگوں کو ملا کرتا ہے۔ قمر کے نکاح پر میں نے تمھاری اور وقار کی کمی بہت محسوس کی ہے۔'' امی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے کہہ رہی تھیں۔

''پتا نہیں خدا کو میری کون سی نیکی پسند آگئی ہے جس کے بدلے میں اس نے پاشا سے چھٹکارا دے دیا اور نعیم.....'' بات کرتے کرتے امی کی انگلیاں اس کے بھیگے رخساروں سے ٹکرائیں تو انھوں نے چونک کر اس کا چہرہ اوپر کیا۔ آنکھیں رو رو کر سرخ تھیں اور سارا چہرہ متورم تھا۔

''کیا ہوا بچی؟'' وہ پریشان ہو گئیں۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور ہتھیلیوں کی پشت سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

''زیب۔'' انھوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

''میں جانتی ہوں تم اتنے دنوں مجھ سے دور رہی ہو ناں۔ قمر نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم بہت اداس ہو۔'' اسی دم دروازے پر کھٹکا ہوا۔ زیب نے گردن موڑ کر دیکھا تو جیسے آنکھوں میں زمانے بھر کی اذیتیں اتر آئیں۔ وہ دشمن جاں دروازے کے بیچوں بیچ ایستادہ تھا ہمیشہ کی طرح شاندار اور پروقار۔

زیب کب آئی؟ وہ دھواں ہوتے چہرے سمیت ساکت تھا۔ وہ اس لڑکی سے کیونکر آنکھیں ملا پائے گا؟ وہ اسے اپنی بے وفائی کا کیا جواز بتائے گا؟ کیا یہ کہہ دینا آسان ہوگا کہ اس نے ایک بہن کا مستقبل سنوارنے کے لیے دوسری بہن کی زندگی اجاڑ دی۔ کیا یہ تاویل زیب کو مطمئن کر پائے گی؟ اور کیا اس کی اس قربانی کو وہ قبول کر پائے گی؟

''آؤ بیٹا رک کیوں گئے؟'' آنٹی کی آواز نے نعیم کو جیسے سوتے سے جگا دیا۔

''نہیں آنٹی میں پھر آ جاؤں گا۔'' وہ اس وقت اس لڑکی کا سامنا ایک لمحے کو بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ملامت اور تاسف کے تاثرات نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

''ارے بھئی یہ زیب ہے اندر آ جاؤ۔ کمال ہے بیٹا تم اب تک غیریت برت رہے ہو حالانکہ میں زیب کو بتا رہی تھی کہ تم نے کن حالات میں ہمارا ساتھ دیا۔''

امی کیا کہہ رہی تھیں زیب کے کان بالکل کچھ نہیں سن پا رہے تھے۔ اسے تو بس اس شخص کی موجودگی کا احساس تھا جس کے ہونے سے اس کے سانسوں کی آمد و رفت تھی اور جس کی محبت اس کی ویران اور اندھیری زندگی میں جگنو کی مانند چمکتی تھی۔ لیکن اس جگنو کو بھی تقدیر نے اپنی بے رحم مٹھی میں بند کر لیا اور وہ وہاں چند لمحوں کو بھی نہ رک سکی اور تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھ آئی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا تھا۔ کاش اس شخص نے اسے ٹھوکر لگانے سے پہلے ایک مرتبہ سوچا ہوتا۔ کیا کسی سے نظریں پھیر لینا اتنا ہی آسان امر ہے۔

وہ کھڑکی کی جالی سے ناک چپکائے کتنی دیر دکھی ہوتی رہی۔ اسی دم دروازے پر ہلکی سی دستک کے ساتھ کوئی اس کے کمرے میں آ گیا۔ قدموں کی چاپ اس کی پشت پر آن رکی ساتھ ہی جانی پہچانی آواز ابھری۔

''زیب۔'' اف یہ لہجہ۔ اس کے لبوں سے نکل کر اس کا نام کتنا خوبصورت ہو جاتا تھا۔ لیکن اب اس لہجے نے اس کے دل میں انی سی چبھو دی۔

''میں جانتا ہوں زیب تم مجھ سے خفا ہو۔'

صرف خفا؟ زیب کو تعجب ہوا۔ کوئی اسے بتائے اس نے اس کی زندگی تباہ کر دی۔ اس نے اس کے کھرے جذبات کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا۔ اس نے اس کی خاموش محبت کی رتی برابر بھی پروا نہیں کی اور.....

''دراصل حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے زیب کہ میں قطعی طور پر بے بس ہو گیا۔'' مرد بے بس ہو جائے یہ کتنا عجیب لگتا ہے ناں۔ تلخی سے سوچتے وہ جانے کو مڑی۔ وہ کتنا بے بس ہو گیا تھا اور کتنا نہیں؟ یہ اسے جاننے کی ضرورت نہیں۔

''زیب پلیز رکو۔'' غیر ارادی طور پر نعیم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ ہاتھ اس نے خود ہی چھوڑ دیا۔ اس ہاتھ کو ظالم نے خود ہی جھٹک ڈالا اور اب۔ ضبط کے باوجود آنسو ایک بار پھر پلکوں کی باڑھ توڑ کر گالوں پر بہہ نکلے۔ اس کے اشک نعیم کو تڑپا سے گئے۔

'پلیز زیب یوں آنسو نہ بہاؤ۔ یہ بہتے آنسو مجھے مجرم بنائے دے رہے ہیں۔ یقین مانو جو کچھ بھی ہوا' بالکل اچانک ہوا۔ پاشا نے حالات ایسے سنگین کر دیئے تھے کہ قمر کو اس کے چنگل سے بچانے کے لیے مجھے.....'' اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی زیب نے اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے اس کی گرفت سے آزاد کرا لیا اور سائیڈ سے ہو کر نکل جانا چاہا۔

''نہیں زیب میں تمھیں یوں نہیں جانے دوں گا۔'' وہ اس کے راستے میں آ گیا۔

''میں اس احساس کے ساتھ قمر کے ساتھ کبھی زندگی نہیں گزار سکوں گا کہ تم مجھے تاحیات مجرم سمجھتی رہی۔ میں آنٹی کے آنسوؤں کے سامنے بے بس ہو گیا تھا۔ ان کی پریشانی نے مجھے سب کچھ بھلانے پر مجبور کر دیا۔ اپنی محبت' اپنی خوشی اور۔'' وہ کہہ رہا تھا اور زیب کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب بہہ نکلا۔

وہ اس شخص کو کیسے موردالزام ٹھہرائے جس نے اس کی بہن کی خوشیوں کی خاطر اتنا بڑا تیاگ کیا۔ جس نے اپنی محبت پر انسانیت کو ترجیح دی۔ اسے ایک طرح سے اس کا احسان مند ہونا چاہیے کہ اس نے امی اور قمر آپی کو پاشا کی فکر سے آزادی دلائی لیکن اس کے اس تیاگ نے اسے جیسے جیتے جی مار دیا تھا۔ اسے ایسا زخم دیا تھا جسے وہ کسی کو دکھا بھی نہیں سکتی تھی۔

''زیب۔'' وہ بہت بے چین تھا۔ وہ ایک بار اس کی آنکھوں میں اپنی بے گناہی کے تاثرات دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ کیا سمجھتی ہے اپنی محبت سے دستبردار ہونا آسان ہوتا ہے؟ کاش وہ ایک بار جان پاتی۔ وہ جن سنگریزوں پر چل کر اس منزل تک پہنچا ہے ان سنگریزوں نے اس کے پیروں کو لہولہان کر ڈالا ہے۔ اس نے آج تک اپنا ضبط اس قدر نہیں آزمایا۔

''زیب کیا تم مجھے اس جرم کے لیے معاف کر سکوں گی جس کے سرزد ہونے میں میرا کوئی عمل دخل نہیں۔'' اس نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس کے لہجے میں کتنی التجا تھی کتنی تڑپ تھی وہ خود بھی تڑپ اٹھی۔ جو شخص اس کے اندر سانس لیتا ہے وہ اسے اپنے سامنے مجرم بنا دیکھے۔ نہیں یہ اسے تاحیات گوارا نہیں ہو سکتا۔ بے چینی میں بے ساختگی سے اس نے اس کے جڑے ہاتھوں کو کھول دیا اور تقریباً دوڑتی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

امی حضور سخت چہرہ لیے بیٹھی تھیں۔ وہ لڑکی اور عبریز ان کے قریب آ گئے تو انھوں نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ عبریز کے اشارے پر معلیٰ نے انھیں سلام کیا۔

''آداب امی حضور۔''

''معلیٰ آپ کو آداب کہہ رہی ہے امی حضور۔'' عبریز نے مدھم لہجے میں انھیں مخاطب کیا۔

''میں نے اس لڑکی کو خصوصاً پیغام بھجوایا تھا کہ یہ میرے سامنے نہ آئے۔ میں اسے ایک لمحے کو بھی اپنے مقابل گوارا نہیں کر سکتی۔'' انھوں نے ہولے سے غرائی آواز میں کہا۔

''یہ موقع دل جلانے کا نہیں ہے امی حضور سب مہمان جمع ہیں۔ کچھ دیر میں منگنی کی رسم ادا ہوا

چاہتی ہے۔"
"ہم کسی قسم کی بحث نہیں چاہتے عبریز۔" انھوں نے سختی سے کہا۔
"اگر تم اس لڑکی کو ہمارے سامنے سے نہ لے گئے تو پھر ہم اٹھ کر اس تقریب سے چلے جائیں گے۔"
"ٹھیک ہے امی حضور اگر معلیٰ یہاں نہیں رہے گی تو پھر میں بھی چلا جاؤں گا۔ پھر آپ مہمانوں کو میری عدم موجودگی کا جواز بتاتی رہیے گا۔" آخر کو وہ بھی انہی کا بیٹا تھا۔ سب جانتا تھا کہ ماں کے غصے سے کیسے نپٹنا ہے۔
"آؤ معلیٰ۔" معلیٰ کا ہاتھ تھام کر وہ جانے کو مڑا تو انھوں نے اسے آواز دی۔
"ٹھہرو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اسے کہہ دو کہیں کونے کھدرے میں بیٹھی رہے میرے سامنے نہ آئے۔" اسی دم تسمینہ قریب آ گئی۔
"آیئے بھابی آپ میرے ساتھ آیئے۔" تسمینہ نے معلیٰ کا ہاتھ تھاما۔
"کیوں تھوڑی دیر کو میری شریک سفر میرے ہمراہ رہے۔ یہ تمھیں گوارا نہیں۔" کہنے کو یہ بات عبریز نے مذاق میں کہی تھی لیکن تسمینہ کے دل کو جا لگی۔
شریک سفر اور وہ کمتر لڑکی۔ ہاں یہ اسے ہرگز گوارا نہیں کہ وہ ایک لمحے کو بھی اس شخص کی زندگی میں رہے جس کے ساتھ کا خواب وہ برسوں سے دیکھ رہی ہے۔ پتا نہیں وہ کس حوصلے سے اس لڑکی کو اس کے ہمراہ دیکھتی ہے۔ پتا نہیں وہ کس ضبط سے اس لڑکی کو برداشت کر رہی ہے۔ وہ بھی تب تک جب تک کہ وہ اس لڑکی کو عبریز کی زندگی سے بے دخل کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاتی۔ جب تک وہ اپنا مقصد حاصل نہیں کر لیتی۔ اسے سب خندہ پیشانی سے جھیلنا ہوگا۔
"ارے کمال ہے بھابی تو دن رات آپ کے ساتھ ہیں۔ اب ذرا کچھ دیر کو انھیں ہمارے پاس بھی رہنے دیجیے۔ کیوں بھابی کچھ تو آپ پر ہمارا حق بھی ہے۔" تسمینہ کمال ضبط سے مسکرائی۔
"بالکل۔" معلیٰ نے بھی ہونٹ پھیلائے۔
عبریز نے چند لمحوں کو مسکراتی تسمینہ کی طرف دیکھا۔ کیا یہی وہ لڑکی ہے جس نے ان کی دلآویز کو موت سے ہمکنار کیا ہے۔ کیا اس لڑکی کے دل میں اتنا عناد اور بغض ہے کہ وہ اپنے مفادات کے لیے کسی کو اس کی زندگی سے بے دخل کر دے۔ لیکن ایسا انھوں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ ایسا محض معلیٰ نے کہا ہے اور معلیٰ خود کون سا اچھا بیک گراؤنڈ رکھتی ہے۔ وہ خود ایسے ماحول سے آئی ہے جہاں دولت کی خاطر دوسروں کو بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ جہاں زر کی خاطر دوسروں کو انگلیوں پر نچایا جاتا ہے۔ لیکن وہ معلیٰ کی باتوں کو مکمل طور پر نظر انداز بھی نہیں کر سکتے۔
وہ تسمینہ اور عطرت چچی کی مکاریوں سے بہر حال واقف ہیں۔ لیکن وہ دولت کے لیے انسانیت کی طرح سے بھی گر جائیں گی اس کا انھوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ ابھی تین دن پہلے ہی معلیٰ نے انھیں بتایا ہے کہ تسمینہ نے اسے پہاڑی سے نیچے دھکیلنے کی کوشش کی تھی اور اگر انجی نہ بچا لیتی تو؟
انجی کا خیال آتے ہی وہ چونکے۔ انھیں انجی سے سچائی معلوم کرنی چاہیے۔ انھوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ انجی کرسیوں پر دوسری لڑکیوں کے ہمراہ بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھی۔
"انجی۔" انھوں نے ذرا فاصلے پر رک کر انجی کو ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔

''جی بھائی۔'' انجی حیرت سے ان کے قریب آ گئی۔
''انجی مجھے تم سے کچھ جاننا ہے؟''
''کیا بھائی؟'' انجی چونکی۔
''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تین دن پہلے جب تم تسمینہ اور معلیٰ کے ساتھ باہر گھومنے گئی تھیں تو کیا تسمینہ نے کوئی ایسی حرکت کی تھی جس سے معلیٰ کو خطرہ تھا۔ میرا مطلب اس کی جان کو.....'' انھوں نے باقی جملہ لبوں میں ہی دبا لیا۔
''وہ عبریز بھائی میں کچھ نہیں جانتی میں.....'' انجی کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔
وہ جانتی تھی ایک مرتبہ پہلے بھی جب اس نے دلآویز کے سلسلے میں تسمینہ اور عطرت چچی کا بھانڈا پھوڑنے کی کوشش کی تھی تو تب عبریز بھائی نے اسے کسی بری طرح ڈانٹا تھا اور اسے امی حضور اور دوسرے بزرگوں کی ڈانٹ اور ناراضگی کا سامنا ایک کرنا پڑا تھا۔ اور آج پھر وہی معاملہ درپیش تھا۔ اگر اس نے منہ سے سچائی نکالی تو عبریز بھائی اس کی باتوں پر یقین کرنے کی بجائے الٹا اسے بے بھاؤ کی سنائیں گے۔
''تم خاموش کیوں ہو انجی؟''
''میں کچھ نہیں جانتی بھائی۔'' وہ ہکلائی۔
''دیکھو انجی میں سچائی جاننا چاہتا ہوں۔''
''لیکن آپ کون سا سچائی کو مان لیتے ہیں۔'' روانی میں اس کے لبوں سے پھسل گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے زبان دانتوں تلے دبالی۔
چند لمحے عبریز اس کی اڑی رنگت اور آنکھوں سے چھلکتے خوف کو دیکھتے رہے پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔
''دیکھو انجی یہ کسی کی زندگی کا سوال ہے۔ اگر تم مجھے اندھیرے میں رکھو گی تو ہو سکتا ہے کوئی بڑا نقصان ہو جائے۔''
''عریز بھائی۔'' کچھ دیر سوچنے کے بعد انجی نے کہا۔
''آپ جانتے ہیں ناں کہ ماضی میں بھی ایک بار میں آپ کو سچائی بتانے کی کوشش کی تھی لیکن تب آپ نے میری باتوں پر کان نہیں رکھا اور تب دلآویز بھابی.....'' اس کی آواز بھرا گئی۔ آنسو روکنے کی کوشش میں وہ جلدی جلدی پلکیں جھپکنے لگی۔
''مجھے تب اندازہ نہیں تھا کہ حالات اتنے سنگین ہو جائیں گے اور نہ کبھی میں نے سوچا تھا کہ عطرت چچی اور تسمینہ اس حد تک جا سکتی ہیں۔'' عبریز کا لہجہ بہت مدھم ہو گیا تھا۔
''تو کیا اب آپ کو یقین آ گیا ہے کہ دلآویز کی موت میں ان دونوں کا ہاتھ.....''
''فی الوقت میں اس دبی چنگاری کو کریدنا نہیں چاہتا۔ انجی۔'' عبریز کو لگا جیسے اس کے اندر تکلیف ہو رہی ہے۔
اگر واقعی دلآویز کی موت میں عطرت چچی اور تسمینہ کا ہاتھ ہوا تو وہ ساری زندگی ان دونوں کو معاف نہیں کر پائیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ کبھی خود سے بھی نظریں نہیں ملا پائیں گے کہ دلآویز کی زندگی ان کی غفلت کی نذر ہو گئی۔ اگر انھوں نے اس وقت انجی کی باتوں کو سچ مان لیا ہوتا تو؟ اور اب بھی وہ انجی سے معلیٰ کی باتوں کی سچائی کو پرکھنے آئے تھے۔

''مجھے بتاؤ انجی تین دن پہلے کیا ہوا تھا؟''

''عبریز بھائی آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ حقیقت ہے تسمینہ نے معلیٰ بھابی کو پہاڑی سے نیچے دھکیلنے کی کوشش کی تھی اور مجھے تسمینہ کی نیت پر شک تھا اس لیے میں بھی ساتھ ہو لی ورنہ.....''

انجی کہتی چلی گئی اور عبریز یوں گم صم کھڑے تھے جیسے ان کے پاس کہنے کو ایک لفظ بھی نہیں بچا۔

اگر معلیٰ سینکڑوں فٹ گہرائی میں جا گرتی تو؟ انھیں جھرجھری آ گئی تو وہ لڑکی درست تھی۔ تو وہ لڑکی صحیح کہہ رہی تھی اور انھوں نے اسے جانے کتنا برا بھلا کہہ دیا۔ وہ یہاں پیسوں کی خاطر آئی ہے اور کام مکمل ہونے پر وہ یہاں سے چلی جائے گی۔ تو پھر اسے کیا پڑی ہے کہ وہ ان کی پریشانی پر پریشان ہوتی پھرے۔ ان کے اردگرد لوگوں کے چہروں سے نقاب کھینچتی پھرے۔

انھوں نے انگوٹھے سے اپنی پیشانی دبائی اور اس سمت دیکھا جہاں تسمینہ اور معلیٰ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ اس لڑکی کا ظرف کتنا بلند ہے۔ حالانکہ وہ جانتی ہے تسمینہ نے اسے جان سے مارنے کی کوشش کی ہے۔ وہ تسمینہ کی حقیقت سے واقف ہے اس کے باوجود وہ چہرے پر کسی قسم کی ناگواری کے تاثرات کے بغیر اس سے اخلاق نبھا رہی ہے۔

وہ چند لمحے غیر ارادی طور پر معلیٰ کے چہرے پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔

''عبریز بھائی۔'' انجی کی آواز نے چونکایا۔

''ہوں.....''

''بھائی اگر ہو سکے تو اس مرتبہ عطرت چچی اور تسمینہ کو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیجیے گا۔ معلیٰ بھابی کو بچا لیجیے گا وہ بہت اچھی ہیں۔''

''اچھا۔'' وہ پہلی بار اس لڑکی کے ذکر پر مسکرائے۔

''یہ تم نے کیسے جانا کہ وہ اچھی ہیں؟''

''میری ان سے دوستی ہو گئی ہے اور دوستی میں ایک دوسرے کے عادات و خصائل کا اچھی طرح پتہ چل جاتا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی تو عبریز نے اس کے سر پر ایک ہلکی سی چپت رسید کی۔

''تم بہت بڑی بڑی باتیں نہیں کرنے لگ گئیں لڑکی؟ اور.....'' عبریز کی بات درمیان ہی رہ گئی۔ معلیٰ اور تسمینہ اپنی جگہ پر نہیں تھیں وہ چونک گئے۔ یہ دونوں کہاں گئیں۔ کہیں تسمینہ کوئی نئی چال چلنے کے موڈ میں تو نہیں؟

''انجی ذرا دیکھنا تو تمھاری بھابی اور تسمینہ کہاں ہیں؟'' بے ساختگی سے کہہ کر عبریز نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ دونوں کہیں نظر نہیں آئیں۔ وہ تیزی سے اندر راہداری میں چلے آئے۔ ایک کے بعد ایک کمرہ دیکھ ڈالا لیکن معلیٰ اور تسمینہ ندارد۔ آخر دونوں کہاں گئیں؟ وہ پریشان ہو گئے۔ تردد کی سلوٹیں ان کی پیشانی پر نمودار ہو گئیں۔

وہ دوبارہ لان میں آئے تو چونک پڑے تسمینہ موجود تھی وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی اطمینان سے خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ لیکن اس کے ساتھ معلیٰ نہیں تھی۔ وہ معلیٰ کے ساتھ کیا کر آئی ہے؟ جیسے اس سوچ نے دفعتاً ان کے دل کو اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔ ان کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

اگر معلیٰ کو کسی قسم کا نقصان پہنچ گیا تو وہ خود کو ساری زندگی صاف نہیں کر پائیں گے۔ وہ اس خاندان کے لوگوں کے شاطرانہ ذہنوں کو جاننے کے باوجود اس لڑکی کو یہاں لائے۔

دلآویز بھی انہی شاطرانہ چالوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اس حقیقت کو وہ جانتے تھے لیکن دل سے ماننے کو تیار نہیں تھے۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید اس عالیشان محل کے مکین اس حد تک نہ گرے ہوں کہ انسانیت منہ چھپاتی پھرے۔ لیکن حقیقت سے نظریں چرانے سے حقیقت بدل تو نہیں جاتی۔ انجی کی باتوں نے ان کو اس موہوم سی امید کو توڑ دیا تھا۔ انجی کی باتوں سے ان کے ذہن پر چھائی دھند جیسے چھٹ سی گئی تھی۔

''تسمینہ۔'' انھوں نے تسمینہ کو بھنچی بھنچی آواز میں پکارا۔

''جی۔'' تسمینہ مسکرائی۔

''میری بات سنو۔'' وہ تسمینہ کا بازو پکڑ کر ایک طرف لے گئے۔

''جی کہیے آج مجھ سے اپنا حال دل بیان کرنے کی خواہش آپ کے دل میں کیسی جاگی زہے نصیب۔'' وہ شوخ ہو رہی تھی اور وہ دو ایک لمحے کڑی نظروں سے اسے گھورتے رہے۔ جیسے اس کی آنکھوں میں جھانکتے اس کے اندر کے تمام راز جان لینا چاہتے ہوں۔''

''معلیٰ کہاں ہے؟'' وہ چونکی پھر مسکرائی۔

''آپ کے دل میں.....؟''

''میں اس وقت ان خرافات کے موڈ میں نہیں۔ معلیٰ تمھارے ساتھ تھی۔ لیکن وہ اب دکھائی نہیں دے رہی۔''

''اوفوہ آپ کو ناحق پریشان ہو رہے ہیں۔ وہ اندر کسی کام سے گئی ہوں گی۔''

''نہیں میں سب جگہ دیکھ آیا ہوں۔''

''اف آپ کی بے چینی دیدنی ہے۔ آپ تو یوں بوکھلائے ہیں جیسے کوئی بچہ اپنا پسندیدہ کھلونا کھو جانے پر بوکھلاتا ہے۔'' تسمینہ کے چہرے کا اطمینان برقرار تھا۔ اور یہی بات عبریز کو کھل رہی تھی۔

وہ اس کے چہرے اور اس کی آنکھوں سے اس کی چوری پکڑنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ اپنے چہرے اور آنکھوں سے کچھ بھی عیاں نہیں ہونے دے رہی تھی۔ خیر وہ انھیں نہیں جھٹلا سکتی۔ انھوں نے خود ان دونوں کو تھوڑی دیر پہلے ایک ساتھ دیکھا ہے اور اب معلیٰ غائب ہے اور وہ تسمینہ بڑے آرام سے اپنی جگہ پر موجود ہے۔ وہ اس لڑکی پر کھل کر کوئی الزام بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ کیا کہتے کہ معلیٰ کو اس نے غائب کیا ہے اور وہ سب کو کیا جواز بتاتے۔ امی حضور تو کسی قیمت پر عطرت چچی اور تسمینہ کے خلاف ایک لفظ بھی سننا پسند نہیں کریں گی۔

''تسمینہ میں ایک بار پھر پوچھ رہا ہوں کہ معلیٰ کہاں ہے؟''

''کمال ہے۔'' تسمینہ چلائی۔

''وہ بیوی آپ کی ہے اور آپ پوچھ مجھ سے رہے ہیں کوئی سنے گا تو ہنسے گا۔''

''تسمینہ۔'' اسی دم کسی نے آواز دی تو تسمینہ اس سمت بڑھ گئی اور عبریز پیشانی مسلتے اپنی جگہ ساکت کھڑے رہ گئے۔ اب وہ اس لڑکی کو کہاں تلاش کریں؟

☆☆☆

گھر آ کر وہ کتنی دیر نیرو کو اپنے ساتھ لپٹائے روتی رہی۔ نہ معلوم یہ آنسو کہاں سے ابل ابل کر آ رہے تھے۔ آج اپنی زندگی کے بے معنی ہونے کا احساس شدت سے جاگ رہا تھا۔ کہنے کو

اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں۔ پھر بھی وہ ایک محروم لڑکی ہے۔ ایک ایسی بے مایہ لڑکی جس کی کسی کو ضرورت نہیں۔ ایک ایسی بے وقعت ہستی جسے کوئی اپنے پاس رکھنے کو تیار نہیں۔ جسے اپنا ساتھ دینے کی خواہش کسی کے دل میں نہیں جاگتی۔

سمیر..... یہ نام اس کی زیست میں اتنی اہمیت کیوں اختیار کر گیا ہے کہ اس نام کے زندگی سے نکل جانے کے خیال سے ہی دل بند ہونے لگا تھا۔ اس نے سمیر سے کبھی کوئی وعدہ نہیں لیا تھا۔ لیکن پھر بھی دل کو اس شخص سے ایک امید سی بندھ گئی تھی۔ نہ معلوم وہ کون خوش نصیب لڑکی ہے جس کے ساتھ کی تمنا اس شخص نے کی ہے۔

وہ نیرو کو اپنی بانہوں میں بھینچے مسلسل اشک بہائے جا رہی تھی۔ اور وہ حیران و پریشان تھا۔ یہ ماما کو کیا ہو گیا؟ اس کی ماما تو چٹان کی طرح مضبوط تھیں۔ پھر اس چٹان میں دراڑ کہاں سے پڑ گئی۔ اس نے تو ہمیشہ اپنی ماما کو غصے میں حکم دیتے دیکھا تھا تو پھر آج ان کی آنکھوں میں غصے کی بجائے یہ آنسو کہاں سے چلے آئے۔ وہ سہم گیا۔ کہیں اس سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی؟

''ماما'' اس نے مدھم آواز میں کہا۔ ساتھ ہی وہ اس کے بازوؤں میں کسمسایا۔ لیکن ماما کی آنکھوں پر ساون کی گھٹا چھائی رہی۔ آج وہ اپنے اندر کا سارا درد ان اشکوں کے ساتھ بہا دینا چاہتی تھی۔ آج وہ اپنے سارے آنسو ایک ساتھ بہا کر ان آنسوؤں کو اپنے اندر سے ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گی۔ آج کے بعد وہ خود بھی اپنی آنکھوں میں اشک نہیں دیکھے گی۔ آج کے بعد سے وہی پہلے والی رمنا بن جائے گی۔ جسے سب اکڑباز، ضدی اور بداخلاق کہتے ہیں۔ آج کے بعد وہ خود کو کبھی اجازت نہیں دے گی کہ وہ کسی کے ساتھ کی تمنا اس شدت سے کرے کہ اپنی شخصیت کو ریزہ ریزہ کر ڈالے۔

''سوری مخل ہونے پر معذرت چاہتا ہوں۔'' یہ سمیر کی آواز تھی۔ یقیناً اس کے کان بجے ہیں۔ تو کیا وہ اس کی تمنا میں اس حد تک دیوانی ہو گئی کہ اس کے کانوں میں اس شخص کی آواز اتر آئی ہے۔ اف رمنا اتنی پریکٹیکل لڑکی ہوتے ہوئے ایسی حماقت۔ لیکن اس حماقت کے دائرے سے باہر نکلنے کو اس کا دل ایک فیصد بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ اس حماقت کے ساتھ ساری زندگی گزارنے کو تیار ہے اگر وہ شخص اس کا ساتھ دے تو؟ اور اگر وہ.....

''ایک مرتبہ مزید معذرت کہ بنا اجازت آپ کے کمرے میں چلا آیا ہوں۔'' یہ آواز اب کے قریب سے ابھری۔ بے اختیار اس نے اپنی آنسوؤں سے بھیگی پلکیں اٹھا کر دیکھا۔

ہاں وہی تھا وہی دشمن جاں جس نے اس کے دل کو گہرا گھاؤ دیا تھا۔ یہ یہاں کیسے؟ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو اس کے گھر سے شکست خوردہ اور زخمی لوٹی ہے اور اب اس کے یہ آنسو اس کی شکست خوردگی کی تمام داستان بیان کر دیں گے وہ سٹپٹائی۔ وہ بوکھلاہٹوں کے زیر اثر سرعت سے کھڑی ہو گئی۔

''آ..... آپ؟'' کانپتے لبوں سے اتنا ہی پھسلا۔

''جی یہ میں ہی ہوں لیکن آپ کو اتنی حیرت کس بات پر ہو رہی ہے؟'' سمیر نے ایک گہری نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ سوں سوں کرتی ناک، بھیگا گلابی چہرہ، بھیگی بھیگی سبزی مائل آنکھیں، آخر موہنی اور حسین لڑکی کو ہوا کیا ہے جو اتنے اشک بہا رہی ہے۔ یقیناً وہ اس کی بداخلاقی پر رنجیدہ ہے۔ اس نے کتنی سختی سے اور بدلحاظی سے نیرو کو اس کے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔ یقیناً وہ اس کی

بدلحاظی کو برداشت نہیں کر پائی۔

''سوری مس رمنا۔''

''کس بات کے لیے؟'' وہ شرمندہ تھی۔ جانے اس کے اس طرح رونے کو کیا سمجھے؟ اس کی شخصیت کے اس کمزور پہلو نے اس شخص کے سامنے یقیناً اس کی ذات کے بودے پن کو ظاہر کر دیا ہے۔ اس لیے وہ اس سے نظریں بھی نہیں ملا رہی تھی۔

''میں نے آپ سے بدتمیزی سے بات کی اور نیرو کو۔''

''چھوڑیئے سمیر صاحب نیرو آخر کو میری ذمہ داری ہے اور میری ذمہ داری کو آپ کب تک سنبھالتے۔'' پتا نہیں وہ اس پر طنز کر رہی تھی یا سادگی سے کہہ رہی تھی وہ سمجھ نہیں پایا۔ البتہ مدھم لہجے میں بولا۔

''نیرو اتنا پیارا بچہ ہے کہ میں اسے ساری زندگی اپنی ذمہ داری بنا کر رکھنے کو تیار ہوں۔ لیکن میں جانتا ہوں آپ مجھے اس کی اجازت نہیں دیں گی۔'' وہ بچے کو تاحیات اپنی ذمہ داری بنا کر رکھنے کو تیار ہے۔ لیکن وہ بچے کی ماں کو اپنی ذمہ داری بنانے کو تیار نہیں۔ پھر اس یاسیت بھرے خیال کو اپنے اندر سے مکمل طور پر کھرچ ڈالے گی۔

سمیر منتظر تھا شاید وہ اس کی بات کا جواب دے۔ لیکن وہ چپ تھی مکمل طور پر چپ۔

''ایک ذاتی سا سوال پوچھ سکتا ہوں آپ سے؟''

''میں اپنی ذات کو کسی کے سامنے کھولنا پسند نہیں کرتی۔'' بڑی مشکل سے اس نے اپنا لہجہ سپاٹ رکھا۔

''صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کے اتنا رونے کا سبب کیا ہے؟''

''میں کہاں رو رہی ہوں؟'' ہتھیلی کی پشت سے سختی سے اپنی آنکھیں مسلتے اس کا لہجہ بھی سخت ہو گیا۔ کاش وہ اسے بتا دینے پر قادر ہوتی۔ ان آنکھوں کو بھگونے کا کارن صرف تمہی ہو۔ ان آنکھوں کو اشکوں میں تر کرنے کی وجہ صرف تمہی ہو۔

''تعجب ہے۔'' اس کی بات پر اس نے کندھے اچکائے۔

''آپ رو نہیں رہی لیکن مجھے گمان گزر رہا ہے کہ کوئی تو ایسی بات ہے جس نے آپ کی آنکھوں میں ساون کی گھٹائیں بسا دی ہیں۔''

وہ شخص اس کے جذبات و احساسات سے کس قدر بے خبر ہے۔ وہ شخص اس کے اندر ہونے والی ٹوٹ پھوٹ سے بھی قطعی لاعلم ہے۔ حیرت ہے۔ کسی سے محبت کرنے والا شخص اس کی آنکھوں میں محبت کی تحریر نہیں پڑھ سکتا۔ کیا وہ اتنا ہی نااہل ہے یا پھر؟

''ویسے آپ یہاں کیوں نظر آ رہے ہیں؟ آپ نے تو کسی کے ساتھ ڈنر پر جانا تھا۔'' اس نے بات کا رخ دوسری جانب موڑ دیا۔ حالانکہ یہ رخ بہت اذیت ناک تھا۔

''جانا تو تھا، لیکن آپ کو برہمی سے اپنے گھر سے نکلتے دیکھ کر دل ڈر گیا کہ آپ غصے کے سبب گاڑی نہ کہیں دے ماریں یا پھر اپنا کوئی نقصان نہ کر لیں۔ اس سبب آپ کے پیچھے بھاگا چلا آ رہا ہوں۔''

''اوہ میرا اتنا خیال رکھنے کا شکریہ۔'' اس نے اپنی زبان کو طنز کے سہارے کھڑا کیا۔

''شکریے کا کیا سوال؟ انسانیت کے ناطے میرا اتنا تو حق آپ پر بنتا ہے ناں۔''

وہ اور انسانیت؟ اگر واقعی انسانیت کی بات کرتا ہے تو یقیناً اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتا۔ یقیناً اس کی زندگی کو سنوارنے اور اس کی تنہائیوں اور محرومیوں کو دور کرنے کی بابت سوچتا۔ لیکن کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔

''نیرو بیٹا ادھر آئیں۔'' سمیر نے خاموش کھڑے نیرو کو اپنے پاس بلایا۔

''آپ میرے ساتھ چلنا پسند کریں گے۔ مزیدار ڈنر بھی کھلاؤں گا اور واپسی پر آئس کریم بھی۔''

''پلیز آپ اس کی عادتیں خراب نہ کریں۔'' رمنا نے سختی سے کہا۔

''اور اگر میں آپ کی عادتیں بھی خراب کرنا چاہوں تو؟'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ چلئے ڈنر پر چلتے ہیں۔''

''لیکن آپ کی منگیتر منتظر ہوگی۔''

''اسے پھر کبھی لے جاؤں گا۔'' اس نے ایک دم فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ لڑکی لاکھ چھپائے لیکن ان اشکوں کا سبب اس کی بداخلاقی اور ناروا رویہ ہے یہ وہ بخوبی جانتا تھا۔ نیرو کو جس طرح اس نے اس کے حوالے کیا تھا اس پر یقیناً اس لڑکی کا دل دکھا ہوگا۔ وہ تو اسے اکڑباز اور بدماغ سمجھتا تھا۔ اسے پتھر دل سمجھتا تھا۔ لیکن وہ پتھر اندر سے ایک دم موم ہے۔ یہ اس نے تب جانا تھا جب اس کمرے کے دروازے پر اٹکتے اس نے اسے بے دریغ اشک لٹاتے دیکھا تھا اور تب سے وہ خود کو اس کا قصوروار سمجھ رہا تھا۔

''تو پھر آپ تیار ہیں؟''

''لیکن مجھے آپ کے ساتھ کہیں جانے کا شوق نہیں۔''

''پلیز کبھی تو کسی کی بات آسانی سے مان لیا کریں۔'' وہ کچھ ایسی بے چارگی سے بولا کہ ایک بے ساختہ سی مسکراہٹ رمنا کے لبوں پر پھیل گئی۔

''چلئے میں تیار ہوں۔'' وہ ایک دم ہی راضی ہوگئی۔

''کہنا ماننے کا شکریہ۔'' وہ مدھم انداز میں مسکرایا۔

☆☆☆

دنیا میں ہر رشتہ جھوٹا ہو سکتا ہے۔ دنیا میں ہر رشتے میں مکاری اور دوغلا پن ہو سکتا ہے لیکن ایک ممتا کا رشتہ ایسا ہوتا ہے جس میں کسی دغابازی اور کسی فریب کا عمل دخل نہیں ہوتا۔ ماں کی ممتا اور اس کے خلوص پر شک کرنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی نے شہد کی مٹھاس پر شک کیا ہو۔ جیسے کسی نے پھول کی خوشبو کو موردالزام ٹھہرایا ہو۔ جیسے کسی نے چاند کی چاندنی پر انگلی اٹھائی ہو۔ جیسے کسی نے سورج کی تابناکی پر شبہ کیا ہو۔ لیکن یہ کیا ہو گیا۔ اسے ایک ایسے ہی رشتے نے ڈس لیا جسے ممتا کہتے ہیں۔ اس کی زندگی ایک ایسے تعلق نے برباد کر دی جس تعلق کے لیے وہ تاحیات تڑپتی رہی اور رو رو کر خود کو سلگاتی جلاتی رہی۔

ماں..... یہ لفظ جیسے اس کے لیے زہر بن گیا۔ یہ لفظ جیسے اسے گالی لگنے لگا۔ جیسے اس لفظ کے اندھیرے نے اس کی زیست کی ساری روشنیوں کو نگل لیا۔ اس کی بربادی تو تبھی سے شروع ہوگی تھی جب اس نے اس مکار عورت کی باتوں میں آ کر انھوں نے ٹھکرایا تھا اور اس گھر کی دہلیز سے

باہر قدم رکھا تھا۔ لیکن صحیح معنوں میں تب برباد ہوگئی جب اس ماں نے اس کی عصمت کو دولت کی خاطر بیچ ڈالا۔

بہت دنوں تک اسے رہ رہ کر حسام بھائی کا خیال ستاتا رہا۔ نجانے وہ کس حال میں ہوں گے۔ جانے ان کے زخم بھرے یا نہیں۔ سیٹھ اکرام نے انھیں ہسپتال سے باہر پھینک نے کو کہا تھا۔ اس ایک رات کے بعد اس کی زندگی میں بچانے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ موتیا اور تاج بائی نے اسے ایک کٹھ پتلی بنا دیا تھا۔ وہ ان کے اشاروں پر ناچنے پر مجبور تھی۔ لیکن اندر ہی اندر موتیا کے لیے اس کی نفرت گہری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اس کے لیے اپنے لبوں سے ماں کا لفظ نکالنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ ایک ممتا اس پر تائی اماں نے نچھاور کی تھی۔ ایک ممتا اس پر دادی ماں نے لٹائی تھی اور ایک یہ دغاباز عورت تھی۔ گناہوں میں لپٹے اس وجود نے اس کے وجود کو بھی دغدار کر دیا تھا۔

موتیا اس کے کمرے میں آئی تو تاشو نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ کیا اس عورت کو ماں سمجھ کر وہ اس کے ساتھ چلی آئی۔ کیا مائیں ایسی ہوتی ہیں۔

''تاشو بیٹی۔'' موتیا نے پکارا۔

''مجھے بیٹی مت کہو موتیا بائی۔ میں کسی طوائف کے منہ سے خود کو بیٹی کہلوایا جانا قطعی پسند نہیں کرتی۔'' اس کے لہجے میں نفرتوں کی چبھن تھی۔

''دیکھ بیٹی میں جانتی ہوں تم مجھ سے خفا ہو لیکن بیٹی حقیقت کو سمجھو ایک طوائف کی بیٹی دوسروں کو نہیں ریجھائے گی تو اور کیا کرے گی۔ ہماری روزی روٹی ہی ادائیں بیچنے سے چلتی ہے۔''

''خبردار جو مجھے اپنی بیٹی کہا۔'' وہ اتنی زور سے چیخی کہ اس کی آواز پھٹ گئی۔

''میری رگوں میں ایک شریف گھرانے کا لہو دوڑ رہا ہے۔ میں اگر وقتی طور پر تمھارے چنگل میں پھنس گئی ہوں تو یہ مت سمجھ لینا کہ تمھاری جیت ہوگئی مجھے جب بھی موقع ملا میں یہاں سے نکل جاؤں گی۔ اپنے ان مخلص رشتوں کی طرف جنھوں نے ساری زندگی مجھے آنکھ کا تارا بنائے رکھا۔ یہ تو میں ہی بے وقوف تھی کہ اپنی تعلیم اور اپنے ان رشتوں کو ٹھوکر مار آئی اور تم جیسی گنہگار عورت پر یقین کر لیا۔'' اس کی بات پر موتیا ہنسی۔

''جو ایک مرتبہ اس جگہ پر آ جاتا ہے اس پر اس نام نہاد باعزت معاشرے کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اب اسی جگہ پر تمھارا جینا مرنا ہے اور اگر تم یہاں سے نکل کر چلی بھی گئیں تو تمھارے وہ مخلص رشتے تم پر تھوکیں گے بھی نہیں۔''

''ہونہہ تم کیا جانو اخلاص اور مروت کیا ہے۔ محبت کے رشتوں کی خاطر جان نچھاور کرنا کیا ہے۔ انسانیت اور خون کے رشتے کتنے مضبوط ہیں اس کا اندازہ تم جیسی بازاری عورت نہیں لگا سکتی۔'' وہ ایک ایک لفظ چبا کر بول رہی تھی۔

وہ عورت ممتا کے نام پر ایک داغ ہے۔ کسی دن اسے موقع ملا تو وہ اس عورت کا گلا دبا دے گی۔ اس کے سینے میں پستول کی ساری گولیاں اتار کر اپنی نظروں میں سرخرو ہو جائے گی۔ اپنے ضمیر سے آنکھیں ملا پائے گی کہ اس نے ایک ناسور کو اس معاشرے کے جسم سے نکال پھینکا۔

''بازاری تو اب تم بھی ہو بچی۔ رسی جل گئی مگر بل اب تک نہیں گئے۔'' موتیا بولی تو تاشو نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لینی چاہی تو موتیا دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''خبردار جو مجھے بازاری کہا تو۔''

''اس طرح چیخنے سے کیا حقیقت بدل جائے گی۔ بہت شرافت کا ڈھنڈورا پیٹ رہی ہو۔اب شرافت رہی کہاں؟ اب تو کوئی شریف انسان تمھارے وجود پر ایک نگاہ ڈالنا بھی پسند نہیں کرے گا۔''

''بکواس بند کرو۔'' اس سے مزید برداشت نہ ہو سکا تو دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی۔

''اور تم یہ رونا دھونا بند کرو اور تیار ہو جاؤ۔ آج رات مجرے کے لیے کسی نواب کی حویلی میں جانا ہے۔ اگر تم نے نواب کو خوش کر دیا تو وہ اتنی دولت تم پر نچھاور کرے گا کہ تم نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔''

''میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' وہ آنسو بہاتے بولی۔

''یہ انکار تم جا کر تاج بائی سے کرو۔ مجھے تو تاج بائی نے جیسا کہا ویسا تم سے کہنے چلی آئی۔''

یہ ماں ہے؟ کیا ماں ایسی ہوتی ہے؟ ہاں اس کی سزا یہی ہے ایک مکار عورت کو اپنا سب کچھ مان کر وہ اس کے ساتھ چلی آئی۔ اس کی سزا تو اسے بہر حال ملنی ہی چاہیے۔ وہ روتے روتے ایک دم ہنسی تو ہنستی ہی چلی گئی۔

''کیا ہوا تمھیں؟'' موتیا کو اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا۔

''چلی جاؤ میرے سامنے سے۔ ورنہ تمھارا سر توڑ دوں گی۔'' تاشو نے مڑ کر ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی پرفیوم کی شیشی اٹھائی اور اسے مارنے کو ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ یہ لڑکی کی تو ہوش و خرد سے بیگانہ ہوگئی۔ کہیں واقعی اس کا سر نہ پھوڑ ڈالے۔ موتیا نے اس کمرے سے باہر نکلنے میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں لگائی۔ تاشو نے وہ شیشی سامنے دیوار پر دے ماری اور بستر پر اوندھی گر کر سسکیاں بھرنے لگی۔

''خدایا اسے موت دے دے' خدایا اسے فنا کر دے' خدایا اسے اس ذلت بھری زندگی سے چھٹکارا دے دے' خدایا اسے اس کی نادانی کی اتنی کڑی سزا تو نہ دے کہ وہ ہر ہر پل مرتی رہے۔

''صیام۔'' یہ نام ایک سسکی کی صورت اس کے لبوں سے ادا ہوا۔

''صیام کہاں ہو تم؟ ایک بار آ کر ذرا اس نادان کی حالت تو دیکھ جاؤ تو تم میری آنکھوں میں ہلکی سی نمی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ آؤ آج آ کر دیکھو کہ اس لڑکی نے رو رو کر اپنا برا حشر کر لیا ہے ایک بار چلے آؤ صیام۔ دیکھو تو اس بے وقوف لڑکی نے آنکھیں بند کر کے دلدل میں چھلانگ لگا دی ہے اور اب یہ دلدل تیزی سے اسے اپنے اندر کھینچ رہی ہے۔''

بہت دنوں بعد صیام کا خیال آیا تو دل جیسے بند سا ہونے لگا۔ سانسوں میں جیسے چنگاریاں سی سلگنے لگیں۔ وہ اس کے بنا بتائے غائب ہو جانے پر کتنا پریشان ہوگا۔ اسے کیا پتہ کہ اس پر کیا کیا بیت گئی۔ وہ اپنا ہر مشورہ اس سے لیا کرتی تھی۔ کاش اس نے گھر کی دہلیز پھلانگنے سے پہلے اس سے مشورہ لے لیا ہوتا۔ اسے یقین تھا اگر وہ صیام کو ساری بات بتا دیتی تو یقیناً صیام نے اسے روک لینا تھا۔ وہ اسے کبھی اس عیاری کے ساتھ جانے نہیں دیتا۔ وہ اسے یہی کہتا کہ برسوں کی محبت بھرے رشتوں کو چند دنوں کے رشتے پر قربان نہ کرو۔ دادی ماں' حسام بھائی' تائی اماں' صیام یہ سب صورتیں اس کے اندر گڈمڈ سی ہو گئیں۔ وہ جیسے ادھ موئی سی پڑی تھی کبھی اس کے اندر ایک خیال بجلی کی طرح چمکا۔ اسے ایک بار صیام سے رابطہ تو کرنا چاہیے۔ اگر صیام کو پتہ چل گیا کہ وہ

یہاں پھنسی ہے تو وہ اسے ہر حال میں اور کسی بھی قیمت پر یہاں سے نکال لے جائے گا۔ اور اگر وہ یہاں نہ آیا تو؟ اگر اس نے حقیقت جان کر اس کے وجود پر تھوک دیا تو؟ اس کے کانوں میں موتیا کی آواز گونجنے لگی۔

''اب تو کوئی شریف انسان تمھارے وجود پر ایک نگاہ ڈالنا بھی پسند نہیں کرے گا جو ایک مرتبہ اس جگہ پر آ جاتا ہے اس پر اس نام نہاد باعزت معاشرے کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔''

موتیا کی صورت رہ رہ کر ابھرنے لگی۔ موتیا کی آواز اسے اپنے چاروں طرف آنے لگی۔ نہیں۔ اس نے کانوں پر سختی سے ہاتھ رکھ لیے۔

چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ اس گندگی کا حصہ نہیں بنے گی۔ وہ اس غلاظت اور تعفن زدہ ماحول سے ہر حال میں نکل کر رہے گی اور اس کے اس عمل میں اس کا ساتھ صیام ضرور دے گا۔ لیکن صیام ساتھ دے گا ناں جب اسے پتہ چلے گا کہ وہ کہاں ہے؟ اور کس حالت میں ہے۔ اس خیال آتے ہی اس کے جسم میں جیسے توانائی سی بھر گئی۔ وہ سرعت سے اٹھی اور کمرے کے دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا۔ راہداری خالی تھی اسے فون کرنا ہے۔ اور فون صرف تاج بائی کے کمرے میں ہے۔

تاج بائی کا کمرہ نچلی منزل پر تھا۔ اگر وہ اس کے کمرے میں جا کر فون کرنے میں کامیاب ہوگئی تو یقیناً اس کی زندگی میں چھائے اندھیرے چھٹ جائیں گے۔ صیام کا خیال آتے ہی تن من میں سنسناہٹ سی ہونے لگی تھی۔ دل کو ڈھارس سی ہوئی تھی اور سلگتے ذہن پر جیسے ٹھنڈی پھوار سی پڑ گئی تھی۔ اسے صیام کا خیال پہلے کیوں نہیں آیا؟ راہداری کے اختتام پر سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ وہ سیڑھیوں تک اطمینان سے چلی آئی۔ گو کہ دل سینے میں بڑی زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایک خوف بھی ذہن پر سوار تھا لیکن صیام کے خیال نے اس کے سارے ڈر کو جیسے نگل سا لیا تھا۔ وہ سیڑھیوں سے ایک ایک قدم پھونک کر اتری۔

''وہ..... وہ میں امی سے ملنے آئی ہوں۔'' پہلے تو وہ سٹپٹائی۔ لیکن پھر فوراً ہی اسے ایک معقول بہانہ سوجھ گیا۔ موتیا کی وجہ سے اسے کہیں بھی آنے جانے کی پابندی تھی۔ وہ پہلے بھی موتیا سے ملنے آتی رہی تھی۔

''اچھا موتیا بائی اپنے کمرے میں ہوں گی۔''

چاندنی نے بتایا تو تاشو نے اثبات میں سر ہلا کر موتیا کے کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔ ذرا آگے بڑھ کر اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ چاندنی کسی کمرے میں گھس گئی تھی۔ چاندنی کے منظر سے غائب ہوتے ہی تاشو نے اپنا رخ تاج بائی کے کمرے کی طرف کر لیا۔

یہ سامنے تاج بائی کا کمرہ تھا۔ اس کمرے میں داخل ہونا دل گردے کا کام تھا۔ اگر تاج بائی کو پتہ چل جائے کہ وہ کس مقصد کے تحت اس کے کمرے میں چوری چھپے داخل ہوئی ہے تو وہ یقیناً اس کی بوٹیاں کتوں کے آگے ڈال دے گی۔ اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ اس نے دھک دھک کرتے دل سمیت پردہ اٹھا کر تاج بائی کے کمرے میں جھانکا۔

(باقی آئندہ)

گواہی دل کی

شمع جبیں

روئی کی طرح آسمان سے گرتی برف نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ دور دور تک کچھ نہیں تھا سوائے سفید لبادے میں لپٹے گھروں اور درختوں کے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر چیز اس کی انا پرستی پر شکوہ کناں ہے۔ لیکن وہ خود یکسر انجان بنا کھڑکی کے قریب ہی راکنگ چیئر پر بیٹھا تھا اور سگریٹ سلگائے بظاہر کھڑکی سے باہر دیکھنے میں مصروف تھا لیکن خیال کی رو بہت دور اسی ہستی کے آس پاس بھٹک رہی تھی جس سے پیچھا چھڑانے کے لیے وہ اتنی دور خوابوں کی اس نگری میں چلا آیا تھا۔

''اذعان..... کیا وحشت ہے یار۔ اتنی دیر سے بیل ہو رہی ہے تم فون اٹھاتے کیوں نہیں ہو؟'' باتھ روم کا دروازہ جتنے جارحانہ انداز میں کھولا گیا تھا اس سے کہیں زیادہ زور سے بند بھی کیا گیا تھا۔

''ہاں..... نہیں وہ.....'' اس نے چونکتے ہوئے پاس ہی پڑا موبائل اٹھایا تھا پھر نمبر دیکھ بے دلی سے آف کر کے واپس رکھ دیا۔

''کیا ہوا..... وینا کا فون تھا؟'' یاسر تولیے سے بالوں کو رگڑتے ہوئے پوچھا۔

''ہوں.....'' اس نے ایک آہ بھر سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا اور نئی سگریٹ سلگانے لگا۔

''یہ تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو اذعان..... جب تم نبھا نہیں سکتے تھے تو تمہیں کمٹمنٹ کرنی بھی نہیں چاہیے تھی۔'' یاسر نے تولیہ بیڈ پر اچھالا اور ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہوا۔

''نبھا تو رہا ہوں۔'' اس نے کسی قدر بے زاری سے کہہ کر سگریٹ کا کش لگایا۔

''آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں اسے نبھانا نہیں لٹکانا کہتے ہیں۔'' اس نے بالوں میں برش چلاتے ہوئے کہا۔

مکمل ناول

''کیا مطلب؟'' اذعان نے سیدھے ہو کر اچنبھے سے اس کی پشت کو گھورا تو وہ پورا اس کی طرف گھوم گیا۔

''مطلب یہ کہ یہ منگنی تمھاری مرضی سے کی گئی ہے..... پھر تم اس سے فرار کیوں چار رہے ہو؟..... کیوں اس کی میلز کا جواب نہیں دیتے..... کیوں اس کی کالز ریسیو نہیں کرتے؟ کبھی تم نے یہ جاننے کی کوشش کی ہے اذعان کہ تمھاری زندگی میں اتنے سارے ''کیوں'' کہاں سے آ گئے ہیں؟'' یاسر نے اسے خود احتسابی پر اکسایا لیکن ابھی انا کا خول پوری طرح ٹوٹا نہیں تھا بس دڑاڑیں ہی پڑی تھیں۔

''پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ جھنجلا کر دوبارہ کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔

''دو کشتیوں پر سوار رہو گے تو کبھی کنارے پر نہیں پہنچ پاؤ گے۔'' یاسر نے تاسف سے اسے دیکھا۔

''تم سے کس نے کہا کہ میں دو کشتیوں پر سوار ہوں۔'' وہ اب بھی ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''اپنی انا کے اس خول سے باہر آ جاؤ اذعان ورنہ نہ تم چین سے جی سکو گے اور نہ کسی اور کو جینے دو گے۔''

''یاسر پلیز مجھے کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دو۔'' اس نے بے دردی سے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا۔

''اوں..... اکیلا چھوڑ دوں۔'' وہ تمسخرانہ انداز میں ہنسا۔

''شاید تم بھول رہے ہو پچھلے ایک ماہ سے تم یہاں اکیلے ہی ہو۔ جس محبت سے دامن چھڑانے کے لیے تم یہاں آئے تھے وہ آج بھی تمھارے ساتھ ہی ہے۔ کبھی احساس بن کر، کبھی درد بن کر، تو کبھی آنسو بن کر تمھاری آنکھ سے چھلک پڑتی ہے۔ محبت فاصلوں کی مقید نہیں ہوتی یہ اپنا آپ منوا ہی لیتی ہے۔ دیر یا جلد..... جیسے اب تم سے منوا رہی ہے۔''

''شٹ اپ..... جسٹ شٹ اپ..... بہت دیر سے تمھاری بکواس سن رہا ہوں اب اگر ایک اور لفظ بھی کہا تو.....؟'' وہ جارحانہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''تو کیا کر لو گے'..... ہاں بولو۔'' اس نے دوبدو جواب دیا۔

''یو.....'' اس نے وارننگ کے سے انداز میں انگلی اس کی طرف اٹھائی۔

''اذعان حیدر کی محبت وہ عام سی لڑکی نہیں ہو سکتی۔ مائنڈ اٹ۔'' ضبط کی شدت سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''اذعان حیدر کی محبت وہ عام سی ہی لڑکی ہے۔..... مائینڈ اٹ۔'' یاسر نے بھی بالکل اسی کے انداز میں جواب دیا تھا اور اس نے بہت زور سے پاس ہی پڑی ٹیبل کو ٹھوکر لگائی اور چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔

''کاش کہ تم سمجھ سکتے کہ وہ تمھاری محبت ہے تو پھر عام کیسے ہو سکتی ہے؟'' یاسر نے اسے جاتے دیکھ کر تاسف سے سوچا۔

وہ بڑے جارحانہ انداز میں گاڑی میں آ کر بیٹھا تھا لیکن پھر تھک کر اسٹیئرنگ پر سر رکھ دیا۔ اچانک ہی قریب ایک ہنسی گونجی تھی اور اس نے چونک کر سر اٹھا لیا۔ سامنے پلر سے ٹیک لگائے وہی کھڑی تھی۔ تمسخر اڑاتی نگاہیں اسے ہی دیکھ رہی تھیں وہ اس کی بے بسی پر ہنس رہی تھیں۔ اس نے چابی اگنیشن میں ڈال کر گاڑی کو ریورس میں کیا اور ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ دیا۔ گاڑی بہت تیزی سے بیک ہوئی تھی۔ وہ ہیولا تو مٹ گیا تھا لیکن ہنسی کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔

جیسے ہی گاڑی بیسمنٹ سے نکل کر روڈ پر پہنچی اس نے فل سپیڈ میں گاڑی دوڑا دی۔ ہنسی کی آواز کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ اس نے

اسپیڈ کم کر کے ایک گہرا سانس لیا۔ تب ہی اچانک اسے اپنی پشت سے ایک سرگوشی سنائی دی۔

''ایک بار دل کی بھی سن کر دیکھ لیجیے گا کم از کم ایک غلط فیصلہ کرنے سے تو بچ جائیں گے۔'' اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا تھا اور اسی وقت لیفٹ سائیڈ سے آتی کار پوری شدت سے اس کی گاڑی سے ٹکرائی تھی اور وہ ہوش و خرد کی دنیا سے بیگانہ ہو گیا۔

''کشف ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' تیسری بار بھی وہی سوال بڑی بیچارگی سے کیا گیا تھا۔

''انڈے خرید رہے ہیں۔'' اس نے جھنجلا کر جواب دیا تھا اور پاس ہی کھڑے اذعان نے بڑی مشکل سے اپنے قہقہے کا گلا گھونٹا تھا۔ آس پاس کھڑے لوگ بھی دلچسپی سے انھیں ہی دیکھنے لگے تھے اس لیے وہ جلدی سے وضاحت دینے لگی۔

''وہ..... میں تو اس لیے پوچھ رہی تھی کہ پچھلے ایک گھنٹے میں تم اس گیلری کے چار راؤنڈ لے چکی ہو تو کیا ابھی تک کوئی پینٹنگ پسند نہیں آئی؟''

''انڈے خریدنے اور پینٹنگ خریدنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔'' بڑے سکون سے جواب دیا گیا تھا اور اذعان کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اس نے چونک کر پینٹنگ سے نظریں ہٹائیں تھیں آس پاس کھڑے ہر چہرے پر ہی مسکراہٹ تھی لیکن اس کے دیکھتے ہی سب لوگ اردگرد لگی پینٹنگز کی طرف متوجہ ہو چکے تھے سوائے اس ایک شخص کے جو بڑی ڈھٹائی سے اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس نے سمعیہ کی طرف دیکھا تو وہ کندھے اچکا کر آگے بڑھ گئی۔ اس نے بھی اس کی تقلید میں قدم آگے بڑھا دیے۔

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیے

ابنِ انشاء

طنز و مزاح، سفرنامے

اردو کی آخری کتاب
آوارہ گرد کی ڈائری
دنیا گول ہے
ابن بطوطہ کے تعاقب میں
چلتے ہو تو چین کو چلیے

قدرت اللہ شہاب

یا خدا
ماں جی

بابائے اردو مولوی عبدالحق

قواعد اردو
انتخاب کلام میر

ڈاکٹر سید عبداللہ

مقاماتِ اقبال
طیف غزل
طیف اقبال
طیف نثر

مکمل فہرست طلب کیجیے

لاہور اکیڈمی
۲۰۹ سرکلر روڈ

''تم بتا نہیں سکتیں تھیں کہ سب لوگ ہمیں ہی دیکھ رہے ہیں؟'' اس نے سمعیہ کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''تو تم سے کس نے کہا تھا کہ انڈوں اور پینٹنگز کا موازنہ شروع کر دو اور وہ بھی اتنے بلند و بانگ انداز میں۔''

''کیا..... میں نے شروعات کی اور وہ کشف ہم یہاں کیا کر رہے ہیں' کہہ کر میرے کان کون کھا رہا تھا۔'' اس نے فوراً ہی اس کی نقل اتاری۔

''ہاں تو تم سیدھا سا جواب نہیں دے سکتیں تھیں۔ لیکن نہیں عادت سے مجبور پوچھ کچھ' جواب کچھ ملے گا۔'' سمعیہ نے سارا الزام اس کے سر ڈال دیا۔

''کیا..... کیا میں؟'' کشف ایکدم پھڑک اٹھی۔

''صحیح تو کہہ رہی ہوں۔'' سمعیہ نے فوراً ہی اس کی بات کاٹ دی تھی۔

''مجھے تمھیں اپنے ساتھ لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔''

''ہاں تو میں کون سا تمھارے ساتھ آنے کے لیے مری جا رہی تھی۔ وہ تو خالہ جانی کی وجہ سے.....'' لیکن کشف اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اگلی پینٹنگ کی طرف بڑھ گئی۔

''کشف حد ہے نیستی کی۔ دس بجے رہے ہیں اور تم ابھی تک بستر میں ہو..... کشف۔'' اس نے آہستہ سے اسے ہلاتے ہوئے کہا۔

''اوں..... سونے دو نہ۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور کروٹ بدل کر دوبارہ سو گئی۔

''اچھا..... ابھی بتاتی ہوں۔'' اس نے پنکھے کی اسپیڈ فل کی اور اس کے اوپر سے کمبل کھینچ لیا۔ رات کو ہونے والی بارش نے موسم کی خنکی میں اچھا خاصا اضافہ کر دیا تھا اس لیے وہ فوراً ہی اٹھ بیٹھی۔

''کیا ہے یار سمعیہ یہ صبح صبح ملک الموت کی طرح کیوں نازل ہو گئی ہو؟'' اس طرح اٹھائے جانے پر اس کا غصہ یقینی تھا۔

''صبح صبح..... ہوش میں آ جایئے محترمہ دوپہر ہونے والی ہے۔'' اس نے پنکھے کا سوئچ آف کرتے ہوئے کہا۔

''کیا ہے یار ایک سنڈے کا دن ہی تو ملتا ہے سونے کے لیے ورنہ تو وہی.....''

''تو کس نے کہا تھا جاب کرنے کے لیے..... اچھی خاصی عیش کی زندگی گزار رہی تھیں لیکن تمھیں بھی تو شوق ہے نہ ایڈونچر کا..... تو بھگتو۔''

''پلیز اب یہ صبح صبح اپنی نصیحتوں کا پٹارا تو کھول کر مت بیٹھو۔'' اس نے فوراً ہی ٹوک دیا۔

''اٹھ گئیں بیٹا۔'' صفیہ بیگم نے اندر آتے ہوئے کہا۔

''کہاں خالہ جانی ابھی تک تو آپ کی لاڈلی بستر میں ہی ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو وہ محض گھور کر رہ گئی۔

''تم دونوں تو میری سمجھ سے باہر ہو۔ ایک دوسرے کے بغیر گزارہ بھی نہیں ہے اور لڑتی بھی اتنا ہی ہو۔'' صفیہ بیگم نے کھڑکی کے پردے سائیڈ پر کیے تو سورج کی نرم گرم سی کرنوں سے پورا کمرہ بھر گیا۔

''وہ آپ نے سنا نہیں ہے خالہ جانی کہ جو لوگ زیادہ جھگڑتے ہیں وہ ایک دوسرے سے محبت بھی اتنی ہی زیادہ کرتے ہیں۔''

''ہاں..... اسی لیے تو اس طرح اٹھائے جانے پر میں نے تمھارا گلا نہیں دبایا۔'' کشف نے فوراً ٹکڑا لگایا۔

''بندی احسان مند ہے آپ کی۔'' سمعیہ نے ذرا سا سر خم کرتے ہوئے کہا اور کشف کے ساتھ ساتھ صفیہ بیگم بھی ہنس پڑیں۔

کل شام کو آرٹ گیلری میں ہونے والی لڑائی کا شائبہ بھی دونوں کے چہروں پر نہیں تھا۔ ان دونوں کی دوستی تھی ہی ایسی۔ دونوں کے گھر ساتھ ساتھ تھے۔ احسان علی اور جمال احمد نے یہ گھر خریدے ہی اسی لیے تھے کہ دونوں کا نقشہ بالکل ایک جیسا تھا۔ دونوں گھروں کے لان ایک ساتھ بنا کر درمیان میں دیوار کی بجائے بوگن ویلیا کی بیل سے خوبصورت راستہ بنایا گیا تھا۔

دونوں کا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا۔ سکول میں جانے کے بعد تو جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کی ضرورت بن گئیں تھیں۔ کشف تو جمال صاحب اور صفیہ بیگم کی اکلوتی اولاد تھی جبکہ احسان علی اور صاعقہ بیگم کی تین اولادیں تھیں۔ فہد' سعدیہ اور سمعیہ۔ سعدیہ کی شادی کے بعد سے سمعیہ کا زیادہ وقت کشف کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ حالانکہ اس کے کزنوں کی ایک لمبی لسٹ تھی۔ کشف نے بچپن سے ہی صرف ایک ہی رشتہ دیکھا تھا۔ خالہ کا جو سمعیہ کی والدہ تھیں۔ ددھیالی رشتہ داروں میں سے وہ کسی سے واقف نہیں تھی کیونکہ جمال صاحب کو اپنی پسند سے شادی کرنے [illegible] میں خاندان سے الگ کر دیا گیا تھا اور اس نے بھی بھی جاننے کی کوشش نہیں کی تھی ہیں اب وہ کہاں' امی اور بابا کے ساتھ خالہ اور خالو نے بھی بہت پیار دیا تھا۔

سڑک پر رش ہونے کی وجہ سے وہ بہت آہستہ گاڑی چلا کر رہی تھی حالانکہ اب وہ خاصی اچھی ڈرائیونگ کر لیتی تھی لیکن زیادہ رش میں وہ اب بھی نروس ہو جاتی تھی۔

''جس رفتار سے تم گاڑی چلا رہی ہو مجھے نہیں لگتا کہ ہم آج پہنچ پائیں گے۔'' سمعیہ نے اس کی حد سے زیادہ احتیاط پسندی پر چوٹ کی۔

''لیکن پتا بھی تو چلے کہ آخر ہم جا کہاں رہے ہیں؟'' اس کی نظریں ونڈ سکرین پر ہی جمی تھیں۔

''کے۔ ایف۔ سی۔''

''کس خوشی میں؟'' اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

''تم ٹریٹ جو دے رہی ہو۔'' اس نے شان بے نیازی سے کہا۔

''واٹ.....؟'' اس نے گھبرا کر بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور ان کے بالکل پیچھے کسی گاڑی کے ٹائر چرچرائے لیکن گاڑی سپیڈ میں ہونے کی وجہ سے جلدی رک نہیں پائی اور ٹکرا گئی۔ سمعیہ کا سر ڈیش بورڈ سے جا ٹکرایا اور خود بھی وہ بھی اسٹیئرنگ پر گری تھی۔

''آؤچ..... بریک مارنے سے پہلے بتا تو دینا تھا۔'' اس نے سر سہلاتے ہوئے کہا۔

''بتائے گا تو اب وہ۔'' کشف بیک مرر میں دیکھ کر بولی۔

''یہ آواز کیسی تھی..... اور یہ تمھارے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟'' سمعیہ نے اس کی ہراساں سی شکل دیکھ کر کہا۔

''پیچھے دیکھو۔'' اس نے کہا تو سمعیہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کوئی موصوف جارحانہ تیور لیے گاڑی سے باہر کھڑے تھے اور اب انہی کی طرف ہی آ رہے تھے۔ [illegible] دونوں بھی باہر نکل آئیں۔ ان دونوں کی شکلیں دیکھنے [illegible] وہ چونک اٹھا اور [illegible] تھا۔

''ویسے مجھے یقین تھا کہ یہ کارنامہ آپ ہی دونوں کر سکتی ہیں..... لڑنے کے لیے اس سے بہتر جگہ نہیں ملی تھی آپ دونوں کو۔'' اس نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

''آپ کو لڑکیوں سے بات کرنے کی ذرا بھی تمیز نہیں ہے کیا؟'' سمعیہ نے اپنی حیرت پر قابو پا کر ذرا سختی سے کہا۔

''محترمہ میز کسی کی جان سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتے۔ آپ جانتی ہیں کہ اگر میں بروقت بریک نہ لگاتا تو کیا ہوسکتا تھا۔''

''آئی ایم سوری غلطی میری ہے آپ کا جو بھی نقصان ہوا ہے وہ میں پورا کر دوں گی۔'' کشف نے شرمندگی سے کہا۔

''اٹس اوکے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آیندہ خیال رکھیے گا۔'' اس نے بات ختم کی اور چلا گیا۔

''ویسے کیا زبردست پرسنیلٹی پائی ہے موصوف نے۔ اس کی تو ایک نظر ہی مقابل کو چاروں شانے چت کر سکتی ہے۔'' سمعیہ نے اسے ستائشی نظروں سے جاتے دیکھ کر کہا۔

''اگر تمھیں یہ اتنا ہی پسند گیا ہے تو خالہ جانی سے کہوں گی کہ اسے گود لے لیں۔ تمھاری آرزو بھی پوری ہو جائے گی اور انھیں ایک پلا پلایا بیٹا مل جائے گا۔'' اس نے جل کر کہا۔

''بکو نہیں۔'' اس نے کہا اور دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''ویسے یہ ٹریٹ کس خوشی میں لی جا رہی ہے مجھ سے؟'' گاڑی میں بیٹھ کر اسے اچانک یاد آیا تو گاڑی اسٹارٹ کرتے کرتے رک کر پوچھنے لگی۔

''تمھاری گاڑی خریدنے کی خوشی میں۔'' اس نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

''کیا..... گاڑی خریدے ہوئے مجھے پورا مہینہ ہونے والا ہے اور تمھیں آج ٹریٹ سوجھ رہی ہے۔''

''ہاں تو اس میں بھی قصور تمھارا ہی ہے..... کب سے ٹریٹ مانگ رہی ہوں اور تمھیں اپنے آفس سے ہی فرصت نہیں ملتی۔'' اس نے ذرا خفگی سے کہا تو اس نے گاڑی کا رخ کے۔ ایف۔ سی کی طرف کر دیا۔

''اچھا..... اچھا زیادہ منہ پھلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ندیدی تو تم بچپن سے ہی اس لیے اب کچھ نہیں کیا جا سکتا۔'' اس جتاتے ہوئے کہا تو وہ ''تم ہی سے سیکھا ہے'' کہہ کر ہنس پڑی۔

اس نے ہارن بجایا تو سمعیہ کو گیٹ کھو دیکھ کر وہ کسی قدرے پریشان ہوگئی۔ جلدی گاڑی اندر لا کر وہ گاڑی سے اتری تو تب تک سمعیہ بھی گیٹ بند کر چکی تھی۔

''سمعیہ! امی تو ٹھیک ہیں ناں؟'' اس جلدی سے پوچھا۔

''ہاں..... ہاں بے فکر رہو۔ خالہ جا بالکل ٹھیک ہیں۔'' اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا

''تو پھر تم.....؟'' کشف کو ان غیر موجودگی پریشان کر رہی تھی۔

''خالہ جانی اور انکل کو ابو نے بلوایا تھا۔'' سمعیہ نے اس کے ساتھ اندر آتے ہوئے کہا۔

''خیریت..... اور یہ پاپا اتنی جلدی آفس سے کیسے آ گئے؟'' اس نے بیگ صوفے پر پھ اور گھڑی پر نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا جو ابھی پا بجا رہی تھی۔

''ابو انھیں ساتھ لے کر ہی آئے تھے۔ ا فیکٹ وہ دنوں تو آج دوپہر میں ہی آ گئے تھے تب سے ہی مذاکرات چل رہے ہیں۔'' اس صوفے پر گرتے ہوئے بتایا۔

''کیسے مذاکرات؟'' کشف نے حیرا ہوتے ہوئے پوچھا۔

''فہد بھائی نے آج صبح ایک ایٹم بم پھو ہے جو سیدھا امی کے سر پر آ کر گرا۔''

''ایک تو تم پہیلیاں بہت بجھواتی ہو۔ سیدھ طرح بتاؤ کیا ہوا ہے؟'' کشف نے اس کی گھ پھرا کر بات کرنے کی عادت سے زچ ہو کر کہا۔

''بیٹھو۔'' سمعیہ نے اسے کھینچ کر اپنے پا

بٹھایا۔
''فہد بھائی نے لڑکی پسند کر لی ہے۔''
''رئیلی یہ تو خوشی کی بات ہے..... تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔'' وہ ایکدم پرسکون ہوگئی۔
''امی کے سامنے اگر تم نے یہ کہا ہوتا تو وہ تمہیں کچا چبا جاتیں۔'' اس نے ڈرایا۔
''بکواس نہیں کرو خالہ جانی کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔''
''سب سے بڑا اعتراض ہی انہی کو ہے۔ حالانکہ ابو نے کتنا سمجھایا کہ زندگی اسے گزارنی ہے تو پسند کرنے کا حق بھی اسے ہی ہونا چاہیے۔ لیکن ان کی سوئی تو ایک ہی جگہ اٹکی ہے تب ہی تو خالہ جان اور انکل کو بلایا گیا ہے۔ شاید ان کی بات امی کی سمجھ میں آ جائے۔'' اس نے سرد آہ بھری۔
''چلو میں سمجھاتی ہوں انھیں دیکھنا وہ میری بات کبھی نہیں ٹالیں گی۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو سمعیہ نے فوراً ہاتھ پکڑ کر اسے دوبارہ بٹھا لیا۔
''بیٹھ جاؤ ورنہ تمہیں دیکھ کر ان کا زخم پھر سے تازہ ہو جائے گا۔''
''کیا بک رہی ہو؟''
''بک نہیں رہی ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ ہمارے بزرگوں نے بچپن ہی میں ہماری شادی فہد سے کرنے کا سوچ لیا تھا۔''
''کیا.....؟'' اسے سخت شاک لگا تھا۔
''ہاں..... تاکہ رشتوں کو اور مضبوط کیا جا سکے اور اب فہد بھائی کی وجہ سے.....'' اسے بھی دکھ ہو رہا تھا۔
''یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ امی اور خالہ جانی سگی بہنیں ہیں اس سے زیادہ مضبوط رشتہ بھی بھلا ہوسکتا ہے اور پھر پاپا اور انکل کی دوستی تو نایاب ہے۔''
''سچ کشف کتنا اچھا ہوتا اگر تم بھابی بن کر ہمارے گھر.....''
''بس بس اس سے آگے کچھ مت بولنا کیونکہ جو بھی ہوا اچھا ہی ہوا ہے۔'' اس نے فوراً ہی سمعیہ کو ٹوک دیا تھا۔
''تمہیں ذرا بھی دکھ نہیں ہوا۔'' اس نے بہت گہری نظروں سے اسے دیکھا۔
''نہیں۔'' اس نے پورے اطمینان سے جواب دیا تھا۔
''ایک بات پوچھوں کشف؟''
''ایک نہیں دس پوچھو۔'' اس نے پورے یقین سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔
''کیا کوئی اور.....؟'' اس نے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھا لیکن ان آنکھوں میں آج بھی وہی معصوم سا تاثر تھا جو وہ بچپن سے دیکھتی چلی آئی تھی۔
''تمہیں کیا لگتا ہے؟'' اس نے الٹا اسی سے سوال کر لیا۔
''مجھے لگتا ہے نہیں۔''
''کیوں.....؟''
''کیونکہ تمہیں تم سے زیادہ میں جانتی ہوں۔'' اس نے پورے استحقاق سے کہا اور تمہارا یہ دعویٰ غلط نہیں ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس پڑی۔

وہ بہت ہی انہماک سے کسی فائل کا مطالعہ کر رہا تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔
''یس کم ان۔'' اس نے فائل سے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔
''ہائے ہینڈسم۔'' اس نے اندر داخل ہو کر ایک ادا سے کہا۔
''اوہ..... ہیلو وینا۔'' اذعان نے نظریں اٹھا کر مسکراتے ہوئے کہا۔
''بزی۔'' اس نے پرس ٹیبل پر رکھ کر سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"یس۔"

"تو پھر میں چلتی ہوں۔" اس نے پرس دوبارہ اٹھالیا۔

"اب اتنا بھی بزی نہیں ہوں کہ تمھارے لیے وقت نہ نکال سکوں۔ بس تم پانچ منٹ بیٹھو میں یہ کام ختم کرلوں تو اکٹھے ہی لنچ کے لیے چلتے ہیں۔" اس نے کہا تو وہ فوراً ہی بیٹھ گئی۔

"لگتا ہے آج کل تم کچھ زیادہ ہی مصروف ہو۔ کسی پارٹی میں بھی نظر نہیں آتے۔ جانتے ہو سارے فرینڈز تمھارا پوچھ رہے تھے۔ کہاں ہوتے ہو آج کل۔" وہ اس کے سامنے رکھی چیئر پر بیٹھ گئی۔

"یہیں ہوتا ہوں بس کام کا بردن کچھ زیادہ ہے۔" اذعان نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔

"کام تو تم پہلے بھی کرتے تھے۔" وہ اسے یوں گھور رہی تھی جیسے اس کی چوری پکڑنا چاہتی ہو۔

"کیونکہ لڑکیوں کے پیچھے بھاگنے کا مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔" اس نے جتاتے ہوئے انداز میں کہا۔

"میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا۔" وینا نے خجل ہوکر کہا۔

"تمھارا لہجہ تو ایسا ہی تھا۔" اس نے بغور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ اعازن حیدر تھا اور مقابل کو زیر کردینا اس کی فطرت۔

"خیر چھوڑو یہ بتاؤ کیا ہو رہا ہے آج کل؟" اس نے فوراً ہی موضوع بدل دیا۔

"انٹیریئر ڈیزائنرز سے بات چیت چل رہی ہے لیکن ابھی تک کوئی مجھے مطمئن نہیں کرسکا۔ سب بس روٹین ورک کرنا چاہتے ہیں۔" اس نے بے دلی سے کہا۔

"اور تم کچھ ڈفرنٹ۔" وینا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آف کورس۔" اس نے فائل بند کر کے کرسی کی بیک سے پشت ٹکالی۔

"پھر تو تمھیں ڈریمز انٹیریرز سے بات کرنی چاہیے۔ ان کا کام سب سے ڈفرنٹ ہوتا ہے۔"

"تم نے دیکھا ہے ان کا کام؟"

"ہاں..... ان فیکٹ ہمارا سی سائیڈ والا بنگلہ انھوں نے ہی ڈیکوریٹ کیا تھا۔ کیا نام تھا اس لڑکی کا..... ہاں کشف۔" اس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں تمھارے بنگلے کا انٹیریر تو مجھے بھی پسند آیا تھا۔" اذعان نے فوراً کہا۔

"حالانکہ تمھیں کوئی بھی چیز مشکل سے پسند آئی ہے..... بٹ آئی ایم شیور وہ لڑکی کشف تمھارے معیار پر ضرور پورا اترے گی شی از بریلینٹ۔"

"تم کچھ زیادہ ہی تعریف نہیں کر رہی ہو وہ بھی ایک لڑکی کی۔" اذعان نے مسکراتے ہوئے اس کی بیلیس ہونے والی عادت پر چوٹ کی۔

"میں اس کی نہیں اس کے کام کی تعریف کر رہی ہوں۔ ورنہ اس عام سی لڑکی میں ہے ہی کیا سراہنے کے لیے۔" اس نے نخوت سے گردن اکڑا کر کہا تو وہ ہنس پڑا۔

"تم ہنسے کیوں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں..... چلو میں فارغ ہوں اب۔" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو وہ بھی کندھے اچکا کر کھڑی ہوگئی۔

اس نے آفس سے آکر کپڑے چینج کیے اور سمعیہ کی طرف آگئی۔

"اوہو ٹی وی دیکھا جا رہا ہے۔" کشف نے لاؤنج میں داخل ہوکر کہا۔

"فرصت مل گئی تمھیں؟" اس نے خفگی سے کہا۔

"ارے یار خفا کیوں ہوتی ہو؟" اس نے سمعیہ کے ہاتھ سے ریموٹ لے کر ٹی وی آف کردیا اور اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"خفا نہ ہوں تو اور کیا کروں۔ اتنے دنوں سے تم سے کہہ رہی ہوں شاپنگ پر چلنے کے لیے۔ نکاح میں صرف پندرہ دن رہ گئے ہیں۔ لیکن کسی کو فکر ہی نہیں ہے۔ امی سے تو مجھے ویسے ہی کوئی امید نہیں ہے انھوں نے تو لسٹ بنوا کر ہی سمجھو بڑا احسان کیا ہے۔ سعدیہ آپی کے آنے میں بھی ابھی تین چار دن ہیں اور تمھیں اپنے آفس سے فرصت نہیں ہے۔ اب بتاؤ میں اکیلے یہ سب کیسے کروں گی۔" سمعیہ نے اتنے دنوں کا غصہ ایک ساتھ ہی نکال دیا تھا۔

"اکیلی کہاں میں ہوں نہ، آج ہی اپنا پراجیکٹ ختم کر کے آئی ہوں اور فی الحال ہماری کمپنی کو کوئی نیا پراجیکٹ بھی نہیں ملا اس لیے میں نے مسز آفریدی سے تین دن کی چھٹی لے لی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"رئیلی..... تم سچ کہہ رہی ہو؟" اس نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔

"سو فیصد سچ..... کل ناشتے کے بعد ہی نکل پڑیں گے۔ فہد بھائی بھی داد دیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ ایسی زبردست شاپنگ کریں گے ہم اپنی ہونے والی بھابی کے لیے۔"

"کشف بیٹا۔" صاعقہ بیگم نے اندر کمرے سے آواز لگائی۔

"آئی خالہ جانی۔" وہ فوراً ہی اٹھ کر آگئی۔

"واؤ خالہ جانی یہ کتنا خوبصورت ہے۔ بھابی کے لیے بنا رہی ہیں نہ آپ۔" اس نے ریڈ جارجٹ کے سوٹ پر نفیس سی کڑھائی دیکھ کر کہا۔

"آہ ہا..... کیا سوچا تھا کیا ہوگیا اس لڑکے نے تو میرے سارے ارمان مٹی میں ملا دیے۔" انھوں نے تاسف سے کشف کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر دوبارہ ہاتھ میں پکڑے فریم کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

"اوہو خالہ جانی ایسے نہیں سوچتے اور پھر اتنی اچھی تو ہیں عائشہ بھابی۔" وہ ان کا اشارہ سمجھ گئی تھی اس لیے بہلانے لگی۔

"اچھی تو بیٹا....." انھوں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"خالہ جانی آپ نے مجھے بلوایا کیوں تھا؟" اس نے جلدی سے بات کا رخ بدل دیا۔

"ہاں..... وہ..... صفیہ کو ذرا میرے پاس بھیجنا۔"

"میں ابھی بلا لاتی ہوں۔" وہ تیزی سے کہہ کر باہر آگئی۔

اسے اتنی افراتفری میں ناشتہ کرتے دیکھ کر جمال صاحب بولے بغیر نہ رہ سکے۔

"بیٹا آرام سے اتنی جلدی بھی کیا ہے۔"

"پاپا آپ نہیں جانتے مسز آفریدی کو۔ اگر میں لیٹ ہوگئی تو وہ میرا کورٹ مارشل کروا دیں گی۔" اس نے جلدی جلدی چائے کے سپ لیتے ہوئے کہا۔

صفیہ بیگم نے بھی کچن سے نکلتے ہوئے اس کی باتیں سن لی تھیں اس لیے بول پڑیں۔

"لیکن تم تو آج سمعیہ کے ساتھ جانے والی تھیں پھر یہ مسز آفریدی....."

"امی اس وقت میں بہت جلدی میں ہوں۔ ابھی مجھے سمعیہ کو بھی سمجھانا ہے اس لیے آپ سے میں آفس سے آکر بات کروں گی۔" اس نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا اور کھڑی ہوگئی۔

"کتنی بار کہا ہے کہ خالی چائے مت پیا کرو۔ لیکن اس لڑکی کی سمجھ میں تو میری کوئی بات نہیں آتی۔" انھوں نے اسے خالی چائے پی کر اٹھتے دیکھ کر کہا۔

"اوکے بائے ایوری باڈی۔" اس نے

بیگ اٹھایا اور ان کی بات ان سنی کر کے چل پڑی۔

''دیکھا اسے مجال ہے جو کوئی بات مان لے۔ سب آپ کا قصور ہے۔ اس کی ہر ضد مان کر سر چڑھا لیا ہے اسے۔'' وہ خفگی سے کہہ کر بیٹھ گئیں۔

''اچھا..... حالانکہ میرا خیال ہے وہ آپ کی زیادہ لاڈلی ہے۔'' جمال صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں میں آپ دونوں کی لاڈلی ہوں۔ اینڈ آئی لو بوتھ آف یو۔'' اس نے لاؤنج کے دروازے پر رک کر مسکراتے ہوئے کہا اور پھر اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا اور وہ دونوں ہی ہنس پڑے۔

وہ بھاگتی ہوئی خالہ کے پورشن کی طرف آئی۔ سمعیہ کو اپنے آفس جانے کا بتایا تو وہ چیخ پڑی۔

''کیا کہا.....؟''

''اوہو آہستہ تو بولو۔'' کشف نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔

''آہستہ بولو تم نے کہا نہیں تھا کہ تم نے تین دن کی چھٹی لے لی ہے اور آج تو ہم نے شاپنگ پر جانا تھا۔'' اس نے نروٹھے پن سے کہا۔

''آئی نو میں نے کہا تھا لیکن ابھی ابھی مسز آفریدی نے فون کر کے فوراً آفس پہنچنے کو کہا ہے۔ پلیز ٹرائی ٹو انڈرسٹینڈ مائی پرابلم۔'' اس نے لجاجت سے کہتے ہوئے اسے دیکھا۔

''بس ہر بار میں ہی تمھاری پرابلمز کو سمجھوں۔ تم نے کبھی نہ سمجھنا۔'' اس نے خفگی سے کہہ کر اس کی طرف سے رخ پھیر لیا۔

''پلیز لاسٹ ٹائم۔'' کشف نے اس کے سامنے آ کر ہاتھ جوڑ دیئے۔

''اوکے بٹ لاسٹ ٹائم۔'' اس نے وارننگ کے سے انداز میں انگلی اٹھائی۔

''تھنک یو یو آر سو سویٹ۔'' کشف نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور پھر بھاگ کر گاڑی میں جا بیٹھی۔ جلدی جلدی کرتے بھی اسے دس بجے ہی گئے تھے۔

''اوہ نو لگتا ہے آج سارا شہر ہی جلدی میں ہے۔'' اس نے زیادہ ٹریفک کی وجہ سے رک رک کر گاڑی چلاتے ہوئے زچ ہو کر اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا تھا۔

پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر کے گھڑی دیکھی تو ساڑھے دس بجا رہی تھی۔ تقریباً بھاگتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر وہ سیکنڈ فلور پر پہنچی تھی۔ آفس میں داخل ہوتے ہی پہلا ٹکراؤ جمی سے ہوا تھا۔

''پورے آدھا گھنٹہ لیٹ ہو۔''

''جانتی ہوں لیکن اس میں زیادہ قصور کراچی شہر کی ٹریفک کا ہے۔'' اس نے مسز آفریدی کے کیبن کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''جواز اچھا ہے لیکن میڈم کو تو تم جانتی ہی ہو۔'' جمی نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے ایک سرد آہ بھر کر مڑ کر اسے دیکھا اور پھر دروازے پر دستک دے ڈالی۔

''یس کم ان۔'' مسز آفریدی کی پاٹ دار آواز گونجی تھی اور وہ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوگئی۔

''السلام علیکم۔'' اس کے سلام کا جواب انھوں نے محض سر ہلا کر دیا تھا جبکہ سامنے بیٹھے شخص کی اس کی طرف پشت تھی۔

''کشف یہ ہیں اذعان حیدر۔ جن کے بنگلے کا انٹیریر آپ کو کرنا ہے اور مسٹر اذعان یہ کشف ہیں ہماری کمپنی کی بیسٹ انٹیریر ڈیزائنر۔'' مسز آفریدی نے تعارف کروایا تو دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دونوں ہی کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لیے شناسائی تھی۔

''مسٹر اذعان آپ کشف کے ساتھ جا کر اپنا نقطہ نظر ڈسکس کر لیں۔'' انھوں نے کہا تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی اس کے ساتھ کمرے سے نکلنے ہی والی تھی کہ انھوں نے پکار لیا۔

''کشف ایک منٹ۔''

''یہ ساتھ والا کیبن میرا ہے آپ چلیں میں آتی ہوں۔'' اس نے کہا تو وہ سر ہلا کر چلا گیا۔

''یس میم۔'' وہ واپس ان کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔

''کشف آج آپ نے بہت ہی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا ہے۔'' وہ خوب دل کھول کر تعریف بھی کرتی تھیں لیکن مقابل کی ذرا سی لاپرواہی بھی برداشت نہیں کرتی تھیں۔

''آئی ایم سوری میم۔ اصل میں.....'' وہ واقعی شرمندہ نظر آ رہی تھی اس لیے انھوں نے فوراً ہی اس کی بات کاٹ دی۔

''اٹس اوکے آئندہ خیال رکھنا اور ہاں مسٹر اذعان جانے مانے انڈسٹریلسٹ ہیں..... سو میک شور کہ ان کا کام ان کی مرضی کے مطابق اور بہترین ہو۔''

''آئی ول ٹرائی مائی بیسٹ۔'' اس نے فرمانبرداری سے کہا۔

''یو شڈ ناؤ موو مے لیو۔'' انھوں نے کہا تو وہ کیبن سے باہر آ گئی۔

''لگتا ہے میری دعائیں کچھ خاص کام نہیں آئیں۔'' جمی نے اس کا اترا چہرہ دیکھ کر شرارت سے کہا۔

''نہیں بچت ہوگئی۔ تم ایسا کرو ذرا دو کافی میرے کیبن میں جلدی سے بھجواؤ۔'' وہ جلدی سے اسے کہہ کر اپنے کیبن میں آ گئی۔

''سوری آپ کو تھوڑا ویٹ کرنا پڑا۔'' اس نے اندر داخل ہو کر کہا۔

''اٹس اوکے ویسے آپ کو نہیں لگتا کہ دنیا بہت چھوٹی ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے ہماری یہ دوسری ملاقات کوئی اتنی عجیب بات تو نہیں۔'' وہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی اس لیے مسکرا کر کہا اور اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گئی۔

''دوسری نہیں تیسری۔''

''لیکن اس ایکسیڈنٹ والے واقعے کے بعد تو ہم آج ہی ملے ہیں پھر.....'' اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

''ایکسیڈنٹ سے پہلے بھی ہم مل چکے ہیں..... آرٹ گیلری میں۔'' اس نے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

''ہو سکتا ہے لیکن مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔'' فوری طور پر تو اسے کچھ یاد نہیں آیا تھا۔

''ویسے بھول جانا آپ کی عادت ہے یا مجبوری۔'' اس کی طنزیہ مسکراہٹ کشف کی سمجھ سے باہر تھی۔ اس لیے نظرانداز کر گئی۔

''میرا خیال ہے اب کچھ کام کی بات کر لی جائے۔'' اس نے پروفیشنل انداز میں کہا اور نوٹ بک کھول کر پن پکڑ لیا۔

''سنا ہے خوابوں کو پڑھ لینا آپ کی اضافی خوبی ہے اور آپ کی کمپنی کا سلوگن بھی تو یہی ہے..... یور ڈریم..... آور ریئلائٹی۔'' اس نے بہت گہری نظروں سے کشف کو دیکھا تھا جیسے اس کے اندر تک اتر جانا چاہتا ہو۔

''سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن کہیے آپ کا خواب کیا ہے۔'' اس نے بغیر جھجکے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''سم تھنگ ویری بیوٹی فل اینڈ یونیک۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ خواب تو ہر کسی کا ہوتا ہے۔'' وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

''ہر کسی میں اور اذعان حیدر میں بہت فرق ہے۔'' اس کا یہ مغرورانہ انداز کشف کو ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

''اور یہ فرق کیا ہے؟'' اس نے پن ٹیبل پر رکھا اور دونوں ہاتھ ٹیبل پر رکھ لیے۔
''یہ فرق خود اذعان حیدر ہے۔'' اس نے گردن اکڑا کر کہا۔
''مسٹر اذعان آپ نے اپنے گھر کے انٹیریر کے لیے ہماری کمپنی کو ہی کیوں پریفرنس دی؟'' وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔
''پریفرنس تو نہیں کہہ سکتے کیونکہ میں نے دو تین اور بھی انٹیریر ڈیزائنرز سے بات کی تھی لیکن وہ میرے ساتھ کام کرنے میں کمفرٹیبل فیل نہیں کر رہے تھے..... شاید میں بہت مشکل پسند واقع ہوا ہوں اس لیے۔''
''وہ تو آپ لگ ہی رہے ہیں۔'' اس نے کہا نہیں صرف سوچ کر رہ گئی۔
''میں اس مکان کو گھر بنانا چاہتا ہوں۔ ایک ایسا گھر جہاں بارش کا رنگ نقلی رنگوں میں کھو نہ جائے۔ جہاں سورج کی کرنیں سواگت کریں اور چاندنی الوداع کہے۔ جہاں رنگ باتیں کریں اور زندگی مسکرائے۔ ایک ایسا گھر جہاں گزارا ہوا ایک پل پوری زندگی پر حاوی ہو۔'' وہ ایک ٹرانس کی کیفیت میں بول رہا تھا۔ جب پیون اندر داخل ہوا۔
''میڈیم جی کافی۔'' پیون نے کہا تو وہ دونوں ہی جیسے کسی خواب سے چونکے تھے۔ ان دونوں کی کیفیت سے قطع نظر وہ خاموشی سے ان کے سامنے کافی کے کپ رکھے۔
''جمی سے کہنا ہم تھوڑی دیر میں نکل رہے ہیں وہ تیار رہے۔'' کشف نے کہا تو وہ سر ہلا کر چلا گیا۔
''ویسے آپ کو دیکھ کر لگتا نہیں ہے کہ آپ جیسا بزنس مین اور اتنی آرٹسٹک سوچ۔'' پیون کے جانے کے بعد کشف نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''بزنس میرا پروفیشن ہے اور پینٹنگ کرنا ہابی۔'' اس نے کافی کا سپ لے کر کہا۔
''پھر تو آپ کے ساتھ کام کرنے میں بہت مزہ آئے گا۔''
''آئی ہوپ سو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

کمر سیدھی کرنے کے خیال سے وہ ابھی لیٹی ہی تھی کہ سمعیہ آ گئی۔
''یہ آج تم اتنی دیر سے کیوں آئی ہو۔ پتا ہے کتنی بار تمھارا پوچھ چکی ہوں اور تم سے اتنا نہیں ہوا کہ خود ہی آ جاتیں۔'' اس نے خفگی سے کہا۔
''ایک تو تم اتنے سارے سوال ایک ساتھ پوچھ لیتی ہو کہ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ کس کا جواب پہلے دوں۔'' اس نے اٹھ کر بیڈ سے ٹیک لگائی اور پاؤں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔
''یہ بتاؤ اتنی دیر کیوں ہوئی؟'' وہ بھی اس کے پاس بیڈ پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔
''کیا بتاؤں بڑا ہی ٹیڑھا بندہ ہے۔ کوئی بھی آئیڈیا اسے پسند ہی نہیں آتا۔''
''ضرور کوئی سنکی سا بڈھا ہوگا۔'' سمعیہ نے قیاس آرائی کی۔
''جی نہیں بیچولر ہے۔'' اس نے فوراً ہی اس کی غلط فہمی دور کی۔
''ریئلی دیکھنے میں کیسا ہے؟'' سمعیہ نے متجسس ہو کر پوچھا۔
''پرسنیلٹی تو اچھی ہے ماننا پڑے گا لیکن پراؤڈ بہت ہے..... ارے ہاں تم بھی تو مل چکی ہو اس سے۔'' کشف کو ایکدم ہی یاد آیا تھا۔
''کون..... کون؟'' وہ فوراً ایکسائیٹڈ ہو گئی۔
''وہی جس سے اس دن ہمارا ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔'' اس نے یاد دلایا تو وہ چیخ پڑی۔
''کیا..... یہ وہی ہینڈسم ہے؟''

"آہستہ بولو..... اور اس کا نام ہینڈسم نہیں اذعان حیدر ہے۔" اس نے چڑ کر کہا۔

"کشف گل میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔"

"پاگل ہوئی ہو تم وہاں جا کر کیا کرو گی۔" اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

"اسے دیکھوں گی اور کیا۔"

"کیا.....؟" اس نے گھور کر دیکھا تھا اور سمعیہ نے فوراً بات بدل دی۔

"میرا مطلب ہے اس کا گھر دیکھوں گی۔"

"تو کبھی نہیں سدھرے گی۔" کشف نے اسے تکیہ کھینچ کر مارا لیکن اس نے جلدی سے پکڑ لیا۔

وہ ہال میں کھڑی تھی جب جمی بڑبڑاتے ہوئے اس کے پاس آیا۔

"کیا ہوا تمھارا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟"

"مجھے لگتا ہے تنقید کرنا اس بندے کا پسندیدہ ترین مشغلہ ہے۔ جو ہر چیز کو عام سی ہے کہہ کر ریجکٹ کر دیتا ہے۔"

"لیکن جمی ہمیں پیسے بھی تو پرفیکشن کے ہی ملتے ہیں نہ اور پھر....." اس سے پہلے کہ کشف اسے سمجھاتی اس نے فوراً اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"بس..... بس اب تم بھی مت شروع ہو جاؤ۔ پہلے ہی "محنت میں عظمت" پر اچھا خاصا لیکچر سن کے آ رہا ہوں ان موصوف سے۔"

"رئیلی..... ویسے ہیں کدھر موصوف؟"

"اور کہاں ہونا ہے۔ کہیں کھڑا خامیاں ڈھونڈ رہا ہوگا۔" اس نے جل کر کہا۔

"اچھا خیر چھوڑو اسے چار بج رہے ہیں میں چلتی ہوں۔ سمعیہ میرا ویٹ کر رہی ہوگی۔" اس نے مسکرا کر کہا اور جانے کے لیے قدم بڑھا دیئے لیکن پھر کچھ سوچ کر رک کر واپس مڑی۔

"تمھیں یاد ہے نہ کل شام کو تمھیں آنا ہے۔"

"آف کورس یہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے۔ فہد کے نکاح میں بھنگڑا میں نے ہی تو ڈالنا ہے۔"

"اوکے بائے۔" وہ ہنستے ہوئے جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ سامنے سے اذعان کو آتا دیکھ کر رک گئی۔

"مس کشف آپ آج اتنی جلدی جا رہی ہیں۔" اس نے رسٹ واچ پر ایک نظر ڈال کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی..... آج مجھے ایک پرسنل کام سے کہیں جانا ہے۔" کشف نے ازراہ مروت مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کیا پرسنل کام ورکنگ آورز میں کرنے کی عادی ہیں۔" اذعان نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس پر چوٹ کی تھی۔

"ڈونٹ وری آپ کے کام کا ہرج نہیں ہوگا۔ جمی یہیں موجود ہے۔" کشف نے اس کے طنزیہ لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تو مجھے نظر آ رہی رہا ہے۔ لیکن بہر حال وہ آپ کا اسسٹنٹ ہے۔ آپ کی جگہ تو نہیں لے سکتا نہ۔" اذعان کا لہجہ ایسا تھا جیسے اس کے وقت کے ساتھ ساتھ اسے بھی خریدا ہو۔

"وہ میری جگہ لے سکتا ہے اسی لیے میرا اسسٹنٹ ہے۔" اس نے دوبدو جواب دیا۔ اب تو اس کا ضبط بھی جواب دے گیا تھا۔

"اگر آپ کہہ رہی ہیں تو میں مان لیتا ہوں۔ لیکن آج میں فری ہوں تو کیوں نہ آج چل کر فرنیچر دیکھ آئیں۔" اذعان نے اس کے غصے سے سرخ پڑتے چہرے کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن اتنی جلدی کیا ہے۔ ہم پرسوں بھی تو جا سکتے ہیں۔" اس نے زچ ہو کر کہا۔

"سوری میرے پاس صرف آج کا ہی دن ہے۔ کل ویسے ہی سنڈے ہے آپ لوگوں کا آف ہوتا ہے اور پرسوں میں ایک ہفتے کے لیے جرمنی جا رہا ہوں۔ اب سوچ لیں آپ۔"

"اوکے چلتی ہوں میں۔" اس نے بے دلی سے کہا۔

"میں آپ کا گاڑی میں ویٹ کر رہا ہوں۔" وہ کہہ کر فوراً ہی چلا گیا۔

"یہ شخص سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔" جمی بڑی دیر سے خود پر ضبط کیے کھڑا تھا اس لیے اس کے جاتے ہی بول پڑا تھا۔

"چلتی ہوں ورنہ وقت کی قدر و قیمت پر لیکچر جھاڑنا شروع کر دے گا۔" کشف نے جل کر کہا۔

"ویسے کشف اگر زیادہ دن ہم اس کے ساتھ رہے تو جل بھن کر کباب بن جائیں گے۔"

"وہ بھی ایسا کباب جسے کھایا بھی نہیں جا سکتا۔" اس نے ٹکرا لگایا کہا تو دونوں ہی ہنس پڑے۔

وہ گاڑی لاک کر کے مڑی ہی تھی کہ سمعیہ اور فہد کو آتے دیکھ کر رک گئی۔ وہ شاید گاڑی کا ہارن سن کر ہی باہر آئے تھے۔

"ارے تم اتنی جلدی آ گئیں۔ فنکشن تو کل شام کو ہے۔ ہمارے پاس تو بہت وقت ہے۔" سمعیہ نے آ کر جتاتے ہوئے انداز میں کہا۔

"اچھا..... اچھا زیادہ طعنے مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کون سا اپنی خوشی سے دیر سے آئی ہوں۔" کشف نے جلے بھنے انداز میں کہا کہ اذعان کے ساتھ پچھلے تین گھنٹوں سے دماغ کھپایا تھا اس لیے اس کا پارہ ویسے ہی چڑھا ہوا تھا۔

"ہاں..... ہاں روک لیا ہوگا تمھیں تمھاری میڈم آفریدی یا ان کے کسی چہیتے نے اور تمھارے منہ میں تو ویسے ہی زبان نہیں ہے۔" سمعیہ کو بھی آج زیادہ ہی غصہ چڑھا ہوا تھا۔

"ارے یہ کیا تم دونوں بچوں کی طرح لڑنے کھڑی ہو گئی ہو اور سمعیہ تم کم از کم اس کی مجبوری تو سن لو۔" لڑائی کو طول پکڑتے دیکھ کر فہد نے مداخلت ضروری سمجھی تھی۔

"فہد بھائی پلیز آج آپ اس کی سائیڈ نہیں لیں گے ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔" سمعیہ نے فوراً ہی اسے ٹوک دیا۔ لیکن کشف کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ بول پڑا۔

"ٹھیک ہے میں اس کی سائیڈ نہیں لوں گا لیکن تم اسے اپنی بات کہنے کا موقع تو دو۔"

"کیا بات بھائی اس کے لیے کام ہم سب سے زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔ یہ ہمیں چھوڑ سکتی ہے لیکن اپنے کام کو نہیں۔" سمعیہ آج کسی طور اسے بخشنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"یہ دیکھو کان پکڑتی ہوں۔ سچ آئندہ سے ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ پہلے تم اس کے بعد کام۔" کشف نے دونوں کان پکڑ کر لجاجت سے کہا۔

"چلو اس بار میرے کہنے پر معاف کر دو۔" فہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن....." اس کی معصوم سی شکل دیکھ کر سمعیہ کہتے کہتے رک گئی۔

"ٹھیک ہے۔" آخر اس نے مسکرا کر ہتھیار ڈال ہی دیئے۔

"تھینک یو۔" کشف فوراً آگے بڑھی۔

"ہمیشہ کی طرح سو سویٹ نہیں کہو گی؟" اس نے بھی بانہیں پھیلا دیں تو وہ جلدی سے گلے لگ گئی۔

احسان علی ہاتھ میں موبائل لیے باہر آئے تو ان تینوں کو پورچ میں کھڑے دیکھ کر کہنے لگے۔

"ارے بھئی بچوں یہ تم تینوں یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟"

''ابو جی بچے ذرا لڑائی لڑائی کھیل رہے تھے۔'' فہد نے شرارت سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

''یہ کون سا وقت ہے کھیل کا۔ پہلے ہی اتنی دیر ہو چکی ہے واپسی میں تو تم لوگ بارہ بجا دو گے۔ چلو شاباش نکلو فوراً۔'' انھوں نے فہد کی بات پر دھیان دیئے بغیر کہا اور موبائل پر نمبر پریس کرنے لگے۔

''ابو جی..... جی بس نکل ہی رہے ہیں۔'' فہد نے سعادت مندی سے کہا تو وہ موبائل کان سے لگائے انھیں اشارے سے جلدی جانے کا کہہ کر فون پر بات کرنے لگے۔

''میں گاڑی نکالتا ہوں تم دونوں فوراً پہنچو۔'' فہد کہہ کر چلا گیا تو سمعیہ اپنا ہینڈ بیگ لینے اور کشف اپنی چیزیں رکھنے اندر دوڑ گئی۔

لائٹ براؤن شیڈ کی لپ اسٹک لگانے کے بعد اس نے آئینے میں دیکھتے ہوئے خود پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی۔ سکن اور گولڈن کمبی نیشن کا نفیس سی کڑھائی والا ہی سوٹ اس پر خاصا جچ رہا تھا۔

''ناٹ بیڈ۔'' اس نے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس کیجیے محترمہ ورنہ آئینہ ٹوٹ جائے گا۔'' سمعیہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''کیوں تمھارا ٹوٹ گیا کیا؟'' کشف مسکرا کر پلٹی۔

''کشف، سمعیہ جلدی آؤ بھئی۔'' صفیہ بیگم نے کمرے لاک کرتے ہوئے آواز لگائی تو وہ دونوں ہی کمرے سے نکل آئیں۔

''امی سب لوگ آ گئے ہیں کیا؟'' کشف نے لاؤنج خالی دیکھ کر پوچھا۔

''صرف آ ہی نہیں گئے ہیں بلکہ گاڑیوں میں بھی بیٹھ چکے ہیں۔ تم دونوں نکلو میں یہ مین ڈور لاک کر کے آتی ہوں۔ اور ہاں وہ ایئر رنگز یاد سے لے لینا۔'' انھوں نے کہا تو کشف کو یاد آیا۔

''وہ تو رات میں نے اپنے ہینڈ بیگ میں رکھے تھے اور ہینڈ بیگ تو میں نے تمھیں پکڑایا تھا۔'' کشف نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے..... نہیں تو۔ وہ تو تمھارے ہی پاس تھا۔'' سمعیہ نے فوراً کہا۔

''یاد کرو جب ہم فہد بھائی کے لیے سوٹ پسند کر رہے تھے تو میں نے تمھیں پکڑایا تھا۔'' کشف نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں لیکن میں نے وہاں کاؤنٹر پر رکھا تھا اور پھر.....''

''اوہ نو.....'' دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا تھا۔

''کیا ہوا یہ تم دونوں کے منہ کیوں لٹک گئے ہیں۔'' صفیہ بیگم نے ان کی پریشان صورتیں دیکھ کر کہا۔

''وہ امی دراصل.....'' کشف نے ڈرتے ڈرتے آخر بتا ہی دیا۔

''اف کیا کروں میں اس لڑکی کا۔ ایک کام بھی ڈھنگ سے نہیں کر سکتی۔'' وہ سر پر ہاتھ مار کر رہ گئیں۔

''امی آپ فکر نہ کریں۔ ہینڈ بیگ مل جائے گا۔ وہ ضرور اسی دکان والے کے پاس ہوگا۔'' اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''آج کل اتنا شریف کوئی نہیں ہوتا کہ ہاتھ آئی چیز لوٹا دے۔'' انھیں بیگ واپس مل جانے کی ذرہ برابر امید نہیں تھی۔

''خالہ جانی اتنی بڑی شاپ ہے وہ۔ ایسا تو نہیں کر سکتے نہ وہ لوگ۔'' سمعیہ نے انھیں حوصلہ دیا حالانکہ اسے خود بھی اتنا یقین نہیں تھا۔

''آپ لوگ نکلیں میں سیدھے وہیں پہنچ جاؤں گی۔'' کشف انھیں تسلی دے کر گاڑی کی چابی لے کر باہر آ گئی۔ گاڑی اس شاپنگ پلازہ کے پارکنگ زون میں کھڑی کر کے وہ بڑی تیزی سے گلاس ڈور دھکیل کر دکان کے اندر داخل ہوئی تھی تب ہی سامنے سے آتے شخص سے ٹکرا گئی۔ ہینڈل پر ہاتھ ہونے کی وجہ سے وہ لڑکھڑا کر بھی سنبھل گئی تھی جبکہ اس شخص کے ہاتھ میں موجود دونوں شاپنگ بیگز گر چکے تھے۔

''اوہ آئی ایم سو سوری میں ذرا جلدی میں تھی تو.....'' وہ فوراً ہی اس کی مدد کو آگے بڑھی تھی لیکن اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی غیر ارادی طور پر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''مس کشف آپ ہمیشہ جلدی میں کیوں ہوتی ہیں؟'' اس نے بیگز اٹھا کر اسے مزید شرمندہ کرنا چاہا۔

''آئی ایم ایکسٹریملی سوری مسٹر اذعان۔'' اس نے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔

''اٹس او کے۔ دراصل اس میں آپ کی بھی غلطی نہیں ہے۔ کچھ عادتیں کبھی نہیں بدل سکتیں۔'' وہ بڑے نارمل سے لہجے میں کہہ کر چلا گیا۔

''کمبل میں لپیٹ کر مارنا اسے ہی کہتے ہوں گے۔ کیا بات ہے جناب کی انسلٹ بھی کر دی اور پتا بھی نہیں چلا۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اس پر غصہ کرنے کی بجائے وہ اس کی ذہانت کی داد دے رہی تھی۔

''ایکسکیوز می۔'' اس نے آہستہ سے کاؤنٹر بجایا۔

''یس میم۔'' سیلز مین نے آ کر کہا۔

''دیکھیے کل میں یہاں اپنا ہینڈ بیگ بھول گئی تھی۔''

''ہمیں تو کوئی ہینڈ بیگ نہیں ملا۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے آپ پلیز پتا کیجیے اس ہینڈ بیگ میں گولڈ کے ایئر رنگز بھی ہیں۔'' اس کے انکار پر وہ ایکدم گھبرا گئی تھی۔ اور شاید اس کی پریشان صورت دیکھ کر ہی اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی ہے تب ہی کہنے لگا۔

''آپ ایک منٹ ٹھہریں میں ابھی آتا ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آیا تو ایک اور شخص اس کے ساتھ تھا جو ڈریسنگ سے ہی شاپ کا اونر لگ رہا تھا۔

''ہوں تو وہ ہینڈ بیگ آپ کا ہے؟'' اس نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔

''جی وہ.....''

''لیکن ہم کیسے مان لیں کہ وہ آپ کا ہے۔ کوئی نشانی؟''

''براؤن لیڈر کا بیگ ہے۔ اس میں کچھ پیپرز اور ریڈ کیس میں گولڈ کے ایئر رنگز ہیں جن میں ریڈ سٹون لگے ہوئے ہیں۔'' اس نے تفصیل سے بتایا۔

''بیگ لے آؤ۔'' اس نے کہا تو اس کے ساتھ کھڑے کہا۔

''معاف کیجیے گا لیکن صحیح بندے تک چیز پہنچانے کے لیے ہمیں تھوڑا سخت لہجہ اپنانا پڑتا ہے۔'' اس نے معذرتی انداز میں کہا۔

''اٹس اور سے سر میں بھی آپ کی جگہ ہوتی تو شاید ایسا ہی رویہ اپناتی۔''

اسی وقت وہ شخص ہینڈ بیگ لے آیا۔

''لیجیے آپ کی امانت۔'' اس نے بیگ بڑھایا۔

''تھینکس۔'' اس نے بیگ پکڑتے ہوئے کہا۔

''ایک بار آپ چیک کر لیجیے تاکہ مجھے تسلی ہو جائے۔'' اس نے کہا تو کشف نے بیگ کی زپ کھول کر چیزیں نکال کر دیکھ لیں۔

''ونس اگین تھینک یو ویری میچ۔'' وہ ان کا شکریہ ادا کرتی باہر آ گئی۔

شاپ سے باہر آ کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا لیکن پارکنگ زون میں پہنچتے ہی اس کا سارا سکون رخصت ہو گیا۔ وہ بالکل ہکا بکا بت بنی کھڑی تھی سبھی گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اچانک ہی اذعان کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اسے یوں گم صم کھڑا دیکھ کر وہ اس کے پاس چلا آیا۔

''مس کشف آپ یہ زمین کو کیوں گھور رہی ہیں؟'' اس کی غائب دماغی کے پیش نظر اذعان نے اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی تو وہ ایکدم چونک اٹھی۔

''میری گاڑی..... یہاں میری گاڑی کھڑی تھی..... میری گاڑی۔'' اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔

''کشف آپ گاڑی ڈھونڈ رہی ہیں یا سوئی۔'' طنز کرنا شاید اس کی عادت تھی۔

''میں..... یہاں..... گاڑی.....'' وہ ایکدم بوکھلا گئی۔

''او کے ریلیکس۔'' اس نے اسے پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

''اب مجھے بتائیں کیا ہوا ہے۔''

''میں یہاں گاڑی کھڑی کر کے گئی تھی لیکن اب وہ یہاں نہیں ہے۔'' اس نے سامنے اشارہ کیا۔

''آپ نے گاڑی لاک کی تھی؟''

''گاڑی تو میں نے لاک کی تھی اور چابی اپنے ہینڈ بیگ.....'' وہ کہتے کہتے ایکدم چپ ہو گئی۔

''کیا ہوا؟''

''بیگ تو میرے پاس تھا ہی نہیں شاید جلدی میں چابی میں نے گاڑی میں ہی چھوڑ دی تھی۔''

''پھر تو شک کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ آپ کی گاڑی سو فیصد چوری ہو چکی ہے۔'' اس نے اطمینان سے کہا جیسے کسی اور کی گاڑی چوری ہونے کی اطلاع دے رہا ہو۔

''اب میں کیا کروں؟'' اس نے روہانسی ہو کر کہا۔

''چلیے میرے ساتھ پہلے چل کر رپورٹ لکھوا دیتے ہیں۔'' اس کی پریشانی دیکھ کر وہ خود کو اس کی مدد کرنے سے باز نہیں رکھ سکا تھا۔ حالات ہی ایسے تھے کہ کشف کو اس کی اتنی مدد بھی غنیمت ہی لگی تھی اس لیے اس کے ساتھ چلی آئی۔ ورنہ عام حالات میں وہ اس کا احسان لینا شاید گوارا نہ کرتی۔

''ویسے آپ اتنی جلدی میں جا کہاں رہی تھیں؟'' پولیس اسٹیشن سے واپس آتے ہوئے وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''آج میرے کزن کا نکاح ہے بس اسی افراتفری میں.....''

''کزن کی شادی ہے تو آپ اتنی بوکھلا گئی ہیں۔ اپنی شادی ہو گی تو کیا کریں گی؟'' اذعان نے مسکراتے ہوئے اسے ٹوک دیا اور وہ ایکدم بلش کر گئی۔ حیا سے سرخ پڑتے چہرے کو اس کی نظروں سے چھپانے کے لیے اس نے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

اذعان کے لیے یہ رنگ بالکل نیا تھا۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا وہاں ماڈرنزم کے نام پر بے حجابی عام تھی۔ حیا کے رنگ کسی چہرے کو کیسے ساری دنیا سے نرالا اور حسین بنا دیتے ہیں یہ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ بے اختیار ہی اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اس رنگ کو چھو کر محسوس کر لے۔ اس سے ڈھیر ساری باتیں کرے۔

''کیا کرتے ہیں آپ کے یہ کزن؟'' نہ جانے کون سا جذبہ تھا جو اسے یوں باتیں کرنے پر اکسا رہا تھا۔

''ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں ہوتے ہیں۔'' کشف نے چہرے پر گری لٹ کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''فنکشن تو آپ نے خود ہی آرگنائز کیا ہو گا؟''

''کہہ سکتے ہیں ایکچوئیلی ابھی تو صرف نکاح ہی کر رہے ہیں ایک سال بعد جب رخصتی کریں.....''

''یہ تو آپ لوگ بہت ظلم کر رہے ہیں اس بے چارے کے ساتھ۔'' اس نے کہا تو وہ ہنس پڑی۔

''یہ ظلم ہم نہیں بلکہ وہ خود کر رہے ہیں۔ اصل میں وہ اپنی کمپنی کی طرف سے کسی کورس کے سلسلے میں ایک سال کے لیے جاپان جا رہے ہیں۔ اگلے ہفتے ان کی فلائٹ ہے۔ اب اتنے شارٹ نوٹس پر شادی جیسا بڑا فنکشن تو ارینج نہیں کیا جا سکتا تھا نہ۔''

''اور صرف منگنی کر کے وہ رسک نہیں لینا چاہے ہوں گے۔''

''بالکل یہی بات تھی۔'' اس نے مسکرا کر حامی بھری۔

''لیجیے آپ کی منزل آ گئی۔'' اس نے روشنی میں نہائے ہوئے گھر کے پاس گاڑی روک کر کہا۔

''آپ پلیز اندر آیئے نہ۔'' اس نے خوش دلی سے اس کی طرف دیکھا۔

''پھر بھی ویسے بھی مجھے کہیں پہنچنا تھا اور پہلے ہی میں خاصا لیٹ ہو چکا ہوں۔'' اس نے معذرتی انداز میں کہا۔

اس نے گاڑی سے اتر کر دونوں ہاتھ کھڑکی پر رکھ لیے۔

''تھینکس فار ایوری تھنگ۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کبھی کبھی کچھ پل ہمیں ایسی خوشی دے جاتے ہیں جو ساری زندگی گزار کر بھی ہم حاصل نہیں کر پاتے۔'' اس نے مسکرا کر کشف کی طرف دیکھا تھا لیکن ان آنکھوں میں کچھ ایسا تھا کہ وہ حیران رہ گئی تھی۔ کچھ ایسا جس سے وہ خود بھی انجان تھا۔

اسے کھڑکی کے پاس کھڑا دیکھ کر جمی بھی اس کے پاس چلا آیا۔

''کیا بات ہے یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟''

''کچھ نہیں بس ایسے ہی سوچ رہی تھی کہ اذعان صاحب اب تک واپس نہیں آئے۔ ایک ہفتے کا کہہ کر گئے تھے اب تو دس دن ہونے والے ہیں۔'' اس نے بظاہر عام سے لہجے میں کہا تھا لیکن جمی چونک اٹھا۔

''اوہو تو یہ بات ہے..... ایسے ہی موقع پر کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

اب اداس پھرتے سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں''

جمی نے شوخی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اس نے فوراً ہی نظریں چرائیں۔

''بکو نہیں میں تو بس یونہی.....'' کشف نے گھبرا کر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

''یونہی تو تم نے کبھی اس بے چارے شیرازی کے بارے میں بھی نہیں سوچا۔ بے چارا اب تک آس لگائے بیٹھا ہے حالانکہ اس کا گھر کب کا مکمل ہو چکا پھر بھی کسی نہ کسی بہانے آفس آتا رہتا ہے اور تم.....''

''جمی پلیز میرے سامنے تو تم اس کا نام بھی مت لیا کرو۔ سخت زہر لگتے ہیں مجھے ایسے چھچھورے مرد جو لڑکیوں کے آگے بچھے جا رہے ہوتے ہیں۔'' کشف نے فوراً ہی اسے ٹوک دیا۔

''تو کیا اذعان حیدر کی طرح اکڑو مرد پسند ہیں تمھیں؟'' جمی نے بغور اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے نہیں پتا۔'' اس نے جھنجلا کر کہا۔

''نہیں پتا تو پتا کرو۔''

"کیا پتا کروں؟" اس نے زچ ہو کر پوچھا۔

"یہی کہ تمھیں اذعان حیدر پسند ہیں یا نہیں؟"

"خدا کے لیے' جاؤ اور جا کر اپنا کام کرو۔" اس نے کسی قدر بلند آواز سے کہا۔

اندر آئے ہوئے کشف کے یہ الفاظ اذعان نے بھی سن لیے تھے جو رات ہی لوٹا تھا اور کشف اس بات سے بے خبر تھی۔

"لگتا ہے آپ پر بھی میرا رنگ چڑھتا جا رہا ہے۔" اذعان نے چہرے پر سنجیدگی سے اپنے مخصوص گمبھیر لہجے میں کہا تو اس کے اندر ہل چل سی مچ گئی۔

"کیا واقعی میں اس کے رنگ میں رنگ رہی ہوں؟" وہ سوچے بغیر نہ رہ سکی۔

"کیا ہوا؟" اس کی خاموشی محسوس کر کے اذعان نے اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں..... جمی میں گھر جا رہی ہوں۔" اس نے وہاں سے جانے میں ہی عافیت سمجھی کہ جمی کی مسکراتی نگاہیں اسے پریشان کر رہی تھیں۔

"لیکن تم جاؤ گی کیسے؟ گاڑی تو ہے نہیں تمھارے پاس؟" جمی نے شرارت سے اس کی طرف دیکھا تو وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

"آپ کی گاڑی ملی نہیں ابھی تک؟" اذعان نے کسی قدر حیرانگی سے پوچھا۔

"ہمارے ملک میں کھوئی ہوئی چیزیں اتنی آسانی سے نہیں ملا کرتیں اذعان صاحب۔"

"اگر آپ کچھ دیر رک جائیں تو میں آپ کو ڈراپ کر سکتا ہوں۔" اذعان نے آفر کی تو جمی کھانسنے لگا۔

"نو تھینکس میں چلی جاؤں گی۔" اس نے فوراً انکار کر دیا۔

وہ سونے لیٹی تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جمی کی باتیں ذہن میں گونج رہی تھیں۔ ہزار کوشش کے باوجود جب پلکوں نے بند ہونے سے انکار کر دیا تو وہ اٹھ بیٹھی۔ لیمپ آن کیا اور ناول کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔ لیکن دو لائنیں پڑھ کر ہی اس کا دل اکتا گیا۔ اس نے کتاب بند کی اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"یا اللہ کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں اور یہ سب اس جمی کے بچے کا کیا دھرا ہے۔ میری نیندیں حرام کر کے خود مزے سے سو رہا ہوگا..... ابھی مزہ چکھاتی ہوں اسے۔" اس نے غصے میں موبائل اٹھایا اور جمی کا نمبر ڈائل کر دیا۔ دوسری طرف سے چار بیلیں بجنے کے بعد فون اٹھایا گیا تھا۔

"ہیلو۔" دوسری طرف سے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی اور وہ شروع ہو گئی۔

"یو ایڈیٹ میری نیندیں حرام کر کے خود مزے سے سو رہے ہو۔ اب جب تک مجھے نیند نہیں آتی تمھیں بھی میرے ساتھ جاگنا ہوگا۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کس خوشی میں؟"

"جمی یہ تمھاری آواز....." اسے ایکدم یہ کچھ شک ہوا تھا اس نے موبائل سامنے کر کے جب نمبر دیکھا تو صدمے کی زیادتی سے اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

"ہیلو ..... کشف از دیٹ یو۔" دوسری طرف بھی شاید اس کی آواز پہچان لی گئی تھی۔ ناچار اسے بولنا ہی پڑا۔

"آئی ایم سوری اذعان صاحب دراصل نمبر تو میں نے جمی کا ملایا تھا پتا نہیں کیسے....." شرمندگی کے مارے اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

"یہ نمبر آپ نے غلطی سے ہی ملایا ہوگا مجھے یقین ہے۔ اب آپ فون رکھیں خود بھی سوئیں اور مجھے بھی سونے دیں۔" اس نے کہا اور فون رکھ دیا۔

"سو....." اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی لائن ڈس کنیکٹ ہو چکی تھی۔ اس نے موبائل بیڈ پر ہی پھینکا اور خود کو بستر پر گرا لیا۔

وہ اندر جانے کی بجائے انٹرنس ڈور کی سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گئی تو جمی اسے یوں بیٹھے دیکھ کر باہر ہی چلا آیا۔

"لگتا ہے آج واکنگ کا موڈ تھا تمھارا۔" جمی نے شرارت سے ہنستے ہوئے کالیکن پھر اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر ذرا سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

"کشف آر یو او کے؟ گاڑی کہاں ہے تمھاری؟"

"مین روڈ پر بند ہو گئی تھی۔ لوگوں سے دھکا لگوا کر سائیڈ پر کروا کر آ رہی ہوں۔" اس نے لیفٹ ہینڈ کو دوسرے ہاتھ سے سہارا دے رکھا تھا۔

"میں نے اس لیے تم سے کل کہا تھا کہ گاڑی استعمال کرنے سے پہلے اس کی ٹیوننگ کروا لو۔"

"کل ٹائم ہی کب تھا۔ اس پولیس والے نے کارروائی پوری کرتے کرتے ہی شام کر دی تھی۔ میں نے سوچا تھا آج واپسی پر گیراج میں چھوڑ دوں گی..... آہ۔" درد کی شدت سے اس کے منہ سے سسکی نکل گئی۔

"کیا ہوا؟" اچانک ہی جمی کی نظر اس کے لیفٹ ہینڈ سے نکلتے خون پر پڑی۔

"کشف یہ کیا ہوا؟" وہ ایکدم گھبرا کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"کچھ نہیں معمولی سی چوٹ ہے۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"اتنا خون بہہ رہا ہے اور تم کہہ رہی ہو معمولی چوٹ ہے..... یہ ہوا کیسے؟" اس نے سلویز ہٹا کر زخم دیکھنا چاہا لیکن سلویز اتنی ٹائٹ تھی کہ اوپر نہیں ہو سکی۔

"پتا نہیں..... میں تو اپنی طرف سے سائیڈ پر ہی چل رہی تھی پھر بھی وہ رگشے والا مار گیا۔"

"کمال کرتی ہو تم بھی..... آتے ہی کیوں نہیں بتایا؟ سلیو کاٹنی پڑے گی۔ میری گاڑی میں فرسٹ ایڈ باکس ہے میں ابھی لے کر آتا ہوں۔" وہ فوراً ہی اٹھ کر بھاگا تھا۔

اس نے جمی کو دیکھنے کے لیے نظریں اٹھائیں تو سامنے سے اذعان آتا دکھائی دیا اور وہ بھی کسی لڑکی کا ہاتھ تھامے۔ دونوں نہ جانے کس بات پر ہنس رہے تھے۔ درد کا احساس اچانک ہی مٹ گیا تھا اور اس کی جگہ ایک بالکل الگ احساس جاگ گیا تھا۔ جلن کا' حسد کا احساس' اچانک ہی وہ اس لڑکی سے جیلس ہونے لگی تھی اور وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ کیوں۔

اذعان کی نظر اس کے ہاتھ سے بہتے خون پر پڑی تو وہ اس سے ہاتھ چھڑا کر کشف کے پاس چلا آیا۔

"آپ کے ہاتھ سے تو خون بہہ رہا ہے۔" اس نے پریشانی سے کہا۔ اذعان کو اپنے لیے یوں فکرمند ہوتا دیکھ کر اسے ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا تھا۔

"یہ سب ہوا کیسے؟" اذعان نے اس کے پاس ہی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اس کا زخمی ہاتھ تھام لیا۔ وینا کی اذعان کا یوں ہاتھ تھامنا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی جمی فرسٹ ایڈ باکس اٹھائے چلا آیا۔

"لگتا ہے حادثے تو تمھاری تلاش میں رہتے ہیں کہ کب تم گھر سے نکلو اور....." جمی کو اس کی لاپرواہی پر سخت غصہ آ رہا تھا۔

"اب میں نے جان بوجھ کر تو کچھ نہیں کیا نہ۔" اس نے روہانسی آواز میں کہا۔

"جمی اس وقت انھیں آپ کی ہمدردی کی ضرورت ہے۔ ڈانٹ آپ بعد میں لیجیے گا..... مے آئی۔" اذعان نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا

تو جمی نے باکس اسے تھما دیا۔

اذعان نے باکس میں سے قینچی نکال کر اسے سائیڈ پر رکھ دیا پھر اس کی سلوز کاٹیں تو پورا بازو خون سے بھرا ہوا تھا۔ جمی نے جلدی سے روئی ڈیٹول میں بھگو کر اسے پکرائی۔

''اب تھوڑی سی جلن ہوگئی۔ بٹ بی بریو۔''

اذعان نے کہا تو کشف نے ہونٹ بھینچ کر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ آہستہ آہستہ زخم صاف کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کے چہرے کی طرف بھی دیکھ رہا تھا جہاں اس کے چہرے پر درد کے آثار نظر آتے وہ فوراً ہاتھ روک کر آہستہ سے پھونکیں مارنے لگتا اور اس کا چہرہ پرسکون ہو جاتا۔ زخم صاف کر کے اس نے اینٹی سیپٹک کریم لگا کر بینڈیج کر دی۔

''اب درد تو نہیں ہو رہا ہے؟'' اس نے بینڈیج کر کے پوچھا تو کشف نے آہستہ سے انکار میں سر ہلا دیا۔

''زخم زیادہ گہرا تو نہیں ہے لیکن پھر بھی ڈاکٹر کے پاس ضرور چلی جایئے گا۔'' اس نے خلوص سے مشورہ دیا۔

''اذعان تم شاید بھول رہے ہو کہ میں بھی تمھارے ساتھ آئی ہوئی ہوں۔'' وینا کافی دیر سے خود پر قابو پائے کھڑی تھی لیکن اب اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

''اوہ..... آئی جسٹ فارگیٹ..... ویسے تو آپ دونوں ہی ایک دوسرے سے واقف ہیں لیکن پھر بھی..... کشف یہ.....'' اذعان نے تعارف کی رسم نبھانی چاہی لیکن وینا نے اسے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

''میں یہاں تمھارا گھر دیکھنے آئی تھی تمھارے ورکرز سے ملنے نہیں۔'' اس کا انداز سراسر توہین آمیز تھا۔ کشف کا چہرہ خجالت سے سرخ پڑ گیا۔

''جمی پلیز مجھے گھر چھوڑ آؤ۔'' کشف فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ویٹا وٹس رونگ ود یو؟'' وہ حیران پریشان سا اٹھ کھڑا ہوا۔

''وٹس رونگ ود می..... وٹس رونگ ود یو..... اتنی دیر سے مجھے اگنور کیے تم اس لڑکی کے ساتھ.....'' اس نے ہونٹ بھینچ کر منہ دوسری طرف کرلیا۔

''او کم آن وینا میں تو صرف..... اور تم کب سے اتنی بچی ہوگئی ہو۔'' اذعان نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کرلیا پھر کشف کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

''کشف ڈونٹ مائینڈ دیٹ۔ اس کی عادت ہی ایسی ہے۔''

''اٹس اوکے اذعان صاحب..... جمی چلیں۔'' اس نے کہہ کر جانے کے لیے قدم بڑھائے تو جمی بھی اس کے ساتھ ہولیا۔

وہ بیڈ پر نیم دراز ناول پڑھنے میں مصروف تھی۔ جب اس کا موبائل بجنے لگا۔ موبائل اٹھایا تو اذعان کا نمبر دیکھ کر وہ فوراً سیدھی ہو بیٹھی۔ دھڑکنیں ایکدم ہی تیز ہوئی تھیں۔ اس نے موبائل آن کر کے کان سے لگالیا۔

''ہیلو۔''

''ہائے کشف..... اذعان ہیئر..... ہاؤ آر یو۔''

''فائن تھینک یو۔''

''آئی ہوپ کہ آپ کا ہاتھ اب تک ٹھیک ہو چکا ہوگا..... یا مزید ریسٹ کی ضرورت ہے؟'' اس کا لہجہ نارمل ہی تھا لیکن پھر بھی کشف کو طنزیہ لگا۔

''جی۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''آپ کے اس جی کو میں کیا سمجھوں ٹھیک

ہو گیا یا پھر نہیں؟''

''میں کل آ رہی ہوں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''او کے..... دیٹس گڈ۔ ایکچوئیلی میں نے یہی پتا کرنے کے لیے فون کیا تھا کیونکہ ہمارے دیئے ہوئے فرنیچر کا جو آرڈر باقی رہ گیا تھا وہ تیار ہو چکا ہے کل گیارہ بجے تک وہ سامان پہنچا دیں گے۔''

''ڈونٹ وری میں وہیں موجود ہوں گی۔''

وہ اس کی وضاحت کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

''او کے سی یو ٹو مارو..... ٹیک کیئر۔''

''بائے۔''

اس نے فون آف کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور بیڈ سے ٹیک لگا لی۔

''یہ دل بھی کتنا پاگل ہے۔ جانتا بھی ہے کہ اس سفر کی کوئی منزل نہیں ہے پھر بھی اسی راستے پر چلنے پر بضد ہے۔ کچھ پل کی خوشی کے لیے دامن کانٹوں سے بھر لینا چاہتا ہے..... اف' یہ کیسی بے بسی ہے؟'' اپنی اس بے بسی پر وہ جھنجلا کر اٹھ بیٹھی۔

''مجھے بھی پوری دنیا میں ایک وہی ملا تھا محبت کرنے کے لیے۔'' اسے خود پر شدید غصہ آ رہا تھا اور اس نے غصے میں تکیہ اٹھا کر پھینکنا چاہا لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گئی اور تکیہ واپس رکھ کر خود کو اس پر گرا دیا۔

''کاش کہ میں خود کو روک پاتی..... لیکن نہیں اس میں میرا کیا قصور..... محبت با اختیار کب ہوتی ہے۔ یہ تو بن بادل برسات کی طرح برستی ہے اور شہر دل کے گرد کھڑی فصیلیں ریت کی دیواروں کی طرح کب ڈھے جاتی ہیں پتا نہیں چلتا۔ جیسے مجھے پتا نہیں چلا کہ کب اذعان حیدر دھڑکن بن کر میرے دل میں بس گیا۔'' چپکے سے دو آنسو نکل کر تکیے میں جذب ہو گئے تھے جو اس کی خاموش محبت کا امین بھی تھے اور راز دار بھی۔

اسے مسلسل کھڑکی سے باہر دیکھتا پا کر وہ زچ ہو کر چیخی۔

''کشف..... کیا ہے بھئی؟''

''کیا..... کیا ہوا؟'' وہ ایکدم چونک کر پلٹی تھی۔

''کیا ہوا..... یعنی میں جو اتنی دیر سے بکواس کر رہی تھی محترمہ کو اس کی خبر ہی نہیں۔'' کشف کا یوں چونکنا اسے اور غصہ دلا گیا تھا۔

''نہیں..... سن تو رہی تھی۔'' اس نے یقین دلانا چاہا۔

''اچھا تو پھر بتاؤ میں کیا کہہ رہی تھی۔'' سمعیہ نے مشکوک ہو کر اسے گھورا۔

''ہاں..... تم وہ.....'' وہ ٹہلتے ہوئے ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک اسے کچھ دن پہلے اس سے ہونے والی اپنی بات چیت یاد آ گئی تو وہ مطمئن سی ہو کر بیڈ پر بیٹھ کر کہنے لگی۔

''تم اس پرپوزل کی بات کر رہی تھیں نہ۔ ڈونٹ وری میں خالہ جانی سے کہہ دوں گی کہ تمھیں وہ اول جلول سے حلیے والا لڑکا بالکل پسند نہیں آیا ہے اس لیے وہ فوراً انکار کر دیں۔'' اس نے مسکرا کر سمعیہ کی طرف دیکھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات نے اسے بتا دیا کہ بات یہ نہیں تھی۔

''اچھا تو پھر تم شاپنگ پر چلنے کی بات کر رہی تھیں نہ..... تو کل ہی چلتے ہیں۔'' اس نے ایک اور کوشش کی لیکن ادھر چہرے پر ہنوز سنجیدگی طاری تھی۔

''او کے فائن..... ہاں میرا دھیان کہیں اور تھا۔ میں نے تمھاری بات نہیں سنی۔'' اس نے ہار مان لینے والے انداز میں کہا۔

''کشف آخر تمھیں ہوتا کیا جا رہا ہے؟

پوچھو کچھ جواب کچھ ملتا ہے۔ جب بھی آؤ یا تو گم صم سی بیٹھی ہوئی ملتی ہو یا پھر کھڑکی میں کھڑی آسمان میں کچھ کھوجتی ہوئی نظر آتی ہو۔ یہ سب کیا ہے آخر؟'' وہ سچ مچ پریشان نظر آ رہی تھی۔

''تم سچ مچ جاننا چاہتی ہو کہ مجھے کیا ہوا ہے؟'' اس نے بڑے عجیب سے انداز میں پوچھا تھا۔

''ہاں۔'' وہ اس کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔

کشف آہستہ روی سے چلتی ہوئی کھڑکی کے پاس چلی آئی۔

''اذعان حیدر۔'' کشف نے نظریں آسمان پر جما کر کہا۔

''اذعان حیدر۔'' وہ زیر لب بڑبڑائی۔

''لیکن اذعان کا اس بات سے کیا تعلق؟'' اس نے نا سمجھنے والے انداز میں کہا۔

''بہت گہرا تعلق ہے..... مجھے لگتا ہے..... مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔'' اس نے کہا اور اسکی طرف گھوم گئی۔

''کیا..... کشف آر یو میڈ۔'' اسے سخت شاک لگا تھا۔

''شاید۔'' اس نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟'' وہ ایکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم ایسا کیسے سوچ.....''

کشف نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی

''محبت سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتی..... ہو جاتی ہے۔''

''یہ باتیں فلموں اور ڈراموں میں ہی اچھی لگتی ہیں حقیقت میں نہیں۔'' اس کا انداز جتاتا ہوا تھا۔

''محبت تو پھر بھی محبت ہی رہے گی پھر چاہے وہ فلمی ہو یا حقیقی۔''

''کشف..... کیا اسے بھی تم سے.....'' اس نے جان بوجھ کر سوال ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

''نہیں..... اور کبھی ہو بھی نہیں سکتی..... کیونکہ اذعان حیدر جیسا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تو پھر اس کی محبت بھی اس جیسی ہی ہو گی..... سب سے منفرد، سب سے حسین..... اور میں..... میں وہ نہیں۔'' اس نے پھیکی سی ہنسی ہنس کر اپنا سر کھڑکی کے پٹ سے ٹکا دیا۔

''کشف۔'' اس نے آ کر اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ سیدھی ہو گئی لیکن اس کی آنکھوں میں موجزن درد اس نے بخوبی دیکھ لیا تھا۔

''اس چاند کو دیکھو سمعیہ۔'' اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ جتنا ہمیں قریب نظر آتا ہے اس سے کہیں زیادہ دور ہے۔ ہم اسے پانے کا صرف خواب دیکھ سکتے ہیں..... یا نہیں سکتے..... اور خوابوں پر تو پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے نہ۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی تو اس کی آنکھوں میں تیرتے آنسو اور بھی واضح ہو گئے۔

''کشف یو آر ریئلی ویری بریو۔'' سمعیہ نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''ہاں تب ہی تو جہاں سے لوگ زندگی ہار جاتے ہیں میں وہاں سے جینا شروع کر رہی ہوں۔'' اس نے کہا تو سمعیہ نے اسے گلے لگا لیا۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں برش کر رہی تھی جب وہ دروازہ ناک کر کے اندر چلی آئی۔

''یہ تم آج صبح صبح یہاں کیا کر رہی ہو؟'' کشف نے اپنے شولڈر سے کچھ ہی نیچے آتے

سٹیپ کٹنگ بالوں کو بینڈ میں جکڑ کر ڈھیلی سی پونی باندھ لی۔

''میری چھوڑو یہ بتاؤ تم کہاں جا رہی ہو؟'' سمعیہ اس کے بالکل پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔

''جہاں روز جاتی ہوں۔'' اس نے مڑ کر مسکراتے ہوئے کہا لیکن اس کی آنکھوں کی سرخی اس کا بھید عیاں کر گئی۔

''کشف میری ایک بات مانو گی؟'' سمعیہ نے پوچھا تو وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''کہو۔''

''تم یہ پراجیکٹ چھوڑ دو۔''

''کیوں مجھے کمزور سمجھتی ہو کیا؟''

''نہیں..... لیکن خود کو آزمانا بھی تو حماقت ہے۔'' سمعیہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تم میری فکر مت کرو مجھے کچھ نہیں ہو گا اور ویسے بھی صرف دس بارہ دن کا ہی کام باقی رہ گیا ہے۔ اسکے بعد وہ اپنے راستے میں اپنے راستے۔'' کشف نے اس سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔

''لیکن مجھے یہ راستے اتنی آسانی سے جدا ہوتے نظر نہیں آ رہے ہیں..... اپنی آنکھیں دیکھیں ہیں تم نے؟ ان میں صرف اذعان حیدر ہی نظر آتا ہے۔'' سمعیہ نے کہا تو وہ فوراً ہی رخ پھیر گئی۔

''ایک بات پوچھوں سچ سچ بتاؤ گی؟'' سمعیہ نے اسے شانے سے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا۔

''جو جگہ تم اپنے دل میں اذعان کو دے چکی ہو کیا کوئی اور کبھی وہ جگہ لے پائے گا۔''

''شاید نہیں۔'' اس نے آہستگی سے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کیا اور کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

''اس کے باوجود بھی کہ اسے تم سے محبت نہیں ہے اور تم اس یک طرفہ محبت کے لیے اپنی پوری زندگی داؤ پر لگانے جا رہی ہو۔'' وہ اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''زندگی تو داؤ پر لگ ہی چکی ہے اب تو بس بازی کے ختم ہونے کا انتظار ہے۔'' کشف نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن تم.....'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی کشف نے اسے ٹوک دیا۔

''ہماری زندگی کے فیصلے ہم خود نہیں کرتے ہیں بلکہ سب کچھ پہلے سے طے ہوتا ہے۔ اب یہ ہم پر ہے کہ ہم یہ فیصلے ہنس کر قبول کریں یا رو کر..... جب بچھڑنا مقدر ہی ٹھہرا تو اس پر افسوس کیسا؟'' اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

''واہ کتنی آسانی سے تم نے مجھے زندگی کا فلسفہ سمجھا دیا لیکن اپنے دل کو نہیں سمجھا پائیں..... کہنا آسان ہے لیکن سہنا بہت مشکل..... اور یہ میں تمھاری آنکھوں میں پڑھ سکتی ہوں۔'' اس نے کہا تو کشف نے سر دیوار سے ٹکا دیا۔

اوپر والے بیڈ رومز کا سارا کام مکمل تھا۔ نیچے بھی آدھے سے زیادہ کام ہو چکا تھا۔ بس ہال کی سیٹنگ اسے مطمئن نہیں کر پا رہی تھی۔ اس لیے اس نے ہال کا کام درمیان میں ہی چھڑوا کر ڈرائنگ روم کا شروع کروایا ہوا تھا اور اب وہ بھی تقریباً تیار ہی تھا۔ کافی سارے آئیڈیاز اس نے پیپرز پر اتارے تو تھے لیکن اسے ان سب میں ہی کسی نہ کسی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ کافی دیر سے وہ ہال کے بیچ میں کھڑی سوچ رہی تھی۔ آخر ایک خیال نے اسے مطمئن کر ہی دیا اور پھر اس خیال کو پیپر پر منتقل کر کے وہ ذہن کو ریسٹ دینے باہر چلی آئی۔ لان میں اذعان کو اکیلے بیٹھے دیکھ کر وہ بھی وہیں آ گئی۔

''آپ یہاں اکیلے بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟''

''کیوں میرے اکیلے بیٹھنے پر آپ کو اعتراض ہے کیا؟'' اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''شاید آپ کچھ سوچ رہے تھے اور میں نے آ کر ڈسٹرب کر دیا۔'' کشف نے اس کے لہجے پر چوٹ کرتے ہوئے کہا۔

''ڈسٹرب تو کیا ہے لیکن..... سوچ میں آپ کو ہی رہا تھا۔''

''جی۔'' وہ ایکدم چونکی تھی۔

''جی..... آپ نے اس گھر کو واقعی ڈریم ہاؤس بنایا ہے۔ بالکل ویسا ہی جیسا میں نے سوچا تھا..... پلیز۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا تو وہ اس کے ساتھ پڑی چیئر پر بیٹھ گئی۔

''آپ کو یقین ہے کہ یہ گھر بالکل ویسا ہی ہے۔'' اس کی نظریں گلاب کے پودے پر لگے اکلوتے پھول پر ٹکی تھیں۔

''کیوں آپ کو یقین نہیں ہے؟'' اس نے بھی اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

''نہیں۔''

''کیوں.....؟'' اس نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

''خواب جب حقیقت کا روپ دھارتے ہیں تو اپنی اصلیت کھو دیتے ہیں۔''

''مطلب.....؟'' وہ اب بھی نہیں سمجھا تھا۔

''میرے لیے تو یہ آج بھی ایک مکمل گھر نہیں ہے بلکہ اینٹ پتھر سے بنا ہوا مکان ہی ہے جسے مصنوعی آلائشوں سے خوبصورت تو بنا دیا گیا ہے لیکن اس میں زندگی دوڑتی محسوس نہیں ہوتی۔'' اس نے گھر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو پھر آپ کے خیال میں گھر کیسا ہوتا ہے؟'' اذعان نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

''گھر..... گھر تو وہ ہوتا ہے جو رشتوں کی بنیاد پر کھڑا ہو اور محبت کے رنگوں سے سجا ہو۔ جہاں اعتبار ہو، خلوص ہو وہی گھر.....'' اچانک ہی اسے خود پر ٹکی اذعان کی نظروں کا احساس ہوا تھا اور وہ ایکدم خاموش ہو گئی۔

''کیا ہوا؟'' اس کا یوں چپ ہونا اسے حیران کر گیا تھا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ ایکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں چلتی ہوں بہت کام باقی ہے۔''

''عجیب لڑکی ہے اپنے خوابوں کا اظہار بھی اسے گوارا نہیں۔'' اذعان نے اسے جاتے دیکھ کر پوچھا۔

وہ جمی کے ساتھ کوریڈور میں کھڑی کچھ ڈسکس کر رہی تھی جب اچانک ہی اس کی نظر سامنے سے آتے اذعان اور وینا پر پڑی تھی اور پھر جیسے نظر پلٹنا ہی بھول گئی تھی۔ بلیک لانگ اسکرٹ اور سلیولیس ریڈ شرٹ میں وینا کا حسن آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ جمی بھی اس کی محویت پر ادھر ہی دیکھنے لگا۔

''ارے آپ لوگ اب تک یہیں ہیں؟'' اذعان بالکل ان کے سامنے آ کر رکا اور کشف نے فوراً ہی نظریں جھکائیں۔

''بس ہم نکلنے ہی والے تھے ایکچوئیلی ہماری پوری کوشش ہے کہ کل تک سارا کام وائنڈ اپ کر دیں۔'' کشف کی خاموشی محسوس کر کے جمی نے جواب دیا۔

''اوہ دیٹس گڈ۔ اذعان ڈیئر کیوں نہ ہم اپنی انگیجمنٹ سیریمنی کے بعد اس گھر میں ایک پارٹی رکھ لیں اپنے فرینڈز کے لیے۔'' وینا نے ایک ادا سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

کشف کو ایکدم جیسے کرنٹ لگا اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں لیکن وہ وینا کی طرف متوجہ تھا۔

''اوکے از یو وش۔'' اذعان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کانگریچولیشنز ٹو بوتھ آف یو۔'' جمی نے مسکرا کر ان دونوں کو وش کیا۔

''لگتا ہے کشف کو کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی ہماری منگنی کی خبر سن کر۔'' وینا نے بڑا تاک کر وار کیا تھا۔ حالانکہ ان کے متوجہ ہونے سے پہلے اس نے اپنی نظریں جھکا لی تھیں لیکن اس کی آنکھوں کا خالی پن وینا کی نظروں میں آ چکا تھا۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے..... کانگریچولیشنز ٹو یو۔ آپ دونوں کو دیکھ کر تو کوئی بھی کہہ سکتا ہے..... میڈ فار ایچ ادر۔'' اس نے خود کو کمپوز کر کے کتنی مشکلوں سے یہ چند جملے بولے تھے یہ وہی جانتی تھی اور اس بار اس نے اذعان کی طرف دیکھنے کی غلطی نہیں کی تھی۔

''تھینکس۔'' وینا نے گردن اکڑا کر کسی احسان کی طرح اس کی مبارک باد کو قبول کیا تھا۔

''ایکسکیوزمی۔'' موبائل کی بیپ سن کر وینا ایک سائیڈ پر چلی گئی۔

''میں ابھی آیا۔'' ورکر کا اشارہ دیکھ کر جمی بھی چلا گیا تو وہ دونوں ہی وہاں اکیلے کھڑے رہ گئے۔ وہ براہ راست اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی اور اس کا یوں نظریں چرانا اسے اچنبھے میں ڈال رہا تھا۔ وہ اس کی ہر حرکت کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

''اوکے اذعان صاحب میں چلتی ہوں اب۔'' اس کی نظروں سے گھبرا کر وہ جانے کے لیے مڑی۔

''ایک منٹ کشف۔'' اس نے بے اختیار ہی اسے پکارا اور اس کے قدم ٹھہر گئے۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ میری انگیجمنٹ میں شریک ہوں۔''

''کیوں..... کس رشتے سے؟'' کشف نے پلٹ کر دیکھا اور وہ اس کی آنکھوں میں موجزن تاثرات دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے وہاں سے جانے میں ایک پل کی بھی تاخیر نہیں کی تھی۔ لیکن وہ اسی ایک لمحے کی گرفت میں آ چکا تھا اور نہ جانے کب تک ان آنکھوں کے سحر میں کھویا رہتا کہ وینا کی پکار سن کر چونک اٹھا۔ اس نے کشف کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن وہاں سوائے خاموشی کے کچھ بھی نہیں تھا۔

''اس کی آنکھیں اتنی اداس کیوں تھیں؟ کتنی ویرانی کتنا خالی پن تھا ان آنکھوں میں..... لیکن کیوں؟'' وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا۔

''وٹس رونگ ود یو اذعان۔ اتنی دیر سے تمھیں اندر بلا رہی ہوں اور تم ہو کہ.....'' وینا نے اس کے پاس آ کر کہا تو اس نے بھی سر جھٹک کر اپنی ساری سوچوں کو پرے دھکیل دیا۔

''ہاں..... وہ میں بس آ ہی رہا تھا..... چلو۔'' وہ مسکراتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑا۔

کل سے وہ آنکھیں اسے ڈسٹرب کر رہی تھیں اور اب آفس آ کر بھی وہ اس کے خیال سے پیچھا نہیں چھڑا پایا تھا۔ وہ دو آنکھیں جیسے اس کے اندر بس گئیں تھیں اور اسے کسی طرح چین نہیں لینے دے رہی تھیں۔ اسے خود پر شدید غصہ آ رہا تھا اور اسی جھنجلاہٹ میں وہ خواہ مخواہ ہی اپنی سیکرٹری پر اس پڑا تھا۔ تنگ آ کر وہ آفس سے نکل پڑا۔ بغیر کسی منزل کا تعین کیے وہ بلا مقصد ہی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ اپنی اس فرسٹریشن کو کم کرنے کا اس کے پاس اس سے بہتر طریقہ کوئی نہیں تھا۔ لیکن جب کچھ دیر بعد گاڑی اذعان ولا کے سامنے رکی تو اس نے ایک گہرا

سانس کھینچ کر سر سیٹ کی بیک سے ٹکا دیا۔

''شاید ان آنکھوں کا راز جانے بغیر مجھے چین نہیں ملے گا۔'' اس نے تھک کر سوچا تھا۔

گاڑی لاک کر کے جب وہ اندر آیا تو جمی کو اکیلے ہی ادھر سے ادھر بھاگتے دیکھ کر اسے سخت مایوسی ہوئی۔

''کیا بات ہے کشف اب تک نہیں آئیں؟'' ایک ہلکی سی امید کے تحت اس نے جمی سے پوچھا۔

''نہیں وہ اب نہیں آئے گی۔'' جمی نے پینٹنگز دیکھتے ہوئے بڑے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

''کیوں.....؟'' بے اختیار ہی اس کے منہ سے نکلا اور جمی نے اس کے لہجے کی بے قراری محسوس کرتے ہوئے چونک کر اسے دیکھا۔

''آئی مین آج تو آپ لوگ کام ختم کرنے والے تھے نہ۔'' اس نے جلدی سے وضاحت دی۔

''کام تو میں آپ کا آج ختم کروا کے ہی جاؤں گا۔ بس یہ پینٹنگ لگوا دوں اس کے بعد کوریڈور میں تھوڑا سا کام رہ جائے گا اور یہ سب شام تک ہو جائے گا۔''

''اوکے آپ کام کیجیے میں چلتا ہوں۔'' اس نے لہجے میں بیزاری صاف محسوس ہو رہی تھی۔

''آپ کو کشف سے کوئی کام تھا؟'' وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''ہاں..... وہ..... ایکچوئیلی میں چاہ رہا تھا کہ آج آپ دونوں میرے ساتھ لنچ کریں۔'' اسے ایکدم ہی خیال سوجھا۔

جمی کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ اس جیسے اکھڑ مزاج بندے سے اسے ایسی دریا دلی کی امید ہرگز نہیں تھی۔

''آپ اس سے فون کر کے پوچھ لیں۔''

''اوہ ہاں..... یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا؟'' اس نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے کہا اور نمبر ڈائل کرتے ہوئے باہر نکل آیا تو جمی بھی۔ دوسری طرف تیسری بیل پر فون اٹھا لیا گیا۔

''جی اذعان صاحب کہیے۔''

''کیسی ہیں آپ؟''

''ایک دن میں کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا ہے جیسی کل تھی ویسی ہی آج ہوں۔'' شاید یہ اتنے دن ساتھ کام کرنے کا نتیجہ تھا جو بالکل اسی کی ٹیون میں بول رہی تھی اس لیے وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

''اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔''

''جی کیا مطلب؟'' اس نے ناسمجھی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں..... میں چاہ رہا تھا کہ آج آپ اور جمی میرے ساتھ لنچ کریں۔'' اس نے فوراً ہی بات بدل دی تھی۔

''سوری میں نہیں آ سکتی۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ کل کی طرح دوبارہ اس کے سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔

''آ نہیں سکتیں یا آنا نہیں چاہتیں؟'' اس کا انداز جتاتا ہوا تھا۔

''آپ جو بھی سمجھ لیں۔''

''کیا میں وجہ جان سکتا ہوں؟''

''وجوہات تو بہت سی ہیں لیکن آپ کے لیے یہی کافی ہے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' اس نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

''کافی اچھا بہانہ ہے۔''

''چلیے بہانہ ہی سہی کم سے کم میرے پاس جواز تو ہے جبکہ آپ تو.....'' اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ کچھ غلط بولنے جا رہی ہے تو فوراً چپ ہو گئی۔

''مجھے ایکسکیوز دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کیونکہ میں ہمیشہ اپنے دماغ کی سنتا ہوں۔'' وہ اس کی ادھوری بات کا کچھ اور ہی مطلب سمجھ بیٹھا تھا۔

''ایک بار دل کی بھی سن کر دیکھ لیجیے گا کم از کم ایک غلط فیصلہ کرنے سے تو بچ جائیں گے۔'' اس نے کہا اور فوراً ہی لائن ڈسکنیکٹ کر دی اور وہ فون ہاتھ میں پکڑے ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔

حیدر ولا میں آج رنگ و نور کا سیلاب اترا ہوا تھا۔ دو بڑے بزنس مینوں کے درمیان قائم ہونے والے اس رشتے کو ہر جگہ ہی بڑی اہمیت دی جا رہی تھی۔ یہ کاروباری رشتہ تھا۔ جسے کاروباری مفاد کے تحت جوڑا گیا تھا۔

اذعان ابھی تک کمرے میں ہی موجود تھا۔ تیار ہونے کے باوجود نیچے جانے کو اس کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی نے اس کا گھیراؤ کر رکھا تھا جسے وہ کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا بس مسلسل ادھر سے ادھر ٹہلیں لگا رہا تھا۔

''حد کرتے ہو یار۔ سب تمھارا نیچے ویٹ کر رہے ہیں اور تم یہاں ٹہل لگا رہے ہو۔'' یاسر نے اندر آ کر اسے ادھر سے ادھر چکراتے دیکھ کر کہا۔

''ہاں..... بس..... وہ میں آنے ہی والا تھا۔'' اس نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''اذعان..... تم ٹھیک..... تم کچھ ڈسٹرب لگ رہے ہو۔'' یاسر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بس یہ سب کچھ اتنا جلدی ہو رہا ہے نہ.....''

''جلدی..... تم اسے جلدی کہتے ہو۔ پچھلے پانچ سالوں سے تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو اور پھر انگیجمنٹ کا یہ فیصلہ تمھارا ہی تھا۔ اس وقت تو سب ٹھیک تھا پھر اب کیا..... ایک منٹ کہیں تم اور کہیں تو انوالو نہیں ہو گئے۔'' اس نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم سے تو کچھ کہنا ہی فضول ہے..... میں تو بس یونہی..... اور تم نے پوری کہانی گھڑ لی۔'' اس نے اس کی طرف سے رخ پھیرا اور کوٹ پہننے لگا۔

''جناب کہانی تو تمھارا چہرہ سنا رہا ہے۔ میں نے تو صرف اسے الفاظ دیئے ہیں۔'' اس نے دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈال لیے۔

''ویسے اگر تمھارا پڑھائی کا شوق پورا ہو گیا تو نیچے چلیں۔'' اذعان نے کوٹ کے بٹن لگا کر اس کی طرف دیکھا۔

''چلیے جناب۔'' یاسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو نہیں سدھرے گا۔'' اذعان نے کہہ کر جانے کے لیے قدم بڑھائے تو وہ بھی سیٹی پر شوخ سی دھن بجاتا اس کے پیچھے آ گیا۔

وہ ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھ بیڈ پر نیم دراز سگریٹ پینے میں مشغول تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھی چائے کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی لیکن وہ ہر چیز سے بے نیاز سگریٹ کے دھوئیں میں نجانے کس چہرے کو کھوج رہا تھا۔ ایک دھندلی سی تصویر تھی جو صاف نظر نہیں آ رہی تھی اور اس کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔

''کمال ہے منگنی کے بعد کسی کو مجنوں بنتے میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔''

اپنے قریب آواز سن کر وہ ایکدم چونک اٹھا۔

''اوہ تم۔'' یاسر کو دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا اور سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی۔

''تم کب آئے؟''

''دنیا میں آئے تو چھبیس سال ہو گئے ہیں لیکن تمھارے کمرے میں صرف دو منٹ پہلے ہی آیا ہوں۔ ویسے میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔'' یاسر نے دروازے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے کہا تو پیچھے سے وینا آتی نظر آ گئی۔

''ہائے..... ارے یہ کیا اذعان تم ابھی تک بستر میں ہی ہو۔''

''کیوں تمھارے خیال میں مجھے کہاں ہونا چاہیے تھا؟'' اس نے پھیکی سی ہنسی ہنس کر کہا۔

''کہیں نہیں بس تم فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔''

''لیکن جانا کہاں ہے؟'' اس نے بے دلی سے پوچھا۔

''وہ تو پتا نہیں بس اتنا جان لو کہ آج کا پورا دن ہم ساتھ گزاریں گے۔''

''وہ کس خوشی میں؟''

''ڈونٹ ٹیل می کہ تم یہ بھی بھول گئے ہو کہ کل یاسر نیویارک جا رہا ہے۔'' وینا نے اچنبھے سے کہا۔

''وہ کیسے بھول سکتا ہوں اس کی طرح اس کے کام بھی نرالے ہوتے ہیں۔ اچھا بھلا لندن یونیورسٹی میں ایڈمشن مل گیا تھا لیکن اسے چھوڑ چھاڑ نیویارک یونیورسٹی سے ایم۔بی۔اے کرنے کے لیے پچھلے تین سال سے خوار ہو رہا ہے۔''

''شکر کر کہ ایڈمیشن مل گیا ہے ورنہ تو تو مجھے جانتا ہی ہے جا ہے مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ ہی ایم۔ابی۔اے کرنا پڑتا لیکن کرتا نیویارک سے ہی۔'' یاسر نے کہا تو وہ دونوں ہی مسکرا اٹھے۔

''ویسے یاسر نیویارک جانے کی کوئی خاص وجہ؟''

''وہاں کی لڑکیاں زیادہ خوبصورت ہوتی ہیں۔'' اس نے اتنی سنجیدگی سے کہا کہ وہ زور سے ہنس پڑی۔

''اس کے چٹکلے کبھی نہیں ختم ہو سکتے۔ میں چینج کر کے آتا ہوں۔'' اذعان نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''دوسرے لفظوں میں تم مجھے مسخرہ کہہ رہے ہو اور یہ بات میں مائنڈ بھی کر سکتا ہوں۔''

''تمھارے پاس مائنڈ ہو گا تو کرو گے نہ۔'' اس نے واش روم کے دروازے پر رک کر کہا۔

''جاتے جاتے انسلٹ کر گیا۔'' اس نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

لنچ کے بعد کچھ دیر تو وہ تینوں یونہی بے مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے رہے پھر سی سائیڈ پر آ گئے۔ صبح سے ہی موسم خاصا خوشگوار تھا۔ دھوپ چھاؤں کا یہ کھیل کراچی والوں کے لیے معمول کی بات تھی اور اب تو آسمان پر ہلکے ہلکے بادل بھی چھائے ہوئے تھے جنھوں نے اس وقت ہی شام کا تاثر بہت گہرا کر دیا تھا۔ وہ تینوں ساحل سمندر سے کچھ ہی دور چہل قدمی کر رہے تھے۔

''ویسے یاسر یہ سمندر ہمیشہ اتنا دلچسپ کیوں لگتا ہے؟'' وینا نے چہرے پر آئی لٹ کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''نظر نظر کی بات ہے ورنہ کچھ لوگ تو مارے باندھے ہی یہاں آتے ہیں۔'' اس نے اذعان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو دونوں ہاتھ جیبوں میں ٹھونسے لاتعلق سا ان کے ساتھ چل رہا تھا۔

''ارے وہ سامنے تو دیکھو۔'' وینا کی نظر اچانک ہی سامنے سے آتی دو لڑکیوں پر پڑی تھی۔ اذعان نے بھی بے اختیار ہی دیکھا تھا اور پھر نظر جیسے پلٹنا بھول گئی تھی۔ سفید لباس پہنے

ننگے پاؤں گیلی ریت پر چلتی ہوئی وہ کسی بھولی ہوئی داستان کا حصہ لگ رہی تھی۔ بے ترتیب سی لٹوں کو آوارہ چھوڑے وہ خود سے ہی شکوہ کناں نظر آ رہی تھی۔

شاید اذعان کی نظروں کا ارتکاز اتنا گہرا تھا کہ وہ ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ اسے یوں رکتا دیکھ کر اذعان نے بھی فوراً ہی اپنی نظروں کا زاویہ بدلا تھا۔ اپنی اس بے اختیاری پر وہ خود بھی پشیمان نظر آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹ جاتی وینا نے وش کرنے کے سے انداز میں ہاتھ ہلایا تو اسے مجبوراً رکنا پڑا۔

''کشف یہ تم ہی ہو لگتا ہے کافی بیمار رہی ہو۔'' وینا نے اس کے چہرے پر چھائی زردی کو دیکھ کر پوچھا تو اذعان نے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھا لیکن وہ نظریں چرا گئی۔

''نہیں بس کام کا بوجھ کچھ زیادہ ہے آج کل۔'' کشف نے آہستہ سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن مسز آفریدی تو بتا رہی تھیں کہ آج کل تم چھٹیوں پر ہو۔'' وینا نے اس کی کیفیت سے حظ اٹھاتے ہوئے کہا اور وہ اپنی جگہ جز بز ہو کر رہ گئی۔

''اینی وے..... یاسر تم تو پہلی بار ہی مل رہے ہو گے کشف سے۔ یہی وہ انٹیریر ڈیزائنر ہے جس نے اذعان کے بنگلے کو دیکوریٹ کیا تھا۔''

''اٹس اے پلیزر ٹو میٹ یو۔ غائبانہ تو میں آپ سے واقف ہوں لیکن بائی فیس آج پہلی بار مل رہا ہوں اور مجھے بڑے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ یہ پہلی ملاقات ہی آخری ہے۔'' اس نے اتنی بیچارگی سے کہا کہ وینا تو ہنس پڑی اور وہ دونوں پریشان ہو کر ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگی۔

''کشف تم اس کی باتوں کی سیریسلی مت لینا اسے تو عادت ہے چٹکلے چھوڑنے کی۔'' وینا نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''ویسے آپ نے ان کا تعارف نہیں کروایا۔'' یاسر نے دلچسپی سے سمیعہ دیکھ کر پوچھا۔

''اوہ سوری یہ سمعیہ ہے میری کزن۔''

''نائس ٹو میٹ یو۔'' یاسر نے کہا تو سمعیہ محض مسکرا کر رہ گئی۔

''ہم چلتے ہیں اب کافی دیر ہو گئی ہے۔'' سمعیہ کو یاسر کی نظریں بہت الجھا رہی تھیں۔

''جانا ضروری ہے کیا؟'' یاسر کے منہ سے بے اختیار ہی نکلا تھا اور پھر سمعیہ کے ساتھ ساتھ ان تینوں کی بھی گھورتی ہوئی نگاہیں دیکھ کر وہ بوکھلا کر وضاحت دینے لگا۔

''میرا مطلب تھا کہ جانا تو آپ کو ہے ہی لیکن ہم بعد میں تو مل سکتے ہیں نہ..... اچھے دوستوں کی طرح۔''

''جی..... اوکے بائے وینا۔'' کشف نے کہا اور سمعیہ کو لے کر آگے بڑھ گئی۔

''یہ ابھی ابھی تم کیا بکواس کر رہے تھے؟'' ان دونوں کے جاتے ہی وینا نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

''وہ بکواس نہیں میرے دل کی پکار تھی۔ کاش یہ لڑکی مجھے کچھ دن پہلے مل جاتی۔ یہی تو ہے وہ۔''

''شاپ دس نانسینس..... مذاق کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔'' اذعان کو ایکدم ہی غصہ آ گیا تھا۔

''آئی ایم سیریس میں سچ میں.....'' اس نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔

''سیریس..... ہا.....'' وینا نے تمسخرانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

''یاسر تم پاگل ہوئے ہو۔ تم ایک معمولی سی.....''

''پلیز وینا میں نے تم سے پہلے بھی کہا ہے کہ سٹینڈر کے نام پر کی جانے والی انسانیت کی تذلیل مجھے قطعی پسند نہیں ہے اور یہ لڑکی تو پھر ..... میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے لیکن ہاں یہ وہ پہلی لڑکی ہے جسے دیکھ کر دل نے ایک جگہ ٹھہرنے کی آرزو کی ہے۔..... لیکن یہ بات تم دونوں نہیں سمجھ سکتے کیونکہ اسے سمجھنے کے لیے کسی سے محبت کرنا ضروری ہے اور تم تو.....'' اس نے تاسف سے ان دونوں کی طرف دیکھا اور ان کو ہکا بکا کھڑا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

''اذعان۔'' اس نے اوپر اپنے کمرے میں جانے کے لیے ابھی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ ان کے پکارنے پر رک گیا۔

''یس مام۔'' ایک ہاتھ میں بریف کیس پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے پیشانی کو مسلتے ہوئے وہ بہت مضمحل سا دکھائی دے رہا تھا۔

''از اپوری تھنگ آل رائٹ بیٹا۔ وینا دو بار فون کر کے تمھارا پوچھ چکی ہے اور تمھارا موبائل بھی آف تھا۔'' انھوں نے بالکل عام سے انداز میں پوچھا تھا۔

''بیٹری ڈاؤن ہوگئی تھی۔''

''اینی وے کل تم وینا کو لے کر جیولر کے پاس چلے جانا۔ میں چاہتی ہوں کہ شادی کی ساری شاپنگ وہ اپنی پسند سے ہی کرے۔'' وہ کہہ کر جانے کے لیے پلٹیں۔

''شادی۔'' اس کی ساری حسیات ایکدم ہی بیدار ہوئی تھیں۔

''یہ آپ کس کی شادی کی بات کر رہی تھیں؟''

''تمھاری اور وینا کی۔'' وہ اس کی غائب دماغی پر چونک کر واپس پلٹی تھیں۔

''یہ اتنی جلدی شادی کا ذکر کہاں سے آ گیا؟'' اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''جلدی..... اگر تم بھول گئے ہو تو تمھیں یاد دلا دوں کہ شادی کی ڈیٹ تو منگنی والے دن ہی طے ہوگئی تھی اور اب تو کارڈ بھی چھپنے جا چکے ہیں۔'' وہ حیرانگی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''آپ کو کم از کم ایک بار مجھ سے پوچھنا تو چاہیے تھا۔'' اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

''کس بارے میں؟'' انھوں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''مام..... آپ..... بس میں ابھی شادی کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔'' اس نے الجھ کر کہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے اندر ایک سرد جنگ چھڑی ہوئی ہے۔

''اذعان آر یو سیریس تم جانتے بھی ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ یہ ناممکن ہے۔'' انھیں سخت شاک لگا تھا۔

''ماما پلیز مجھے ابھی شادی نہیں کرنی ہے اور جب کروں گا بھی تو یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ لڑکی وینا ہی ہو۔'' وہ کہہ کر فوراً ہی آگے بڑھ گیا تھا۔

''اذعان..... اذعان میری بات.....'' وہ اسے پکارتی رہ گئیں لیکن وہ ان سنی کر کے چلا گیا۔

''پتا نہیں کیا ہوگیا ہے اس لڑکے کو۔ صبح حیدر سے بات کروں گی۔'' وہ پریشان سی کمرے میں چلی آئیں۔

کمرے میں آ کر اس نے بریف کیس صوفے پر اچھالا اور خود کو گرنے کے سے انداز میں بیڈ پر گرا دیا۔

''یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ وینا کے لیے میری فیلنگز اچانک بدل کیوں رہی ہیں۔ مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ مجھ سے کوئی غلط فیصلہ ہوگیا ہے۔'' وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ اپنے کسی بھی عمل کو خود ہی جسٹی فائی نہیں کر پا رہا تھا تو پھر دوسرے کیسے سمجھ سکتے تھے۔ گھٹن جیسے اس کے اعصاب پر سوار ہو رہی تھی۔ اس نے آنکھیں موندیں تو وہ دو پرشکوہ آنکھیں اس کے ہر احساس پر حاوی ہونے لگیں اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

''اف۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ وہ آنکھیں اس کے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئیں تھیں۔ وہ جتنا سوچتا تھا اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا۔ وہ تو ایک ایسا احساس تھی جسے وہ کوئی نام دیتے ہوئے بھی ڈرتا تھا اور اسے جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا۔

کمرے میں ایکدم ہی اسے شدید گھٹن کا احساس ہونے لگا' وہ اٹھ کر ٹیرس پر چلا آیا۔ جنوری کی اس خنک رات میں چودھویں کے چاند کا فسوں خیز حسن پورے ماحول پر چھایا ہوا تھا اور شاید اسی سحر کا اثر تھا کہ وہ خود کو کسی حد تک پرسکون محسوس کر رہا تھا۔

''مجھے کچھ دنوں کے لیے اس شہر سے دور چلے جانا چاہیے۔ شاید یہ تبدیلی ہی کچھ کام کر جائے۔'' اس نے دونوں ہاتھ ریلنگ پر ٹکائے چاند کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ حالانکہ وہ اتنا پرامید تو نہیں تھا لیکن پھر بھی ایک کوشش کر لینا چاہتا تھا۔

''اذعان کم از کم مجھے تم سے ایسی کمی بے وقوفی کی امید نہیں تھی۔ کچھ اندازہ بھی ہے تمھیں کہ کیا کر آئے ہو؟'' یاسر نے کافی کا ایک مگ اس کے سامنے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا اور خود اپنا مگ لے کر اس کے سامنے ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

''کیا کیا ہے میں نے؟'' اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر مگ اٹھا لیا۔

''کیا کیا ہے..... ایک تو تم بغیر کسی کو بتائے یہاں چلے آئے ہو اور اوپر سے کسی کی فون کال بھی اٹینڈ نہیں کرتے۔ میں آخر کب تک ان سب کو بہلاتا رہوں گا اور وہ وینا اس کا کیا قصور ہے اسے کس بات کی سزا دے رہے ہو۔'' پچھلے تین چار دنوں سے وہ اس کی بیزاری دیکھ رہا تھا اس لیے آج کہے بغیر نہ رہ سکا۔

''میں کہاں کسی کو سزا دے رہا ہوں بلکہ وہ ہی میری بات نہیں سمجھ پا رہے ہیں۔'' اس نے کافی کا ایک سپ لیا۔

''تم کچھ سمجھاؤ گے تو وہ سمجھیں گے نہ۔ تم تو خود اس قدر الجھے ہوئے ہو کہ اپنے ہی دل کی بات نہیں سن پا رہے ہو تو دوسروں کو کیا سمجھاؤ گے۔''

''یہ سب کچھ اس لڑکی کا کیا دھرا ہے۔ کاش کہ میں اس سے کبھی نہ ملا ہوتا۔'' اس نے جھنجلا کر مگ ٹیبل پر پٹخ دیا۔

''ہوں تو یہ بات ہے شک تو مجھے پہلے بھی تھا اور اب تو خیر شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے مگ لبوں سے لگا لیا۔

''مطلب۔'' وہ ایکدم چونکا۔

''مطلب یہ ہے کہ اذعان حیدر کو محبت ہوگئی ہے اور.....''

''واٹ ربش ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔'' وہ چیخ کر کھڑا ہوگیا۔

''تمھارا یہ غصہ..... یہ جھنجلاہٹ..... اس بات کی تصدیق کر رہے ہیں کہ میرا کہا ہر لفظ سچ ہے۔ اب میں تمھاری پرابلم سمجھ چکا ہوں۔''

''رئیلی۔'' اس نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔

''تمھاری پرابلم تمھاری ایگو ہے جو تمھیں ہار تسلیم نہیں کرنے دے رہی ہے۔ لیکن میرے یار محبت میں ہار کر بھی جیت ہماری ہی ہوتی

ہے۔'' اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''اچھا فلسفہ ہے۔''

''تم جتنی جلدی اس فلسفے کو سمجھ جاؤ اتنا ہی اچھا ہے کیونکہ زندگی کسی کو بھی دوسرا موقع نہیں دیتی۔'' اس نے کہا تو وہ غصے میں باہر نکل گیا۔

بستر پر پڑے وجود میں حرکت کے آثار دیکھ کر وہ فوراً ہی اس کے پاس آیا۔

''اذعان..... اذعان آنکھیں کھولو۔'' یاسر نے نرمی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا اور اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔

اسے یوں ہوش میں آتے دیکھ کر وہ دیوانہ وار ڈاکٹر کو بلانے کے لیے بھاگا۔

''ناؤ ہی آ ڈٹ آف ڈینجر۔'' ڈاکٹر نے کہا تو بے اختیار ہی اس کے ہاتھ دعا کے انداز میں شکر ادا کرنے کے لیے اٹھے۔ پچھلے چوبیس گھنٹے کسی قیامت سے کم نہیں تھے۔ اپنوں کا ساتھ کتنا ضروری ہوتا ہے یہ اس نے پہلی بار جانا تھا۔

''تو نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔'' ڈاکٹر کے جانے کے بعد اس نے مصنوعی غصے سے اسے گھورا۔

''ڈر گیا تھا۔'' اذعان نے کمزور سی آواز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں مر گیا تھا۔ اگر تجھے کچھ ہو جاتا تو۔ بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تیرے ٹھیک ہوتے ہی ہم دونوں واپس جا رہے ہیں۔ نہیں کرنا مجھے ایسے خواب کو پورا جس کی وجہ سے میں یہاں تنہائی کا عذاب سہہ رہا ہوں اور میرے اپنے وہاں۔'' وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔

''تمھیں نہیں لگتا کہ تم زیادہ جذباتی ہو رہے ہو؟''

''جذبے خوابوں سے زیادہ اہم ہوتے ہیں اور ویسے بھی تم تو کچھ بولو مت۔ نیم بے ہوشی میں بھی تم صرف اسی کا نام لے رہے تھے۔ اب بھی کہہ دو کہ یہ محبت نہیں ہے۔''

''نہیں..... یہ محبت ہی ہے۔ میں نے ہی سمجھنے میں دیر کر دی۔'' اس اعتراف نے اسے کتنا پرسکون کر دیا تھا یہ صرف وہ ہی جانتا تھا۔ یاسر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''یاسر میں جلد سے جلد واپس جانا چاہتا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بہت دیر ہو جائے۔'' اس کے لہجے میں کچھ کھو دینے کا ڈر تھا۔

''بے فکر رہو۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میری ڈاکٹر سے بات ہو چکی ہے۔ چار پانچ دن میں تمھیں ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ میں ذرا انکل کو فون کر کے آتا ہوں۔ تمھارے ایکسیڈنٹ کا پہلے اس لیے نہیں کیا تھا کہ وہ پریشان ہو جاتے۔ میں ابھی آیا۔'' وہ آہستہ سے اس کا ہاتھ تھپک کر باہر نکل گیا۔

اس نے اپنے آنے کی اطلاع کسی کو نہیں دی تھی۔ گھر میں اس وقت سوائے نوکروں کے کوئی نہیں ہوتا تھا۔ مام ڈیڈ دونوں کی روٹین سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے بیگ لاؤنج میں ہی چھوڑا اور گاڑی لے کر نکل پڑا۔ یہاں پہنچ کر سب سے پہلے اسے دیکھنے کی آرزو کشف کے گھر تک لے آئی تھی۔ لیکن گیٹ پر لگا تالا اس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر گیا۔ ایک موہوم سی امید کے تحت وہ اس کے آفس چلا آیا۔ لیکن وہاں سے ملنے والی اطلاع نے اسے بالکل ہی مایوس کر دیا۔ یونہی گاڑی میں ادھر سے ادھر بے مقصد پھرتے ہوئے شام سے رات ہو چلی تھی۔ آخر تھک کر اسے گھر لوٹنا پڑا۔ کمرے میں آ کر وہ بیڈ پر گر سا گیا۔

''کہیں میں نے اسے کھو تو نہیں دیا.....

نہیں۔'' اس کے اندر سے آواز آئی تھی اور وہ اٹھ بیٹھا۔

''اسے کھونے کا احساس ہی اتنا تکلیف دہ ہے اگر کہیں سچ مچ ایسا.....'' اپنی ہی سوچوں سے گھبرا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

سیل فون پر نظر پڑتے ہی اس نے بے تابی سے اسے اٹھایا اور اس کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ لیکن تین چار بار ٹرائی کرنے کے باوجود آپریٹر کا ہی ریکارڈ میسج سنائی دے رہا تھا۔ تنگ آ کر اس نے موبائل بیڈ پر پھینک دیا۔

آج بھی وہ مایوس ہی لوٹا تھا۔ لاؤنج سے گزرتے ہوئے ممی اور ڈیڈی کو اپنے انتظار میں بیٹھے دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

''اذعان بیٹھو ذرا ہمیں تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' حیدر صاحب نے اسے کہا تو ناچار اسے بیٹھنا پڑا۔

''بیٹا کوئی پرابلم ہے جب سے آئے ہو الجھے الجھے سے ہو۔'' انھوں نے نرمی سے پوچھا۔

''نو ڈیڈ سب ٹھیک ہے۔'' اس نے انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا لہجہ چغلی کھا گیا۔

''اگر سب ٹھیک ہے تو تم اتنے الجھے ہوئے کیوں لگ رہے ہو۔ کہیں تمھارا وینا سے کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟'' وہ بڑے پیار سے اس کے دل کا حال جاننے کی کوشش کر رہے تھے لیکن سلیمہ حیدر کا ضبط جواب دے گیا تھا اس لیے بول پڑیں۔

''آپ اس سے سیدھے سیدھے کیوں نہیں پوچھتے کہ اس نے وینا سے یہ کیوں کہا ہے کہ یہ اس سے شادی نہیں کر سکتا۔''

''اذعان تمھاری مام جو کہہ رہی ہیں کیا وہ صحیح ہے؟''

''یس ڈیڈ یہ سچ ہے میں وینا سے نہیں بلکہ.....'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''ہاں..... ہاں کہہ دو کہ تم اس دو ٹکے کی انٹیریر ڈیزائنر سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ کم از کم اپنے سٹینڈرز کا ہی کچھ خیال کیا ہوتا۔'' سلیمہ حیدر کا پارہ ایکدم چڑھ گیا تھا اور وہ سر جھکائے سنتا رہا۔

''کول ڈاؤن سلیمہ میں بات کر رہا ہوں نہ۔''

''اب بات کرنے سے کیا ہوگا؟ ہماری جو بے عزتی ہونی تھی وہ تو ہو چکی۔ میں تو شرمندگی کے مارے گھر سے نہیں نکل پا رہی ہوں۔ ہر ایک کی زبان پر تمھارا اور کشف کا نام ہے۔ وینا نے بھی اپنے ٹھکرائے جانے کا خوب بدلہ لیا ہے۔'' ان کا غصہ کسی طور سے کم نہیں ہونے پہ آ رہا تھا۔

''مام آپ سب کچھ کہہ چکی ہیں یا ابھی کچھ اور کہنا باقی ہے؟''

''اذعان ایک منٹ بیٹھو تو بیٹا۔''

''آپ لوگوں کا مجھ پر پورا حق ہے۔ آپ مجھے جو مرضی کہہ لیں میں بالکل برا نہیں مانوں گا لیکن کشف کی کوئی انسلٹ کرے یہ میں بالکل برداشت نہیں کروں گا۔ آج مام نے اس کے لیے جو الفاظ استعمال کیے ہیں اس کے بعد یہ تو طے ہے کہ وہ اس گھر میں نہیں آئے گی لیکن ایک بات میں آپ کو بتا دوں میں شادی صرف اسی سے کروں گا ورنہ کسی سے نہیں۔'' اس نے کہا اور فوراً ہی چلا گیا۔

''میرے خیال سے سلیمہ تم زیادہ ہی سختی سے پیش آ رہی ہو۔ جب زندگی اسے گزارنی ہے تو فیصلہ کرنے کا بھی حق اسے ہی ہونا چاہیے۔'' حیدر صاحب نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''لیکن حیدر.....''

''اس جھوٹی انا کے پیچھے میں پہلے ہی اپنے

بھائی کو کھو چکا ہوں۔ امی بابا نے بھی تو یہی غلطی کی تھی نہ۔ پھر کیا ہوا وہ مرتے مر گئے لیکن اس نے پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اذعان اسی کا پرتو ہے..... سوچ لو کیا تم میں اپنا بیٹا کھونے کا حوصلہ ہے۔'' وہ خود تو چلے گئے لیکن ان کے لیے سوچ کا ایک نیا در وا کر گئے۔

لنچ کے وقت ہی وہ آفس سے نکل آیا تھا اور اب وہ کتنی ہی دیر سے گاڑی میں بیٹھے بند دروازے کو گھور رہا تھا۔ اچانک سیل فون بج اٹھا۔

''ہیلو۔'' اس نے بے دلی سے کہا۔

''لگتا ہے اب تک دیدار نصیب نہیں ہوا۔'' دوسری طرف سے بشاشت سے پوچھا گیا تھا۔

''میری تمام راہیں مسدود کر کے جانے وہ خود کہاں گم ہو گئی ہے۔'' یاسر کی آواز سن کر اسے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔

''تو کیا اب تک تمھاری اس سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔'' دوسری طرف سے حیرانگی کا اظہار کیا گیا۔

''کیسے ملوں اس سے۔ گھر پر پچھلے تین دنوں سے تالا پڑا ہے، موبائل ریسپونس نہیں کر رہا اور جاب تو وہ کب کی چھوڑ چکی ہے۔'' اس کی نظریں اب بھی سامنے گیٹ پر ہی لگیں تھیں۔

''ہوں..... تو مسئلہ کافی سیریس ہے..... تم نے اس کے آس پاس کے گھروں سے پتہ کرنا تھا۔''

''پاگل ہوئے ہو پٹوانے کا ارادہ ہے کیا؟''

''اب اتنا رسک تو لینا ہی پڑے گا۔''

''اگر میں تمھاری بات مان بھی لوں تو میں پوچھوں گا کیا ان سے؟'' اب اس کی نظریں اس کے بالکل ساتھ بنے گھر پر ٹکی تھیں۔

''اب سارے آئیڈیے میں ہی نہیں دوں گا نہ کچھ اپنی عقل بھی استعمال کر لو۔''

''اچھا ٹھیک ہے میں کچھ کرتا ہوں۔'' اس نے فون آف کیا اور گاڑی سے باہر نکل آیا۔

دونوں گھر بالکل ایک جیسے تھے اور یہ بات اس نے آج پہلی بار نوٹ کی تھی۔ یاسر سے بات کر کے ایک موہوم سی امید پیدا ہوئی تھی اور اس نے بلا سوچے سمجھے بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد دھاڑ سے گیٹ کھلا۔

''اس گھر میں بہرے نہیں بستے۔'' اس نے چیخ کر کہا اور اذعان نے گھبرا کر بیل سے انگلی ہٹا دی۔

''آپ.....؟'' سمعیہ اسے سامنے پا کر حیران رہ گئی اور حیران تو وہ بھی رہ گیا تھا اپنی تقدیر پر جس نے اسے پھر سے امید کا سرا تھما دیا تھا۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'' اس نے اجازت طلب کی تو وہ نادم ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔

''آیئے نہ پلیز۔''

اندر آتے ہی اس کو یقین ہو گیا کہ اب منزل زیادہ دور نہیں ہے۔

''میرا خیال ہے یہیں لان میں بیٹھ جاتے ہیں۔'' اس نے لان میں پڑی چیئرز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جیسے آپ کی مرضی۔'' وہ اسے لے کر لان میں آ گئی۔

''آپ بیٹھیے میں ابھی آتی ہوں۔'' وہ ابھی جانے کے لیے پلٹی ہی تھی کہ اسے اتنی دیر سے غائب پا کر وہ خود باہر آ گئی۔

''سمعیہ کون.....؟'' لان میں براجمان شخص پر نظر پڑتے ہی اس کی زبان ہی نہیں قدم بھی رک گئے تھے اور اذعان کے چہرے پر مسکراہٹ تو اسے دیکھتے ہی لوٹ آئی تھی اور نظریں تو اس پر سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔

''کشف..... آؤ نا۔'' سمعیہ کے پکارنے پر وہ آہستہ روی سے چلتی ہوئی اس کے پاس آ گئی۔

''آپ دونوں باتیں کریں میں جب تک چائے لے کر آتی ہوں۔'' سمعیہ کو جاتے دیکھ کر اس نے روکنا چاہا لیکن وہ آنکھوں سے اشارہ کر کے چلی گئی تو ناچار اسے بیٹھنا پڑا۔

''آپ یہاں کیسے؟'' خود پر اس کی نظریں محسوس کر کے وہ براہ راست اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

''کشف تم نے جاب کیوں چھوڑ دی؟''

اتنے اتنائیت بھرے لہجے اور بدلے ہوئے طرز تخاطب پر اس نے چونک کر دیکھا۔ محبت کے رنگوں سے سجی وہ پرشوق نگاہیں اسی پر ٹکی تھیں۔ دل فوراً ہی بغاوت پر اتر آیا تھا لیکن اس نے نظریں جھکا لیں۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''

''کچھ سوال ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔'' اس نے ہاتھ میں پہنی چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

''جواب تو ہوتا ہے لیکن تم بتانا نہ چاہو تو اور بات ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آخر آپ اتنی معمولی سی بات کے لیے اصرار کیوں کر رہے ہیں؟'' اس نے الجھ کر دیکھا۔

''تم انکار جو کر رہی ہو۔''

''بس میرا دل چاہا تو چھوڑ دی۔'' اس نے زچ ہو کر کہا۔

''دل کی بہت سنتی ہو تم۔''

''اور آپ صرف دماغ کی سنتے ہیں۔'' اس بار اس نے باقاعدہ چڑ کر کہا اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''میرے بارے میں بہت جانتی ہو تم۔''

اس نے بہت گہری نظروں سے دیکھا اور وہ نظریں چرا گئی۔

''نہیں..... وہ.....'' وہ ایکدم کنفیوز ہو کر انگلیاں چٹخانے لگی۔

''کم از کم میرے سامنے تو تم جھوٹ بولنے کی کوشش بھی مت کرنا۔ یہ جو تمھاری آنکھیں ہیں نہ تمھارا ہر راز آشکار کر دیتی ہیں۔'' اس نے ذرا سا آگے جھکتے ہوئے کہا۔

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' وہ الجھ کر اسے دیکھنے لگی۔

''وہی جو تم سننا نہیں چاہتیں۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''اپنے ہی دل کی آواز سننے سے اتنا ڈرتی کیوں ہو تم؟''

''آپ کیا کہہ رہے ہیں میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا؟'' وہ جھنجلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''سمجھی نہیں یا سمجھنا نہیں چاہتی۔'' وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' وہ رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔

''ادھر میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو۔'' وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ تو بالکل غیر ارادی طور پر اس نے اس کی طرف دیکھا اور حیران رہ گئی۔ محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا اسے لگا کہ اگر وہ کچھ دیر اور دیکھتی رہی تو اس سمندر میں ڈوب جائے گی۔ اس نے فوراً ہی نظریں چرائیں۔

''کیا تمھیں اب بھی نہیں پتا چلا کہ میں کیا چاہتا ہوں؟ کیوں پاگلوں کی طرح پچھلے تین دنوں سے تمھیں ڈھونڈ رہا ہوں۔ کیوں میری ہر دعا بس ایک نام پر آ کر ٹھہر گئی ہے۔ کیوں میں تمھارے علاوہ کچھ اور سوچ نہیں پا رہا ہوں کیا اب بھی.....؟''

"اذعان صاحب پلیز۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

"آپ جانتے بھی ہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اگر وینا....."

"شی....." اذعان نے اچانک ہی اس کے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ دی تو وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"وینا میرا گزرا ہوا کل تھی..... لیکن میرا آج اور آنے والا کل صرف تم ہو..... مجھ سے شادی کرو گی؟"

اس کے اتنے واضح اظہار پر وہ ششدر رہ گئی تھی۔ زندگی میں بھی کوئی ایسا موڑ بھی آئے گا یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ جس محبت کو وہ دل میں دفن کر چکی تھی آج وہی محبت ہاتھ پھیلائے اس کے سامنے کھڑی اس کا ساتھ مانگ رہی تھی اور اس محبت سے دامن چھڑانا تو کل بھی اس کے لیے مشکل تھا اور آج تو ناممکن۔ سچائی ان آنکھوں میں رقم تھی اور خلوص اس کے لہجے سے بول رہا تھا۔ بے اختیار ہی وہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ گئی اور اس کی آنکھوں میں قندیلیں سی جل اٹھیں۔

"تم نے مجھ پر جو اعتبار کیا ہے میں اسے کبھی ٹوٹنے نہیں دوں گا۔" اذعان نے دوسرا ہاتھ بھی اس کے ہاتھ پر رکھ کر پریقین لہجے میں کہا۔

"جانتی ہوں۔" اس نے پراعتماد ہو کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"ویسے زیادہ جاننا کبھی کبھی نقصان دہ بھی ہوتا ہے۔" اس نے شوخی سے کہا تو کشف نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"اگر آپ دونوں کی باتیں ختم ہو گئیں ہوں تو کیا میں مخل ہونے کی اجازت مانگ سکتی ہوں۔" سمعیہ نے لان میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔

"ویسے مخل تو آپ ہو چکی ہیں لیکن خیر کوئی بات نہیں سالیوں کا بھی بہت حق ہوتا ہے۔" آخری جملہ اس نے کشف کے ذرا نزدیک ہو کر کہا اور وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

"آپ دونوں کے چہروں پر یہ جو ہزار ہزار واٹ کے بلب جل رہے ہیں اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ عنقریب ہمیں ایک شادی اٹینڈ کرنی پڑے گی۔" سمعیہ نے مسکراتے ہوئے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

"ارادے تو یہی ہیں لیکن آپ کی مدد درکار ہے۔" اذعان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بندی حاضر ہے۔" سمعیہ نے ذرا سا سر خم کر کے کہا۔

"تو پھر ہمارے مستقبل کو درخشاں کرنے کی کوشش شروع کر دیجیے۔"

"شروع تو کر دوں لیکن ایک مسئلہ ہے۔" سمعیہ نے اتنی سنجیدگی سے کہا کہ وہ پریشان ہو گیا اور کشف نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے منہ دوسری طرف کر لیا۔

"کیا کوئی سیریس پرابلم ہے؟"

"پرابلم تو ہے۔" اس کی سنجیدگی ہنوز برقرار تھی۔

"کیا.....؟"

"خالو خالہ امی کے ساتھ لاہور گئے ہوئے ہیں۔"

"کیوں.....؟" دھڑکنیں ایکدم ہی تیز ہو گئی تھیں۔

"وہ سعدیہ آپی کے چھوٹے دیور ہیں نہ..... ان کی منگنی ہے آج۔" اس نے ڈرامائی تاثر پیدا کرنے کے لیے رک رک کر کہا۔

"اف..... میں تو ڈر ہی گیا تھا۔" اس نے ایک گہرا سانس لیا اور وہ دونوں ہنس پڑیں۔

منگنی کا فنکشن گھر پر ہی ارینج کیا گیا تھا۔ کشف اور سمعیہ نے مل کر فنکشن ارینج کیا تھا۔ لائٹنگ تو پورے گھر میں ہی کی گئی تھی لیکن لان تو بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ ایک طرف صوفے رکھ کر اسٹیج سا بنایا گیا تھا اور باقی پورے لان میں کرسیاں بچھا دی گئی تھیں۔

منگنی کی رسم ادا کرنے کے بعد اسٹیج پر اب ان دونوں کے ساتھ بس سمعیہ ہی رہ گئی تھی۔ پنک اور وائٹ کمبی نیشن کے لہنگے میں اس کا بے پروا حسن قیامت ڈھا رہا تھا اور اذعان کے لیے اس پر سے نظریں ہٹانا مشکل ہو رہا تھا۔

"اذعان بھائی اب بس بھی کریں نظر لگائیں گے کیا؟" سمعیہ نے کہا تو وہ جھینپ کر سیدھا ہو بیٹھا۔

"محبت کرنے والوں کی نظر نہیں لگا کرتی۔" یاسر اچانک ہی اسٹیج پر آ کر اذعان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"کیوں محبت کرنے والوں کی آنکھیں نہیں ہوتیں کیا؟" سمعیہ نے چڑ کر کہا۔

"سنا تو یہی ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔" یاسر نے پرشوق نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"لگتا تو نہیں ہے۔" سمعیہ نے اسے گھورتے دیکھ کر تپ کر کہا تھا۔

"ویسے بائی داوے آپ کب تک شادی کا ارادہ رکھتی ہیں؟"

"کیوں.....؟"

"رشتہ بجھوانا ہے نہ۔" یاسر نے معصومیت سے کہا۔

"بہت ہی فضول ہیں آپ۔" وہ اسے گھورتی ہوئی اسٹیج سے ہی اتر گئی اور وہ تینوں ہنس پڑے۔

لان کے آخری سرے پر کھڑے جمال اور

ابنِ انشاء کی کتابیں

طنز و مزاح سفرنامے

- اردو کی آخری کتاب
- آوارہ گرد کی ڈائری،
- دنیا گول ہے،
- ابن بطوطہ کے تعاقب میں
- چلتے ہو تو چین کو چلیے،
- نگری نگری پھرا مسافر،

شعری مجموعے

- چاند نگر
- اس بستی کے اک کوچے میں
- دلِ وحشی

طنز و مزاح

- باتیں انشاء جی کی،
- دخل در معقولات،
- آپ سے کیا پردہ،
- بقلم خود،

لاہور اکیڈمی ۲۰۵ سرکلر روڈ لاہور

حیدر صاحب کی نظریں بھی ان دونوں پر ہی ٹکی تھیں۔

''مجھے خوشی ہے جمال کہ تم نے ماضی کی رنجشوں کو بنیاد بنا کر بچوں سے ان کی خوشیاں نہیں چھینیں۔'' حیدر صاحب نے دونوں کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''حیدر بھائی میں نے زندگی کو اپنی مرضی سے' اپنی شرطوں پر جیا ہے تو پھر میں کیسے اپنی بیٹی سے یہ حق چھین لیتا..... اور ویسے بھی گزرے ہوئے کل کے لیے ہم اپنا آنے والا کل تو قربان نہیں کر سکتے نہ۔'' جمال صاحب نے کہا تو انھوں نے اپنا ہاتھ ان کے کندھے پر رکھ دیا۔

''جمال میری ایک بات مانے گا۔'' ان کے تمہیدی انداز پر وہ چونک اٹھے۔

''میں جانتا ہوں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں..... لیکن حیدر بھائی جس دولت سے برسوں پہلے مجھے بابا جان نے بے دخل کر دیا تھا میں آج بھی اس پر اپنا حق نہیں سمجھتا۔ بابا جان کے اس حکم سے سرتابی مجھے آج بھی گوارا نہیں ہے۔'' ان کے صاف انکار پر وہ ایک گہری سانس بھر کر رہ گئے۔

''ٹھیک ہے جیسے تیری مرضی۔ لیکن اگر میں اپنی خوشی سے اپنی بیٹی کو کچھ دوں گا تو انکار نہیں کرے گا۔'' انھوں نے اتنے مان سے کہا کہ وہ انکار نہ کر سکے اور انھوں نے جمال صاحب کو گلے لگا لیا۔ برسوں کے بچھڑے بھائیوں کو اذعان اور کشف نے ملا دیا ہے۔

کپڑے چینج کر کے ابھی وہ لیٹی ہی تھی کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ ٹیبل لیمپ آن کر کے وہ اٹھ بیٹھی۔ نمبر دیکھ کر اس کے لب خود بخود مسکرا اٹھے۔

''ہیلو۔''

''آج تم بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔ جی چاہ رہا تھا کہ تمھیں سب کی نظروں سے چھپا کر کہیں دور لے جاؤں۔'' اس کی محبت میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی اور وہ ہنس پڑی۔

''ہوں..... میں نے تو سنا تھا کہ اذعان حیدر کو محبت کرنی نہیں آتی۔''

''تم سے مل کر آ گئی ہے۔'' اس نے بڑے آرام سے اعتراف کیا تھا۔

''اچھا جی۔''

''ہاں کشف..... محبت کیا ہے یہ میں نے تم سے مل کر جانا ہے۔ شاید میں ساری زندگی اس جذبے سے ناآشنا ہی رہتا اگر تم میری زندگی میں نہ آتیں۔ یہ تم ہی تو ہو جس نے مجھے محبت کرنا سکھایا ہے۔'' وہ ایک جذب کے عالم میں بول رہا تھا۔

''کیا میں آج آپ سے کچھ مانگ سکتی ہوں؟'' اس نے اچانک ہی کہا۔

''میں نے تو اپنی پوری زندگی تمھارے نام کر دی ہے پھر بھی اگر تم کچھ مانگنا چاہو تو.....''

''جہاں محبت زیادہ ہوتی ہے نہ وہاں اسے کھو دینے کا ڈر بھی زیادہ ہوتا ہے..... میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں لیکن اگر کبھی آپ کی محبت میں کمی ہوئی تو یہ میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔''

''ہمارا رشتہ جتنا نازک ہے اتنا ہی گہرا بھی ہے۔ بس تم اتنا یاد رکھنا بے شک ہم میں بہت کچھ متضاد ہے لیکن وہ ایک احساس جس نے ہم دونوں کو باندھ رکھا ہے وہ محبت ہے اور دلوں کو آپس میں باندھنے والی اس سے زیادہ مضبوط ڈور اور کوئی نہیں ہو سکتی۔'' اس نے یقین بھرے لہجے میں کہا اور اس کے یقین کی گواہی تو خود اس کا دل بھی دے رہا تھا تو پھر وہ کیسے اس کا اعتبار نہ کرتی۔

☆☆☆

مقدر کا ستارہ

سباس گل

''ارے اب اٹھ بھی جاؤ سورج سر پر آ گیا ہے۔'' انجم آراء نے گرجدار آواز میں دونوں بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی رضی کے اوپر سے چادر بھی کھینچ لی۔

''سونے دیں نہ اماں۔'' رضی نے چادر پس کھینچتے ہوئے نیند میں ڈوبی آواز میں کہا۔

''چل اٹھ شش مارا۔'' اماں چادر دبوچے ہوئے بیٹے بجی کی چارپائی کی طرف بڑھ گئیں۔ پیچھے سے رضی نے اٹھانے پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

''اماں اتنا اچھا خواب دیکھ رہا تھا میں آپ نے ایویں جگا دیا۔''

''خواب ہی دیکھتے رہنا کوئی جاب نہ دیکھنا ہو۔ چل اٹھ جا کے منہ دھو۔''

''مگر کس کا۔'' وہ شاید ابھی تک نیند میں ہی تھا۔

''بتاؤ کس کا؟'' انجم آراء کا ہاتھ اپنے بیٹے کی طرف گیا تھا کہ وہ چارپائی سے کود گیا۔

''جا رہا ہوں اماں۔''

''اے لو تو پھر سونے لگا۔ کتنی دفعہ کہا ہے کہ سویرے اٹھا کر۔'' انجم آراء نے بجی کو پھر چادر میں منہ چھپاتے دیکھ کر ڈپٹا۔

''میں کوئی پرندہ تھوڑی ہوں اماں۔'' بجی نے جواب آیا۔

''ارے پرندے تو تم سے بہت اچھے ہیں سویرے جاگ جاتے ہیں۔ انھیں سے سبق لو تم لوگ۔'' انجم آراء نے چادر کی تہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''اماں سبق سے تو ہمیشہ میری جان جاتی ہے۔'' بجی نے دھڑلے سے کہا۔

''یہ کسی سے کچھ نہیں سیکھ سکتا۔ حتیٰ کہ اپنے باپ سے بھی نہیں۔'' رضی بولا۔

''تیرا بھائی جو ہوا۔'' اب کے اماں نے بھی کسا تھا۔

''ہیں۔'' رضی نے حیرت سے انھیں پھیلائیں۔

''ہاں اچھا اب نہا لے ورنہ ناشتہ نہیں دوں گی اور کھائے گا کیا تو ناشتے میں؟''

''چغلی۔'' رضی بے ساختہ بولا۔ بجی کے سارے دانت باہر جھانکنے لگے۔

''بس بہت بک بک کر لی اب ایک دفعہ بتا دو کہ ناشتے میں کیا کھاؤ گے؟'' انجم آراء نے باورچی خانے کی طرف رخ کرتے ہوئے پوچھا۔

''مار۔'' بجی کی رگ ظرافت پھر پھڑکی۔

''اچھا تو آج چولہا نہ جلاؤں بیٹا۔'' انجم آراء نے بجی کو بڑے پیار سے گھورتے ہوئے کہا۔

''نہ جلائیں اماں ہمارے دل جل رہے ہیں انھیں پر کچھ پکا لیں گے۔'' رضی نے جواب دیا تو انجم آراء بھڑک کر بولیں۔

''کیلا خاک پکاؤ گے ہر وقت تو خیالی پلاؤ پکاتے ہو تم کبھی اصلی پلاؤ کے لیے بھی پیسے کما کر لاؤ تو تب میں مانوں۔''

''کہ ہم آپ کے بچے ہیں۔'' بجی مسکراتے ہوئے بولا۔

''میرے بچے تو صرف باتیں کرتے ہیں کام نہیں کرتے۔''

''اماں کام ملے گا تو وہ بھی کر لیں گے۔'' رضی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''ارے بیٹا ڈھونڈنے والوں کو تو دنیا بھی نئی ملتی ہے۔ تمھیں ایک نوکری نہیں ملتی۔''

''بھائی جان اماں جان تو شاعری پر اتر آئی ہیں۔'' بجی ہنسا۔

''تو بھی اب پلنگ سے اتر جا ورنہ پٹے گا میرے ہاتھوں اور کل سے مسجد میں جا کے نماز پڑھا کر سمجھا۔'' انجم آراء نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''اماں ہمارے ہاں مسجد میں نمازیں اتنی نہیں ہوتیں جتنے دھماکے اور فائرنگ ہوتی ہے۔'' بجی نے انگڑائی لے کر پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اے ماشاء اللہ اب تو حالات بہت اچھے ہیں۔'' انجم آراء نے جواب دیا۔

''میرے جانے سے برے ہو جائیں گے۔''

''اے وہ کیوں؟''

''میں پچھلے جمعے نماز پڑھنے گیا تو مولوی صاحب کہنے لگے میاں مسلمان ہو تو داڑھی کیوں نہیں رکھتے فوراً داڑھی رکھو۔'' بجی نے بتایا۔

''یہی تو ہمارا المیہ ہے ہمارے علماء نے اسلام کو داڑھی اور دوپٹے سے مشروط کر دیا ہے جبکہ صورت حال یہ ہے کہ داڑھی والوں کا مغربی دنیا میں انتہائی خراب امیج بن گیا ہے۔ وہ لوگ ہر داڑھی والے کو دہشت گرد سمجھتے ہیں اور حجاب یا دوپٹہ لے کر گھر سے باہر نکلنے والی عورت جب بے پردہ، بے حجاب کر دی جاتی ہے اس کے سر سے مسلمان مرد ہی دوپٹہ اور چادر اتار پھینکتے ہیں۔ مسلمان اپنے طرز عمل سے بدنام ہو رہے ہیں اس ملک کو اور مذہب اسلام کو بھی بدنا کر رہے ہیں۔ اسلام کی اصل روح سے ہم لوگ کوسوں دور چلے گئے ہیں۔ یہی ہمارے انتشار اور تنزل کا سبب ہے۔'' رضی نے نہایت سنجیدگی سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''یہ سب تو ٹھیک ہے بیٹا مگر تم دونوں کو کسی مولوی یا ملا کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے ارے ان کی بات سے تو ذرا سا اختلاف کرو جھٹ سے فتویٰ جاری کر دیں گے۔'' انجم آراء نے سنجیدہ لہجے میں انھیں سمجھایا۔

''ادھر دیکھیں بھائی جان نلکا جاری ہو گیا پانی دھڑا دھڑ برس رہا ہے ابر رحمت کی طرح جلدی سے فیض یاب ہو جائیں میرا مطلب ہے کہ غسل فرما لیں۔'' بجی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کافی دیر ہو گئی ہے تمھارے ابا سبزی منڈی گئے تھے ابھی تک نہیں آئے۔ اب تو سبزی کی قیمتوں کو بھی آگ لگی ہے۔ سبزی سونے کے بھاؤ بک رہی ہے۔'' انجم آراء کو اب شوہر کی اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کی فکر لاحق ہو گئی۔

''اس کا مطلب ہے ہم سونا کھا رہے ہیں۔'' بجی مسکراتے ہوئے بولا۔

''السلام علیکم خالہ۔'' اتنے میں ستارہ نے گھر میں قدم رکھتے ہوئے انجم آراء کو دیکھ کر سلام کیا تو غسل خانے سے نکلتا گیلے بالوں کو تولیے سے رگڑتا رضی اسے دیکھ کر اماں سے پہلے اس کے سلام کا جواب دینے لگا۔

''وعلیکم السلام ورحمتہ وبرکاتہ۔''

''تم خالہ کب سے ہو گئے؟'' ستارہ نے اسے پانی کے قطروں سے چمکتے وجیہہ چہرے کو دیکھتے ہوئے تنک کر پوچھا تو جواب میں رضی کی گھورتی آنکھیں اور بجی کے پورے بتیس دانت باہر تھے۔

''ستارہ بیٹی خیر سے آئیں۔'' انجم آراء اپنی خوبصورت اور لاڈلی بھانجی کو دیکھ کر خوشی سے مسکراتے ہوئے محبت سے بولیں۔

''خالہ امی کہہ رہی ہیں کہ تھوڑی سی چائے کی پتی دے دیں۔''

''اچھا ابھی لائی۔'' انجم آراء باورچی خانے میں چلی گئیں۔

''تہ تم اپنی امی کا نام لے کر کچھ نہ کچھ روز روز مانگنے آ جاتی ہو تم یہیں کیوں نہ آ جاتیں۔''

''یہاں آ کر کیا کروں گی؟'' ستارہ کے دل میں ہلچل سی مچ گئی تھی اس کی بات سے۔

''میرے لیے مزے مزے کے کھانے پکانا۔'' وہ وارفتگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کبھی سنجیدہ بھی ہو جایا کرو۔'' وہ تپ کر

بولی۔

''تمھارے معاملے میں۔'' وہ شوخی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''رضی میرا پرپوزل آیا ہوا ہے۔'' وہ نظریں جھکا کر جھجکتے ہوئے بولی۔

''اے میرے ہوتے ہوئے تم کسی اور کو قبول کرو گی۔'' وہ اب بھی مذاق کے موڈ میں تھا۔

''تم خود کو میرے امی ابو کی نظروں میں قابل قبول داماد بنا لو تو بہتر ہے ورنہ میری شادی میں شامیانے لگاتے اور کرسیاں اٹھاتے نظر آؤ گے۔''

''نہیں۔'' وہ فلمی انداز میں چیخا تو اسے ہنسی آ گئی۔

''پورے جوکر ہو تم۔''

''لو بیٹا ستارہ چائے کی پتی لے لو۔'' انجم آراء ایک پلاسٹک کے شاپر میں پتی ڈال کر لے آئیں۔

''شکریہ خالہ۔'' ستارہ نے شاپر ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

''ہونہہ۔'' وہ اپنی چٹیا پیچھے کرتے ہوئے بڑی ادا سے جانے کے لیے مڑی تھی۔ انجم آراء اور تجی باورچی خانے میں جا چکے تھے۔ رضی نے ستارہ کو پیچھے سے پکارا۔

''سنو ستارہ۔''

''کیا ہے؟'' وہ واپس پلٹی۔

''کل انٹرویو ہے میرا۔'' رضی نے سنجیدگی سے بتایا۔

''اچھا کون سے ٹی وی چینل سے نشر ہوگا؟'' وہ شرارت سے بولی۔

''بے روزگاری کے چینل سے۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔

''اوہ تو کل پھر کسی جاب کے لیے انٹرویو دینے جا رہے ہیں جناب رضی راؤ صاحب۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی تو اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''ہاں تم دعا کرنا کہ میں کامیاب ہو جاؤں پورے دس ہزار روپے تنخواہ ہے اور اچھی کارکردگی دیکھ کر تین ماہ بعد ہزار بارہ سو کا مزید اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ ستارہ اگر یہ ملازمت مجھے مل گئی تو سمجھو تم مجھے مل گئی۔ تمھارے امی ابو کو پھر مجھ سے بہتر داماد کہیں نظر نہیں آئے گا ہاں۔''

''ٹھیک ہے میں ضرور دعا کروں گی کیونکہ میری دعا کے بغیر تو تمھارا کام بنے گا ہی نہیں۔'' ستارہ نے اپنی چٹیا لہراتے ہوئے بڑی ادا سے کہا۔

''ہاں بھئی تم اللہ کی محبوب بندی جو ٹھہریں۔'' رضی نے اسے مکھن لگایا۔

''صرف اللہ کی۔'' ستارہ نے اسے گھورا۔

''بدقسمتی سے میری بھی۔'' وہ سر کھجاتا ہوا مذاق سے بولا۔

''بدقسمتی ہے تو پھر مجھ سے دور ہی رہنا۔'' وہ اس کا مذاق سمجھ گئی مگر خود بھی جواب دینے سے باز نہ آئی۔

''ہائے نئیں۔'' وہ دل پر ہاتھ رکھ کر اس انداز سے بولا کہ اس کی ہنسی نکل گئی اور دوسرے ہی پل وہ ان کے گھر سے باہر تھی۔ اسی وقت راؤ حامد علی سبزی کی بوری اپنی سائیکل پر رکھے اندر داخل ہوئے۔ رضی نے بوری دیکھتے ہی پوچھا۔

''ابا اتنی ساری سبزی کیا مفت بٹ رہی تھی؟''

''بیٹا مفت تو یہاں صرف گالیاں اور خیرات ہی بٹتی ہے۔'' ابا نے جواب دیا اور سائیکل کھڑی کر کے انجم آراء کو آوازیں دیتے باورچی خانے میں چلے گئے۔ آج چھٹی تھی اور چھٹی کے دن ان کے گھر میں یہی ہنگامہ ہوتا تھا۔

راؤ حامد علی اور انجم آراء کے دو ہی بیٹے تھے رضی اور تجی۔ رضی چوبیس سال کا تھا اور تجی بیس سال کا۔ حامد علی صاحب ایک سرکاری محکمے میں پچیس سال پہلے کلرک بھرتی ہوئے تھے اور اب وہ ہیڈ کلرک تھے۔ انھوں نے بڑی محنت سے دونوں بچوں کو تعلیم دلوائی تھی۔ رضی کو ایم بی اے کرایا تھا جبکہ اس نے کچھ کمپیوٹر کورس بھی علیحدہ سے کر لیے تھے۔

تجی نے بی۔ ایس۔ سی کا امتحان دیا تھا۔ انجم آراء نے گھر بڑے سلیقے سے چلایا تھا۔ مکان سرکاری تھا۔ حامد علی کے پاس اچھے وقتوں میں خریدا چھ مرلے کا ایک پلاٹ تھا وہ اس پر گھر بنانے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ جمع کرتے رہے تھے مگر آج کے دور میں گھر بنانا کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ مہنگائی اور بے روزگاری کا اژدھا عام آدمی کے سارے سنہرے خواب نگل جاتا ہے۔

رضی تقریباً ڈیڑھ سال سے ملازمت کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا مگر ملازمت صرف رشوت اور سفارش والوں کو ملتی تھی۔ وہ ذہین تھا اس کا تعلیمی ریکارڈ بھی بہت اچھا تھا۔ پھر بھی اسے نوکری نہیں ملی تھی۔ وہ ایک کمپیوٹر شاپ میں روزانہ دو گھنٹے ڈیوٹی دینے پر ماہانہ دو ہزار روپیہ کما رہا تھا جو اس کی اپنی ضروریات کے لیے تو کافی ہی تھا۔ اماں ابا سے اپنی ضرورت کے لیے پیسے مانگنا اب اسے بھی اچھا نہیں لگتا تھا اور وہ فضول خرچی بھی نہیں کرتا تھا۔

ستارہ اس کی خالہ عالم آراء کی بیٹی تھی۔ ستارہ کے علاوہ ان کا ایک بیٹا توشیق بھی تھا وہ ابھی پڑھ رہا تھا۔ ستارہ کے والد راؤ طارق بھی سرکاری محکمے میں ملازم تھے۔ گزر اوقات ٹھیک ہو رہی تھی۔ ستارہ نے بی۔ اے بی۔ ایڈ اور سی۔ ٹی کیا تھا۔

رضی اور ستارہ کا چونکہ بچپن کا ساتھ تھا اس لیے دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت بھرے جذبات عمر کے ساتھ ساتھ پروان چڑھے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے لڑتے بھی بہت تھے مگر ایک دوسرے کو ناراض بھی نہیں کر سکتے تھے۔ دونوں گھروں کے بڑے ان کی شادی کے خواہشمند تھے مگر رضی کی بے روزگاری آڑے آ رہی تھی۔ جس نے خود رضی کو پریشان کر رکھا تھا۔ بظاہر وہ ہنستا بولتا رہتا تھا مگر اندر سے اپنی بے بسی پر بے روزگاری پر کڑھتا تھا۔

رضی انٹرویو دے کر گھر آیا اور خاموشی سے سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ستارہ اس کے انٹرویو کا رزلٹ جاننے کے انتظار میں وہاں موجود تھی۔ وہ اسے دیکھ کر لمحے بھر کو رکا پھر گہرا سانس لبوں سے خارج کر کے بولا۔

''ستارہ میں باہر جا رہا ہوں۔''

''جاؤ دروازہ کھلا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''میں ملک سے باہر جا رہا ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''تو ایئرپورٹ پر ہی دہشت گردی کے الزام میں القاعدہ سے تعلق کے جرم میں دھر لیے جاؤ گے۔'' وہ مسلسل مذاق کر رہی تھی اور وہ سنجیدہ تھا۔

''تم تو یہی چاہتی ہو نا۔'' وہ خفگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کاش تم سمجھ سکو کے میں کیا چاہتی ہوں۔'' وہ آہ بھر کر بولی اور جانے لگی تو اس نے سامنے آ کر راستہ روک لیا۔

''پوچھو گی نہیں کے انٹرویو کیسا ہوا؟''

''وہی تو پوچھنے آئی تھی تم نے آتے ہی نیا شوشہ چھوڑ دیا۔ اچھا بتاؤ کیسا رہا انٹرویو؟''

''ہمیشہ کی طرح اے ون اور رزلٹ بھی

ہمیشہ کی طرح صفر ہی نکلے گا یہ بھی مجھے معلوم ہے۔'' وہ زخمی لہجے میں بولا۔

''ہرگز نہیں اس بار تمھیں جاب ضرور ملے گی میں نے منت مانی ہے پورے سو نفل ادا کروں گی۔ تم بھی اللہ سے دعا کرو۔'' ستارہ نے یقین سے کہا۔

''رضی آ گیا تو۔'' انجم آراء اس کی آواز سن کر کمرے میں چلی آئیں۔

''جی آ گیا اور اب باہر جانے کی بات کر رہا ہے۔ خالہ ملک سے باہر۔'' ستارہ نے بتایا۔

''کیوں رضی یہ میں کیا سن رہی ہوں؟'' انجم آراء نے اسے بغور دیکھا۔

''ٹھیک سن رہی ہیں اماں۔ یہاں بہت تلاش روزگار کر لی۔ آج انٹرویو دے کر واپس آ رہا تھا تو میرا ایک کالج فیلو مجھے اچانک مل گیا اس کے بھائی کا اور اس کا شارجہ میں ریسٹورنٹ ہے انھیں ایک ایماندار ملازم کی ضرورت ہے میں نے اپنی بے روزگاری کا کمال سے ذکر کیا تو اس نے مجھے شارجہ میں جاب آفر کر دی اور میں نے قبول بھی کر لی ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے ساری تفصیل بتائی۔

لوگ جاتے ہیں کیوں سمندر پار
اپنی مٹی میں کیا برائی ہے

ستارہ نے بڑے تاسف زدہ لہجے میں کہا تو وہ تپ کر بولا۔

''برائی اس مٹی میں نہیں ہے ان میں ہے جو اس مٹی کو خراب کر رہے ہیں۔ جو مجھ جیسے نوجوان کے دل میں وطن سے دوری کا خیال پیدا کر رہے ہیں۔ ٹھیک ہے اگر ہمارے لیے یہاں ملازمت نہیں ہے تو ہم ملک سے باہر کوشش کر سکتے ہیں۔ نئے آسمان تلاش کرنے کا حق تو رکھتے ہیں نہ ہم بھی۔''

''بیٹا تیرا آسمان یہاں ہے اس آسمان پر تیرے مقدر کا ستارہ جگمگا رہا ہے۔'' انجم آراء نے کہا۔ وہ ان کی ذو معنی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ ستارہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اماں ستارہ سے آگے اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں''

''اور اماں اپنے پاکستان کی آسمان پر روزگار کا ستارہ نہیں ہے۔ میں کسی اور آسمان پر پرواز کرنا چاہتا ہوں۔''

''پیرا شوٹ ساتھ لے جانا مت بھولنا کیونکہ پرائے آسمان میں طاقت پرواز ملتی ہے نہ پناہ۔ ویسے بائی دی وے رضی صاحب آپ وہاں ریسٹورنٹ میں کیا بیرا گیری کریں گے؟'' ستارہ نے سنجیدگی سے پوچھا تو وہ بھی سنجیدہ مگر تلخ لہجے میں بولا۔

''بیرا گیری بھی کرنا پڑی تو کر لوں گا کیونکہ یہاں رہ کر تو اب صرف دادا گیری یا رسہ گیری ہی کی جا سکتی ہے۔''

''یہ ہے بے روزگاری کی کاریگری صد افسوس۔'' ستارہ نے تاسف سے کہا۔

''اماں میری تعلیمی ریکارڈ کی فائل واپس مت رکھیے گا۔ مجھے پاسپورٹ بنوانا ہے کچھ ضروری معلومات نوٹ کرنی ہیں۔'' رضی نے سنجیدگی سے کہا۔

''تو جائے گا کیسے؟ اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا؟'' اماں نے افسردگی سے پوچھا۔

''اپنے خرچ پر لے جائے گا۔''

''رضی وہ فراڈ بھی تو ہو سکتا ہے۔ آج کل اخبارات میں کیسی خوفناک خبریں آ رہی ہیں ملک سے باہر جانے والے پاکستانیوں کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک ہو رہا ہے۔ ایجنٹ پیسے بھی کھا لیتے ہیں اور جانے والوں کو یا تو سمندر برد کر دیتے ہیں یا غیر قانونی داخلے پر دوسرے ملک کی پولیس انھیں گرفتار کر لیتی ہے۔ کالج فیلو کی

بات تمھیں اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیے رضی۔'' ستارہ نے سنجیدگی سے سمجھایا۔

''معلومات اور نصیحت کا شکریہ ستارہ بی بی۔'' وہ اسی لہجے میں بولا۔ تو وہ دکھی ہو گئی۔ رضی کو اتنا تلخ اور سنجیدہ تو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''اور تو جو آج انٹرویو دینے گیا تھا کیسا رہا؟'' انجم آراء نے پوچھا۔

''بہت اچھا۔''

''یہ تو تو ہر دفعہ ہی کہتا ہے پر نتیجہ وہی صفر کا صفر۔'' انجم آراء بولیں۔

''اس ملک میں زندگی سستی اور نوکری مہنگی ہو گئی ہے۔ لوگ خودکشی کر رہے ہیں۔ غلط اور ناجائز ذرائع سے پیسہ کما رہے ہیں۔'' وہ اسی لہجے میں بولا۔

''نہ تو ایسے کسی کام میں نہ پڑ بس اللہ پر بھروسہ رکھو اور نوکری کی تلاش جاری رکھو پھر میں ستارہ کو بیاہ کر تیری دلہن بنا کر اس گھر میں لے آؤں گی۔'' انجم آراء نے اس کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی خاطر کہا۔

''بہت پیاری ہے یہ آپ کو؟'' رضی نے حیا سے گلنار ہوتی ستارہ کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے انجم آراء سے پوچھا تھا۔

''پیاری کیوں نہیں ہو گی سگی بھانجی ہے یہ میری مجھے پیاری نہیں ہو گی تو اور کسے ہو گی۔'' انجم آراء نے ستارہ کے چہرے کو چھوتے ہوئے دل سے کہا۔ وہ شرما گئی۔

''پیاری تو یہ مجھے بھی ہے اماں اور اسی لیے میں اسے اس گھر میں لا کر فاقے نہیں کروانا چاہتا۔ ضروریات زندگی کے لیے ترسانا نہیں چاہتا۔ آپ کیا چاہتی ہیں کہ میں اسے اس بے روزگاری میں بیاہ لاؤں پیار کو آزار سمجھنا شروع کر دوں نو نیور۔'' وہ غصے سے کہتا کمرے سے ہی نہیں گھر سے بھی باہر نکل گیا۔

''خالہ جب آپ اس کی ماں ہو کر اس کی کوششوں پر اس کی نیت پر شک کریں گی اسے اس طرح گھر آتے ہی برا بھلا کہیں گی تو اسے دکھ بھی ہو گا اور غصہ بھی آئے گا۔ بے چارہ سینکڑوں جگہ درخواستیں اور انٹرویو دے چکا ہے اب اگر نوکری نہیں ملتی تو اس میں رضی کا تو کوئی قصور نہیں ہے نا وہ تو خود بہت پریشان ہے اپنی بے روزگاری کی وجہ سے اوپر سے آپ اسے نکھٹو بیکار کہتی رہتی ہیں تو وہ تنگ آ کر کچھ بھی کر سکتا ہے خالہ گھر سے باہر تو اسے حوصلہ شکنی اور ناکامی کا سامنا ہے تو کم از کم گھر میں تو اسے حوصلہ دینے والے ہونے چاہئیں ناں آپ کے اس رویے سے تو وہ بالکل ہی دلبرداشتہ ہو جائے گا۔'' ستارہ نے انھیں سنجیدگی سے سمجھایا۔

''ہاں میرا رضی محنتی تو بہت ہے خوددار بھی ہے مجھ سے اپنی ضرورت کے واسطے کبھی پیسے نہیں مانگتا۔ میں نے ناحق اسے ڈانٹ دیا۔ اب اگر وہ ملک سے باہر چلا گیا تو؟'' انجم آراء روتے ہوئے بولیں۔

''خالہ ملک سے باہر جانا اتنا آسان تھوڑی ہے آپ فکر نہ کریں اس کی کامیابی کے لیے دعا کریں۔ میں اب چلتی ہوں۔'' وہ انھیں تسلی اور حوصلہ دے کر آ گئی مگر گھر آتے ہی بے چینی اور بے قراری نے اس کے اندر ڈیرے ڈال لیے۔ رضی اس سے پیار کرتا ہے یہ اعتراف اس کی آنکھوں اور باتوں سے تو اکثر ہوتا تھا۔ مگر آج وہ غصے میں جس طرح اپنی زبان سے اعتراف کر گیا تھا یہ ستارہ کے لیے خوشی کا باعث بھی تھا اور اس کے ملک سے باہر جانے کا ارادہ پریشانی کا باعث۔

دو دن اسی پریشانی میں گزر گئے۔ نہ رضی ان کے گھر آیا تھا نہ ہی اس کی اور شجی کی صبح و شام

جاری رہنے والی جملہ بازی اسے سننے کو ملی۔ وہ مزید پریشانی ہوگئی۔ اور اس کی پریشانی انجم آراء نے گھر آ کر دور کر دی۔ انجم آراء کے ساتھ راؤ حامد علی اور شجی بھی آئے تھے اور وہ مٹھائی اور ستارہ کے لیے منگنی کی انگوٹھی لے کر آئے تھے۔ انھوں نے رضی کو شارجہ جانے سے روکنے کے لیے اس کے پیروں میں ستارہ سے نسبت کی زنجیر ڈالنے کا فیصلہ کیا تھا۔

راؤ طارق اور عالم آراء سے پہلے ہی معاملہ طے پا چکا تھا۔ لہذا سادگی سے منگنی کی انگوٹھی انجم آراء نے ستارہ کی انگلی میں پہنا دی۔ اس منگنی کی خبر سے رضی قطعی بے خبر تھا۔ شام کو جب وہ گھر آیا تو چائے کے ساتھ اسے ایک پلیٹ میں مٹھائی بھی پیش کی گئی تو اس نے شجی سے پوچھا۔

''یہ مٹھائی کس خوشی میں کھلائی جا رہی ہے؟''

''ستارہ کی منگنی کی خوشی میں۔'' شجی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو رضی کا چہرہ مرجھا گیا۔ دل بہت بے قراری سے دھڑکا تھا۔

''ستارہ کی منگنی ہوگئی ہے کیا؟''

''جی ہاں آج ہی ہوئی ہے۔''

''وہ خوش ہے؟'' رضی کے دل میں آنسو ابل پڑے تھے۔ یہ بے روزگاری اسے اس کی جان سے پیاری ہستی سے دور کر رہی تھی۔

''ایسی ویسی۔'' شجی نے جوشیلے لہجے میں جواب دیا۔

''چلو وہ خوش ہے تو ہم بھی خوش ہیں۔'' رضی نے گلاب جامن اٹھا کر منہ میں ڈال لی۔ اندر جو طوفان اٹھا تھا یہ تو وہی محسوس کر سکتا تھا۔

''خوش تو آپ کو ہونا ہی چاہیے جانتے ہیں ستارہ کی منگنی جن صاحب سے ہوئی ہے وہ صاحب کون ہیں؟''

رضی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میرے پیارے ہینڈسم بھائی جان جناب رضی راؤ صاحب ہیں وہ۔'' شجی نے مسکراتے ہوئے انکشاف کیا تو جیسے رضی کو پھر سے نئی زندگی مل گئی۔ اس کے جسم میں روح پھونک دی تھی اس ایک جملے نے۔ اس نے یقین اور بے یقینی کی سی کیفیت میں شجی کو دیکھا۔

''کیوں ہے نا آپ کے خوش ہونے کی بات۔'' شجی نے شوخ و شریر لہجے میں پوچھا۔

''ایسی ویسی۔ اب تو میں یہ ساری مٹھائی کھاؤں گا۔'' رضی نے خوشدلی سے ہنستے ہوئے کہا اور مٹھائی کی پلیٹ اٹھالی۔

منگنی کی رسم ہوئے بھی دس دن گزر گئے تھے۔ لیکن رضی نے ستارہ سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی اور وہ شرم کے مارے اس کی طرف نہیں جا سکی تھی۔ یہ ری کی خاموشی اور بے رخی اسے پریشان کر رہی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ شارجہ سچ مچ ہی نہ چلا جائے۔ کھڑکی صاف کرتے ہوئے اس نے رضی کو گھر کی طرف جاتے دیکھا تو خود ہی انجم آراء کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔

''رضی کہاں تھا تو سارا دن یہ تیرا خط آیا رکھا ہے۔'' انجم آراء نے اسے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر کہا اور ساتھ ہی ایک سفید رنگ کا لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''اماں میں پاسپورٹ کے آفس گیا تھا میرا پاسپورٹ بن گیا ہے۔''

''تو کیا تو چلا جائے گا شارجہ؟'' انجم آراء نے افسردگی سے پوچھا۔

''ظاہر ہے اور میں یہ سب کس لیے کر رہا ہوں۔'' وہ لفافہ کھولتے ہوئے بولا تو انجم آراء کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کے دم سے تو گھر میں رونق

تھی وہ چلا گیا تو ویرانی چھا جاتی۔ انجم آراء میں بیٹے کی دوری سہنے کا حوصلہ نہیں تھا وہ پریشان ہو گئیں اور کہنے لگیں۔

''دیکھ رضی مت جا ادھر ہی نوکری مل جائے گی تجھے۔''

''نوکری تو مل گئی ہے اماں۔'' وہ لفافے میں موجود اپائنمنٹ کا پروانہ پڑھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیا سچ؟'' انجم آراء خوشی سے بولیں۔

''جی ہاں وہ جو انٹرویو دیا تھا نا میں نے وہ نوکری مجھے مل گئی ہے مگر اب تو میں جا رہا ہوں۔'' اس نے خط لفافے میں بند کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹا اب تو تجھے نوکری بھی مل گئی ہے اب تو نہ جا شارجہ۔''

''اماں قسمت آزمانے میں کیا حرج ہے ایسے موقعے روز روز تھوڑی ملتے ہیں۔''

''بیٹا نوکریاں بھی روز روز نہیں ملتیں جو مل گئی ہے اس پر اللہ کا شکر ادا کر اور یہیں دل لگا کے کام کر۔''

''کام ہی کروں گا اماں اور دل لگا کے کروں گا آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔'' رضی نے کولر میں سے گلاس میں پانی بھرتے ہوئے کہا۔

''بیٹا ہم تیرے بغیر نہیں جی سکیں گے ہم سے تیری دوری برداشت نہیں ہوگی۔'' انجم آراء نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور روتے ہوئے کہا تو وہ پانی پی کر بولا۔

''اماں ایسا کچھ نہیں ہوگا شروع میں مشکل ہوتی ہے بعد میں انسان عادی ہو جاتا ہے۔

''تو رہ لے گا ہمارے بغیر؟ ماں باپ بھائی کے بغیر اور اپنی ستارہ کے بغیر؟'' انجم آراء روتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔ اس کے دل میں جھکڑ چلنے لگے۔ ستارہ کے نام پر اسے اپنے اندر ایک بے قراری اور بے چینی سی سرایت ہوتی محسوس ہوئی اور وہ ان کی بات کا جواب دیئے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''السلام علیکم خالہ۔'' ستارہ نے آنگن میں قدم رکھا۔

''جیتی رہو بیٹی اچھا کیا آ گئیں۔'' انجم آراء نے اسے دیکھ کر کہا۔

''کیا ہوا خالہ آپ رو رو کیوں رہی ہیں؟''

''ستارہ بیٹا وہ جا رہا ہے شارجہ آج ہی اس کی نوکری کا خط آیا ہے۔ اب تو اسے نوکری بھی مل گئی ہے وہ پھر بھی شارجہ جا رہا ہے اس نے تو پاسپورٹ بھی بنوا لیا ہے۔ بیٹا ہم اس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ستارہ بیٹا اب تم ہی اسے روک سکتی ہو۔ اسی سے بات کرو شاید وہ تمھاری بات مان جائے۔'' انجام آراء روتے ہوئے بولیں۔

''اچھا خالہ میں دیکھتی ہوں آپ حوصلہ رکھیں۔'' وہ اپنی اذیت چھپاتے ہوئے ان سے کہہ کر رضی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''تو رضی تمھیں مجھ سے منگنی کی خوشی نہیں ہوئی کیونکہ تم تو باہر جانے کی تیاریوں میں مگن تھے۔'' ستارہ نے دل میں اس سے کہا اور اس کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ وہ وارڈروب میں سے اپنے کپڑے نکال نکال کر بستر پر پھینک رہا تھا۔ کل آفس جانے کے لیے اسے کسی مناسب لباس کی تلاش تھی لیکن ستارہ یہی سمجھی کہ وہ شارجہ جانے کے لیے اپنا سامان پیک کر رہا ہے۔ اسی لیے کپڑے نکال رہا ہے۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔

''تو تم سچ مچ جا رہے ہو؟'' ستارہ نے بڑے حوصلے سے پوچھا۔

''او..... ہائے منگیتر صاحبہ یہاں سب کچھ پانے کے لیے میرا جانا ضروری ہے۔'' وہ اسے

دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''سب کچھ پانے کے لیے مجھ کھونے چلے ہو۔'' وہ دکھ سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''ہاں کیونکہ ستارہ سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔'' وہ اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے بے پروا انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے پھر جاؤ آیندہ کبھی مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی تو اس نے شوخی سے کہا۔

''ارے اس شکل کو دیکھے بنا تمھیں چین نہیں آتا۔''

''اپنی یہ خوش فہمیاں ادھر ہی بھول جاؤ مسٹر رضی راؤ اور ہاں یہ منگنی کی انگوٹھی بھی ساتھ لیتے جاؤ۔'' ستارہ نے کہہ کر انگلی میں پہنی انگوٹھی اتارنا چاہی مگر انگوٹھی نے اترنے سے انکار کر دیا۔ رضی نے دیکھا تو ہنس کر شوخ لہجے میں بولا۔

''یہ میرے نام کی انگوٹھی ہے ساری زندگی اسے اتارنے کی کوشش کرتی رہو گی یہ تب بھی نہیں اترے گی۔'' اس کے آنسو بے اختیار رخساروں پر پھیل گئے۔

''بیوقوف لڑکی میں کہیں نہیں جا رہا تمھاری دعاؤں سے جو جاب مل گئی ہے وہیں جاؤں گا۔ میں تو تمھیں ستا رہا تھا۔'' رضی نے اس کے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چنتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''تو کیا تم باہر نہیں جا رہے؟'' ستارہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''نہیں ہاں البتہ ابھی ذرا دیر بعد کمرے سے باہر جا رہا ہوں اماں سے یہ کہنے کے اب اپنی لاڈلی بھانجی کو بہو بنا کر اس گھر میں جلدی سے لے آئیں یہ مجھے دن میں تارے دکھانے لگی ہے اور میں رات کو ستاروں کی روشنی میں اپنا آپ دیکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ اس کے چہرے کے دلکش نقوش کو وارفتگی سے دیکھتے ہوئے شریر لہجے میں بولا تو اس نے خفگی سے کہا۔

''اور وہ جو تم نے تو کہا تھا کہ ستارہ سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔''

''وہ بھی موقع کی مناسبت سے تمھیں ستانے کے لیے درست تھا۔'' وہ شرارت سے ہنسا۔

''رضی تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔'' ستارہ نے اس کے بازو پر مکہ رسید کر دیا۔

''ہائے میری جان تم یہ کیوں بھول گئیں کے اقبال نے فرمایا تھا کہ

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستارہ پہ جو ڈالتے ہیں کمند

اس نے شرارت بھرے لہجے میں شعر میں ستاروں کی جگہ ستارہ لگاتے ہوئے کہا۔

''تو اقبال کو جوانوں سے محبت ہے نا تمھیں تو ستارہ سے محبت نہیں ہے۔'' وہ خفگی سے بولی۔

''ہاں ستارہ سے تو مجھے عشق ہے عشق۔'' رضی نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ خوشی سے کھل اٹھی۔

''سچ مچ۔''

''اگر عملی ثبوت چاہیے تو اس کے لیے تمھیں نکاح تک انتظار کرنا ہوگا۔'' وہ بے حد شریر لہجے میں بولا۔ وہ حیا سے تپ کر گلنار ہوگئی روح تک خوشی سے سرشار ہوگئی تھی اس کی۔

''بکو مت۔'' وہ شرمائی۔

''تو یقین کر لو کے تم ہی ہو میرے مقدر کا ستارہ۔''

''مجھے یقین ہے۔'' اس نے شرماتے ہوئے کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ رضی خوشدلی سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

☆☆☆

گلاب رت کے فراق لمحے

زریں اطہر

کیوں اداس ہوتے ہو سردیوں کی شاموں میں اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں

علی زاد نے ڈائری میں نہ جانے کب اور کس موڈ میں یہ شعر لکھا تھا۔ مگر آج اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے شاعر نے اس کی دلی کیفیت کو مکمل طور پر قلمبند کر دیا ہے۔ ہاں واقعی اس طرح کے کاموں میں اسی طرح تو ہوا کرتا ہے۔ مگر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ وہ ایک مرتبہ پھر خود سے الجھنے لگا۔

دسمبر کے سرد موسم میں اسلام آباد کی خنک فضا اور برفیلی ہوائیں ڈھلتی شام میں اور بھی سرکش ہو رہی تھیں۔ مگر علی زاد کمرے کی کھڑکی کھولے ملگجی شام میں آسمان پر مدھم روشنی سمیت ٹمٹماتے اکا دکا ستاروں کو دیکھ رہا تھا اور شاید

ناولٹ

اپنے مقدر کے ستارے کی تلاش میں مگن کہ ہوا کے تیز تھپیڑے نے اس کے جسم میں جھرجھری پیدا کر دی۔ اس نے مارگلہ کے سرمئی پہاڑوں کے پیچھے منہ چھپاتے زرد شعاعوں والے سورج کو اداسی سے دیکھا اور کھڑکی کا پٹ بند کر دیا پھر مردہ قدموں سے چلتا اپنے بیڈ تک آیا اور ڈائری کو دراز میں ڈال دیا اور خود بیڈ پر دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں مگر لگتا تھا سکون نام کی چیز اس کی زندگی سے دور ہو گئی تھی۔ اس لیے بند پلکوں کے پیچھے کئی منظر گڈمڈ ہو گئے۔ درد کی تیز لہر نے اسے بے حال کر دیا۔ ایسا لگتا تھا دل کے ساتھ دماغ نے بھی اس کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔ ٹہل ٹہل کر ٹانگیں بے دم ہو گئیں تو ناچار ٹی وی لگا دیا۔ شوکت علی کی آواز کمرے میں پھیلتی چلی گئی۔

ہم اسے ڈھونڈنے نکلے تو نشاں تک نہ ملا
دل میں موجود رہا، آنکھ سے اوجھل نکلا
اک ملاقات تھی جو دل کو سدا یاد رہی
ہم جسے عمر سمجھتے تھے وہ اک پل نکلا

اس غزل نے تو مزید زخموں پر نمک چھڑکا

کام کیا۔ علی زاد نے تلملا کر کھٹ سے ٹی وی بند کیا اور بک شیلف میں رکھی کتابوں کا سرسری جائزہ لیا۔ نئے اور پرانے تمام شاعروں کا کلام موجود تھا۔ علی زاد نے محسن نقوی کی ''عذاب دید'' نکالی تو ایک اداس سی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کر لیا اور کتاب ہاتھ میں لیے نہ جانے وہ کہاں کھو گیا۔

''سنیے!.....'' ایک خوبصورت نسوانی آواز نے گنز بک آف دا ورلڈ ریکارڈ کے مطالعے میں غرق علی زاد کو اپنی طرف متوجہ کیا تو علی زاد نے یوں منہ اٹھا کر دیکھا جیسے نیند میں ہو۔

''وہ پروین شاکر کی ''خوشبو'' ہے؟'' سامنے کھڑی دو میں سے ایک نے کہا جبکہ دوسری لڑکی ادھر ادھر کتابیں دیکھنے میں مصروف تھی۔

''جی دیکھتا ہوں۔'' علی زاد نے جواب دیا اور ادھر ادھر نظر دوڑائی اور قریب رکھے ریک میں دیکھنے لگا۔

''ارے اس طرف تو سائنس فکشن پر مبنی کتابیں ہیں۔ شاعری کی کتابیں تو اس طرف ہوں گی۔'' علی زاد جو خاصا الجھا ہا لگ رہا تھا لڑکی کے بتانے پر دائیں طرف رکھے شیلف کی طرف مڑ گیا۔ جہاں واقعی تمام تر کتابیں اردو ادب سے متعلق تھیں۔ علی زاد نے شیلف پر پرسوچ نظر ڈالی۔

''آپی بہت دیر ہو جائے گی۔'' ایک نے پریشانی سے کہا۔

''بس نشاء کتاب لے کر سیدھے گھر ہی جائیں گے۔ باقی چیزیں کل لے لیں گے۔'' آگے والی نے پیچھے کھڑی پریشان حال نشاء کو حوصلہ دیا۔

''سنیں! اگر وہ نہیں ہے تو پھر فرحت عباس شاہ کی ''نظروں کے پار چاند'' ہی دے دیں۔'' آگے والی نے علی کو بدستور شیلف پر غور و فکر کرتے دیکھا تو بولی۔ تو علی دوبارہ بلکہ سہ بارہ شیلف کی طرف مڑ گیا۔

''پلیز یہ غور و فکر بعد میں کر لیجیے گا اور یوں بھی پوری شیلف میں یہ دونوں کتابیں نہیں ہیں۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔'' علی زاد جو اس وقت بہت مشکل میں گرفتار لگ رہا تھا لڑکی کی شکل دیکھنے لگا اور موصوفہ اطمینان سے کھڑی علی کے بغور دیکھنے پر کہنے لگیں۔

''محسن نقوی کی ''عذاب دید'' نکال دیں۔'' اور وہ حکم کے غلام کے مصداق فوراً بک شیلف کی طرف مڑ گیا اور ''عذاب دید'' ڈھونڈنے لگا۔

''سنیے یہ رکھی ہے۔'' اور علی زاد سٹپٹا گیا کیونکہ بک کاؤنٹر پر بانکل سامنے ہی رکھی ہوئی تھی۔ لڑکی نے بک اٹھائی پیسے دیئے اور کہنے لگی۔

''میرے خیال میں شاپ پر بیٹھنے سے پہلے ایک نظر کتابوں پر ڈال لیتے تو آپ کو کافی آسانی ہوتی۔ کم از کم اتنے غور و فکر سے جتنا کہ آپ ایک کتاب کی تلاش میں کرتے ہیں آپ فلسفی تو بن سکتے ہیں مگر اچھے سیلز مین نہیں۔''

''جی۔'' علی زاد نے تعجب سے لڑکی کی طرف دیکھا جو بڑے آرام سے اسے مشورے سے نواز رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس کی قوت مشاہدہ پر طنز کر رہی تھی۔ مگر مسکراہٹ کو دبائی شرارت سے بھری آنکھوں اور دانتوں سے ہونٹ دبائی وہ قطعاً شرارت کے موڈ میں لگ رہی تھی۔

''آپی اب چلیں ناں۔'' نشاء جو خاموش کھڑی بازار میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھ کر اکتا گئی تھی بیزار لہجے میں گویا ہوئی۔

''ہاں چلو۔'' اور شاپر اٹھائے وہ کھٹ کھٹ کرتی دکان سے باہر نکل گئیں۔ جبکہ علی زاد ثوبان کو غائبانہ ہی کھری کھری سنانے لگا جو اسے زبردستی اپنے دکان پر بٹھا کر ضروری کام کے سلسلے

میں چلا گیا تھا کہ ابھی دس منٹ میں آتا ہوں اور اب ایک گھنٹہ سے اوپر وقت ہو چکا تھا۔ ثوبان کو لعنت ملامت کرنے سے فارغ ہو کر اس نے دکان میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو اپنی عقل پر ماتم کرنے لگا کہ اس نے پہلے ہی غور کیوں نہ کیا صاف ظاہر تھا ایک طرف کی بک پر اردو ادب، دوسری طرف سائنس فکشن ایک ریک پر انگریزی رسائل اور سامنے ٹیبل پر اخبارات وغیرہ رکھے تھے۔ اور اسے افسوس ہونے لگا کہ خوامخواہ لڑکیوں کے سامنے خفت کا سامنا کرنا پڑا یا شاید مطالعے میں غرق ہونے کی وجہ سے۔ خیر کچھ بھی تھا اب وہ نہایت الرٹ ہو کر بیٹھ چکا تھا کیونکہ اس کا فلسفی بننے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا۔

''ہاں یار کوئی پرابلم تو نہیں ہوئی؟'' مسکراتے ہوئے ثوبان نے دکان میں قدم رکھا اور اطمینان سے گلاس ڈور سے نظارہ کرتے علی زاد سے مخاطب ہوا۔

''نہیں تو۔'' علی نے نظر متواتر روڈ پر دوڑتی گاڑیوں پر مرکوز رکھی تو ثوبان سمجھا کہ وہ ناراض ہے اس لیے دیر سے آنے کی وضاحتیں پیش کرنے لگا تو علی مسکرا پڑا۔ پھر علی اسے اپنی کارگزاری کے بارے میں بتانے لگا اور پھر جلد ہی واپس گھر لوٹ آیا۔ کیونکہ اس نے ابھی کمپیوٹر کلاس بھی لینی تھی۔ بی۔ اے کے ایگزامز کے بعد اب کمپیوٹر کلاسز جوائن کر لی تھیں تاکہ وقت کو بہتر انداز میں استعمال کر سکے اور آج بھی یونہی ثوبان کے پاس چلا آیا تھا تاکہ جدید ٹیکنالوجی پر مبنی کتابیں دیکھ سکے۔

رات گئے جب سکون سے اپنے بستر پر لیٹا تو ذہن یونہی ادھر ادھر بھٹکنے لگا۔ ''سنیے۔'' ایک دھیمی دلکش آواز خوشبو کی مانند اس کے وجود کے گرد پھیل گئی۔ ایک مرتبہ دو مرتبہ یا شاید سو مرتبہ بار بار ایک ہی نظر کی تکرار نے اس کے ذہن کو تھکانے کی بجائے عجیب سی تازگی بخش دی۔

جاگتے میں تو جو ہوا سو ہوا۔ رات خواب میں بھی علی زاد ثوبان کی بک شاپ میں گھومتا رہا اور صبح سویرے اس کی آنکھ کھلی تو موصوفہ محترم کے دل و دماغ پر بری طرح چھا چکی تھیں۔ کپڑوں کا رنگ، کان کے ٹاپس، آنکھوں کی چمک، آواز کے زیر و بم کے علاوہ نہ جانے کیا کچھ حفظ ہو چکا تھا اور خاص طور پر شرارتی انداز میں چمکتی آنکھیں اور دانتوں تلے دبائے ہونٹوں کا انداز تو موصوف کو بالکل ہی خس و خاشاک کر گیا اور اب وہ سر ہاتھوں میں تھامے اپنے بستر پر بیٹھا اپنے آپ سے ہم کلام تھا۔

لے بھئی علی زاد تیری بدبختی کے دن شروع ہو گئے۔ یعنی دس پندرہ منٹ میں برسوں کا پلا پلایا دل اس طرح غیر ہو گیا کہ بے چارہ علی زاد صرف سر پکڑ کر بیٹھا رہ گیا۔ کافی دیر خود کو سمجھانے کے بعد بھی جب دل بے ہودہ کو چین نہ ملا تو وہ ثوبان کی طرف چل پڑا کہ شاید آج پھر.....ثوبان ابھی بکس وغیرہ سیٹ ہی کر رہا تھا اسے دیکھ کر حیران ہو گیا اور اس کے چہرے پر بارہ بجے دیکھ کر قدرے پریشان اور علی زاد کی پوری بات سننے کے بعد پہلے تو اس کی اداس و غمگین شکل دیکھ کر اسے امید دلاتا رہا مگر جلد ہی ہنسی مذاق میں مصروف ہو گیا اور خالص فلمی انداز میں کہنے لگا۔

''اے اجنبی دوشیزہ، اے بے نام حسین چورنی تم جہاں بھی ہو فوراً یہاں چلی آؤ اور میرے چہیتے دوست کا دل ثابت و سالم اسے لوٹا دو یا پھر بدلے میں اپنا دل پیش کر دو تم کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔'' اور علی زاد ثوبان کی اس فضول حرکت پر صرف مسکرا کر رہ گیا۔

''ارے علی اٹھو شاباش مجھے اپنی خالہ بی کے ہاں چھوڑ آؤ۔ چلو جلدی سے نکلو بستر سے ویسے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔ بڑی آپا ناراض ہوں گی۔'' امی نے اسے شانوں سے ہلایا تو وہ

جھنجلا گیا اور بڑبڑاتا ہوا باتھ روم کی طرف چل پڑا۔ یوں تو آج کل وہ دن بس خواب دیکھا کرتا تھا مگر اس وقت تو وہ مرغزاروں میں نشاء کی آپی کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ کہ ای جی نے اسے جگا دیا اور وہ باتھ روم میں منہ ہاتھ دھوتے ہوئے بھی کھلی آنکھوں سے اپنا خواب مکمل کر رہا تھا۔

سی۔ڈی۔اے سٹاپ سے آگے ٹریفک زیادہ نہ تھی اس لیے وہ گاڑی کو نہایت آرام سے ڈرائیو کر رہا تھا کہ ٹرن کرتے ہوئے اچانک دو خواتین گاڑی کے بالکل سامنے آ گئیں۔ گاڑی کے بریک زور سے چرچرائے وہ خواتین روڈ پر باتوں میں اس قدر مگن تھیں کہ چاہے کوئی گاڑی ہی کچل جائے۔ جبکہ علی زاد بھی سہم سا گیا کہ اگر ابھی کچھ ہو جاتا تو جبکہ وہ دونوں اب بھی بہت آرام سے آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ جیسے انھیں کوئی سروکار ہی نہ ہو اور دونوں گلی میں مڑ گئیں۔ موڑ مڑتے ہوئے ایک نے یونہی ذرا سی گردن ترچھی کی تو علی زار کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ ہاتھ سٹیئرنگ پر جمے رہ گئے اور سرمئی روشن آنکھیں مزید روشن ہو گئیں۔

''ارے وہ مل گئی۔'' علی نے کھنکتی آواز سے ثوبان کو بتایا تو ثوبان پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کون.....؟'' ثوبان نے جان بوجھ کر اسے تپانے کے لیے سوال کیا۔

''وہی.....'' علی زاد نے مسکرا کر کہا۔

''وہی کون..... اچھا اچھا وہ نشاء۔'' ثوبان نے شرارت سے چھیڑا۔

''نہیں یار وہ نشاء کی آپی۔'' علی زاد نے جذبات سے پر لہجے میں جواب دیا تو ثوبان کے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ گیا۔

''یار ویسے یہ بڑی مزیدار بات ہے یعنی نشاء کی آپی یہ تو وہی شوہر پرست بیویوں والی بات ہو گئی۔ جیسے وہ کہتی ہیں تمھارے بھائی اس کے ابو اس کے ڈیڈی وغیرہ تم بھی اسی طرح نشا کی آپی۔''

''بکواس مت کرو تمھیں تو کچھ بتانا ہی نہیں چاہیے اس قدر فضول باتیں کرتے ہو کہ اچھا بھلا خوشگوار موڈ تباہ ہو جاتا ہے۔'' علی زاد نے بھنویں سکیڑ کر نہایت بری شکل بنائی تو ثوبان نے خوشی شیئر کرنے کے بہانے اس کی جیب ہلکی کرانے کا ارادہ کر لیا اور اجنبی حسینہ سے سر راہ ملاقات وہ بھی اچانک ہو جانے کا بھتہ یوں وصول کیا گویا کہ وہ تمام تر منصوبہ بندی اسی نے کی ہو۔

''ابا جان میں باہر نہیں جانا چاہتا۔ یہیں رہ کر کچھ کرنا چاہتا ہوں۔'' علی زاد نے ابا جان سے ملتجیانہ انداز میں کہا۔ جو چاہتے تھے کہ ان کا لاڈلا اکلوتا بیٹا اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ چلا جائے۔ جبکہ اس کا خیال تھا کہ یہیں رہ کر وہ مزید تعلیم حاصل کرے۔ مگر ابا جان نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے ذہنی طور پر خود کو تیار رہنے کا حکم دے دیا اور وہ اپنے اکلوتے ہونے کا بھی کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا۔ حتیٰ کہ امی جی نے بھی اس کے روشن مستقبل کی خاطر اس کی کوئی حمایت نہ کی۔

ثوبان سے ساری بات کہہ کر اس نے اپنے دل کا حال بھی کہہ سنایا۔ تو جواب میں ثوبان نے اس کی ٹھیک ٹھاک برین واشنگ کر ڈالی کہ چونکہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے اس لیے اس کا اولین فرض ہے کہ اپنے والدین کی خواہشات کا احترام کرے۔ کیونکہ وہی ان کی تمام تر آرزوؤں کا مرکز ہے۔ جہاں تک دل کی بات ہے تو جذبے خاص طور پر محبت کا جذبہ بہت طاقتور ہوتا ہے۔ جس کی شدت آدمی میں آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ اور بے نام منزلوں کی طرف سفر کرنے سے بہتر ہے کہ ان سمتوں کی طرف پیش قدمی کرو جن کا اختتام ایک

منزل پر ہو۔ اور علی زاد نے اس یقین کے ساتھ جانے کی تیاری شروع کر دی کہ جو خوشی اس کے نصیب میں لکھی ہو گی اسے مل جائے گی۔ در در بھٹکنے سے سوائے وقت کے ضیاع کے کچھ حاصل نہ ہو گا اور جو خوشی اور ذہنی آسودگی وہ اپنے پیاروں کو دے سکتا ہے وہ انہیں دے گا۔ ہو سکتا ہے اسی کے عوض خدا تعالیٰ اسے بھی اس کی منزل تک پہنچا دے اور اسی سوچ کے ساتھ وہ امریکہ فلائی کر گیا کہ اس کی محبت تو اس کے اندر اپنی تمام تر شدت سمیت موجود ہے اور جذبے صادق جذبے تو خوشبو کی طرح ہوتے ہیں اور میرے جذبے بھی ضرور اپنا آپ منوا لیں گے۔

شاید وہ اپنے جذبوں کی شدت کا اندازہ کا اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ اس کے اندر کتنی گہرائی تک اس محبت کی جڑیں پھیل چکی ہیں یا پھیل سکتی ہیں؟ کیا وہ اپنی تمام تر خواہشات احساسات صرف ایک شخصیت ایک ذات کے حوالے کر سکتا ہے؟ یا یہ ایک وقتی جذبہ ہے ایک لمحاتی احساس ہے جس نے اسے گرفت میں لے لیا ہے۔ یا وہ ایک پل اس کی زندگی پر چھا چکا ہے؟ کیا وہ وقت کے صحرا میں اپنے جذبے کی شدت کے مسئلے میں اس گزرے پل کو اپنی مٹھی میں قید کر پائے گا یا وہ لمحہ بھی اس کے ہاتھ سے رنگین تتلی کی مانند اپنے شوخ رنگ اس کی ہتھیلی پر بکھیر کر اڑ گیا ہے اور اس کے رنگ جو اس کی آنکھوں کا نور بن گئے ہیں وہ بکھر جائیں گے؟ کیا وہ ایسا ہونے دے گا؟ نہیں کبھی نہیں۔ علی زاد کے اندر سے آواز آئی۔

''نہیں میں ان لمحات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ لمحات تو میری زندگی کا حاصل ہیں۔ وہ آواز تو میرے دل کی دھڑکنوں کی لے میں رچ بس چکی ہے ہاں۔'' وہ میٹھی، سریلی، نرم آواز علی زاد نے اپنے دل سے گفت و شنید بند کی، آنکھیں موندیں اور چیئر کی پشت پر سر ٹکا دیا۔

''سنیے۔'' ذہین میں تمام منظر جوں کا توں آ موجود ہوا اور علی زراد کے چہرے پر آسودہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''ارے بھائی اب اٹھ بھی چکو کب تلک سوتے میں مسکراتا رہے گا۔ یہاں یہ حال ہے کہ جس دن کوئی ٹیسٹ ہو تو نیند اور بھوک غائب مگر جناب کو دیکھیے سوتے میں بھی مسکرا رہے ہیں۔ قربان جاؤں اس خوش اخلاقی کے۔ اٹھ جا بھائی واسطہ ہے تجھے تیرے خوابوں کا۔'' زمیل عمر نے باقاعدہ دہائیاں دینا شروع کیں تو علی مندی مندی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ مگر بولا کچھ نہیں۔ جس کا مطلب تھا کہ اس پر زمیل کی دہائیاں کوئی خاص اثر انداز نہیں ہوئی تھیں۔ اس لیے آرام سے واش روم کا رخ کرنے لگا تو زمیل بھی ناشتہ لینے کچن کی طرف چل پڑا اور جب وہ ناشتہ لے کر آیا علی زاد تقریباً تیار ہو چکا تھا اور پھر دونوں ناشتہ کرنے لگے تب زمیل نے علی کے خوشگوار موڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''علی ہماری دوستی کو دو سال ہونے کو ہیں۔ ہم ہر وقت ساتھ رہتے ہیں۔ تم مجھے اور میں تمھیں اچھی طرح جانتا اور پہچانتا ہوں مگر مجھے یقین ہے کہ کوئی بات ہے ضرور جو ابھی تک راز ہے۔ میں نے تمھیں کبھی کریدنے کی کوشش بھی نہیں کی کیونکہ میں جانتا ہوں تم مجھ پر اعتماد کرتے ہو۔ ہو سکتا ہے یہ میری خام خیالی ہو مگر پھر بھی تمھاری آنکھوں میں جگمگاتے اس روشن تارے کا کوئی نام ہو۔ یا تمھاری دھڑکنوں میں مچلتے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ بنکر دوڑاتے اس فسانے کا کوئی عنوان ہو تو مجھے ضرور بتانا۔ میں تمھارا دوست ہی نہیں تمھارا رازدار و غم خوار بھی بننا چاہتا ہوں۔'' زمیل نے اپنی بات نہایت آرام سے مکمل کی اور نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور علی کو بھی جلدی کا اشارہ کیا۔ ساتھ ہی اپنی اس قدر خلوص و اخلاقی محبت و مروت سے شرابور تقریر کا اثر دیکھنے کے لیے ذرا سا رکا مگر واہ صاحب موصوف اتنے آرام و اطمینان سے چائے کے گھونٹ بھرنے میں مصروف تھے گویا انھیں اس کارنمایاں پر عنقریب کوئی ایوارڈ ملنے والا ہو اور زمیل کا جی کر رہا تھا اپنی ساری مروت جھاڑ کر کونے میں رکھ دے اور علی زاد کے خوب لتے لے۔ مگر وہ دن شاید اس کے نصیب میں ہی نہ تھا جب وہ اپنی اس عظیم خواہش کی تکمیل کر پاتا۔ اس لیے مزید کچھ کہنے کے بجائے بربڑاتا ہوا کچن میں چلا گیا کیونکہ جانتا تھا کہ موصوف اب سارا دن زیرِ لب مسکرا کر دبی آواز میں گنگنا کر اس کا صبر آزمائیں گے اور کھلی آنکھوں سے کسی انجانی دنیا کے خواب دیکھیں گے۔ اس لیے زمیل نے ڈھیٹ بن کر خود ہی پوچھ لیا۔

''بادشاہ سلامت اگر زحمت فرمائیں تو بتا دیں کہ شاہی سواری بندۂ ناچیز کے ساتھ ہی یونیورسٹی تک تشریف لے جائیے گی یا عالم پناہ کچھ ساعتیں مزید اپنے خواب گذشتہ کے سحر میں گزارنا چاہیں گے؟'' زمیل نے نہایت ڈرامائی انداز میں پوچھا۔ تو علی اپنی مسکراہٹ ضبط کر کے بولا۔

''نہیں یار تم چلو میری کلاس تو آج لیٹ ہوگی۔ میں بعد میں آ جاؤں گا ویسے بھی کافی دن سے گھر والوں سے بات نہیں کی۔ آج گھر فون کروں گا۔''

''اچھا تو پھر انکل آنٹی کو میرا اسلام بھی کہنا اور ہاں وہ میری دراز میں کچھ ہے دیکھ لینا۔ اور پلیز یار یہ جو چیزیں وغیرہ بکھری ہیں سمیٹ کر نکلنا۔ تمھیں تو پتہ ہے مجھ سخت کوفت ہوتی ہے باہر سے آ کر سمیٹا کمٹی کرنے میں۔'' زمیل نے جھنجلائی شکل بنا کر کہا تو علی صرف سر ہلا کر رہ گیا اور زمیل خدا حافظ کہہ کر یونیورسٹی چلا گیا۔

علی نے ناشتے سے فارغ ہو کر برتن سمیٹے

اردگرد بکھری چیزیں ٹھکانے پر رکھیں اور پھر گھر کال بک کروا دی تا کہ آرام سے امی جی اور ابا جان سے بات کر سکے۔ کیونکہ کال میں دیر تھی اس لیے زمیل کی دراز کھول لی۔ اس چھوٹی سی دراز میں بھی ایک جہان کی چیزیں تھیں۔ جیسے زمیل کی ڈائریاں' ڈھیروں پین اور نہ جانے کتنے ہی یادگار لمحات میں اتاری گئی ڈھیروں ڈھیر تصویریں اور وہ تصویریں جو خاندانی تقریباً میں خاص طور پر زمیل کو بھجوانے کے لیے اتاری جاتی تھیں اور ہر آنے والے البم کے ساتھ ایک پلندہ بھی ہوتا جس میں وجہ تقریب تفصیل تقریب کے ساتھ ساتھ ہر بات جو تقریب کے دوران وقوع پذیر ہوتی اتنی تفصیل سے لکھی جاتی کہ ان دونوں کو گمان ہوتا کہ وہ بھی اس تقریب میں موجود ہیں اور یہی وجہ تھی کہ علی بھی زمیل کی فیملی سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ اور اب تو زمیل کے خطوں میں علی کو بھی مخاطب کیا جانے لگا تھا۔

علی نے تصویریں ترتیب سے رکھیں اور خاکی لفافے کو اٹھا لیا۔ جس پر زمیل کی تحریر مسکرا رہی تھی ''باقی چیزوں سے توجہ ہٹائیے اور میرا پردہ اٹھائیے۔''

علی نے مسکرا کر سر جھٹکا اور لفافے کی سیل کھول لی اور عدیم ہاشمی کی ''ترکش'' نے اس کی سرمئی آنکھوں میں روشنی بھر دی۔

یہ زمیل بھی کمال آدمی ہے اور یہی بکس تو ان کے تعلق کی بنیاد تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا ابھی اسے امریکہ آئے دو ماہ ہی ہوئے تھے کہ حسان صاحب کی ٹرانسفر کے آرڈرز آ گئے تو وہ پریشان ہو گیا حالانکہ حسان صاحب نے اسے کہا بھی تھا کہ وہ اس کا کوئی نہ کوئی بہتر انتظام کر کے ہی جائیں گے۔ مگر علی زاد خود ہی کوشش کرنے لگا۔

ایک دن وہ جب ایک دو اپارٹمنٹ دیکھ کر فارغ ہوا تو کافی پینے کے لیے قریبی ریستوران میں چلا گیا۔ چھوٹے سے ریستوران میں خوب گہما گہمی تھی کیونکہ زیادہ تر لوگ وہی تھے جو لنچ کرنے آئے تھے کیونکہ دفاتر میں لنچ کا وقت تھا۔

ریستوران میں قدم رکھتے ہی اردگرد کا جائزہ لیا اور کونے والی میز پر نظر پڑتے ہی اس کے قدم غیر ارادی طور پر اس طرف اٹھ گئے۔

''معاف کیجیے گا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' علی زاد نے نہایت شائستہ انداز اور شستہ اردو میں پوچھا اور کتاب آنکھوں سے لگائے شخص نے چونک کر علی زاد کی طرف دیکھا اور اگلے ہی پل علی زاد سے بغل گیر میل عمر علی زاد سے مکمل طور پر متعارف ہو چکا تھا۔

زمیل ایک سال سے امریکہ میں رہائش پذیر تھا۔ وہ ایک شوخ مزاج' طرحدار اور جلد گھل مل جانے والا نوجوان تھا۔ اسی لیے صرف آدھ گھنٹے میں ہی علی زاد کو لگا جیسے وہ برسوں ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہوں اور جب علی زاد کا مسئلہ سنا تو فوراً علی کو اپنے فلیٹ کی آفر کر دی۔ علی تو شرمندہ ہی ہو گیا۔ مگر زمیل نے بہت زور دیا تو وہ خاموش ہو گیا۔ چائے کا بل بھی زمیل نے ہی ادا کیا اور چلتے چلتے زمیل نے ان پانچ کتابوں میں سے ایک اٹھا کر علی کو پکڑا دی۔

''یہ لو بھئی اس بک میں میرا ایڈریس بھی ہے' فون نمبر بھی اور میرا ذوق بھی جب بھی فیصلہ کر لو بلکہ فیصلہ کیا کرنا ہے اپنا بوریا بستر لپیٹ لو مجھے انفارم کر دینا انشاء اللہ سر کے بل دوڑا آؤں گا۔'' اور علی زاد تو اس کی پرخلوص آفر پر اس کا ممنون ہو چکا تھا اور گھر پہنچنے تک وہ فیصلہ بھی کر چکا تھا۔

حسان انکل سے اجازت لے کر اس نے بک اپنی دراز سے نکالی اور پہلی مرتبہ کتاب کا بغور جائزہ لیا۔ سبز زمین پر کالے حروف میں جلی حروف میں ''تنہا تنہا'' لکھا دیکھ کر اور پھر احمد فراز

کا نام پڑھ کر اس نے یونہی ورق گردانی شروع کر دی۔ اسے ادبی قسم کی چیزوں سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا اور مشہور شعراء کی غزلیات وغیرہ بھی نصاب کی حد تک پڑھی تھیں اور یوں بھی اس کا زیادہ تر انٹرسٹ سائنس کمپیوٹر اور اکنامکس کی طرف تھا۔ مگر آج اس پر صبح سے اداسی کا دورہ پڑا ہوا تھا اور کسی کام میں دل بھی نہیں لگ رہا تھا اس لیے کتاب لے کر بیٹھ گیا چونکہ ٹائٹل اس کی موجودہ حالت کے عین مطابق تھا اس لیے اپنی تمام تر توجہ ورق ورق بکھری نظروں پر مرکوز کر دی۔ پہلے تو اسے کچھ سمجھ ہی نہ آیا اور یونہی اس کی نظر ٹھہر گئی۔

راتیں ہیں اداس دن بڑے ہیں
اے دل تیرے حوصلے بڑے ہیں
اے یاد حبیب ساتھ دینا
کچھ مرحلے سخت آ پڑے ہیں

زمیل کا ساتھ اس کے لیے بہت خوشگوار تھا۔ ہر دم خوش رہنے والا بات بات پر شعر سنانا اس کے پاس لفظوں کا خزانہ تھا۔ یادداشت زبردست تھی اور ذہن تو ہوائی جہاز کی رفتار سے تیز چلتا تھا اور اس کے مساوی ہی اس کی زبان بھی چلتی تھی۔ دیار غیر میں ایک پرخلوص ہم وطن اور ہم زبان کا ساتھ علی زاد کے لیے نعمت سے کم نہ تھا۔ اور علی زاد خدا تعالیٰ کا شکر گزار تھا کہ زمیل اور اس کی بے غرض دوستی علی کو نصیب ہوئی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ علی زاد خیالوں ہی خیالوں میں سجدہ شکر ادا کرتا ٹیلی فون کی تیز بیل نے اسے ماضی سے حال میں لا دھکیلا اور وہ ترکش ہاتھ میں لیے ٹیلی فون کی طرف دوڑا۔

والدین سے بات کر کے وہ بہت ہلکا پھلکا ہو گیا اور موڈ تو بہت ہی خوشگوار ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے یونیورسٹی جانے سے پہلے ہی لنچ بھی تیار کر لیا اور اسے خود بھی خبر نہ ہوئی کہ کام کے دوران وہ یہی شعر گنگنا رہا تھا۔

بارش وصل وہ ہوئی سارا غبار دھل گیا
وہ بھی نکھر نکھر گیا ہم بھی نکھر نکھر گئے
اسکے سلوک پر عدیم اپنی حیات و موت ہے
وہ جو ملا تو جی اٹھے وہ نہ ملا تو مر گئے

اور جب اسے احساس ہوا تو دانتوں تلے زبان دبا لی کہ زمیل نے اگر سن لیا تو اس کا خوب ریکارڈ بجائے گا کہ دو اور دو چار کی باتیں کرنے والے شعروں جیسی لطیف چیز گنگنا رہے ہیں۔

''بھائی صاحب ذرا وصل غبار حیات کا مطلب تو بتایئے گا؟'' اور جب تک علی ان اشعار کی تشریح سیاق و سباق سمیت نہیں بتا دے گا زمیل اس کے پیچھے ہی پڑا رہے گا۔ اور یہ زمیل کی بحث و مباحثے اور بال کی کھال اتارنے کی عادت ہی تھی جس کی بدولت علی زاد کو شاعری سمجھ آنے لگی تھی۔ اس نے ترکش کو شیلف میں رکھا جہاں تمام نامور شعراء کا کلام موجود تھا اور جو زمیل ہی لایا تھا۔ واقعی اس کا ذوق بہت عمدہ تھا۔

''لیجیے جناب چیزیں سمیٹ لیں کھانا تیار ہے فون پر بات بھی ہو گئی زمیل کی ترکش بھی پڑھ لی چل بھائی علی زاد اب یونیورسٹی کی طرف دوڑ لگا ایسا نہ ہو ٹیسٹ مس ہو جائے۔'' علی نے چاروں طرف کا جائزہ لیا اور چابی اٹھا کر نکل پڑا۔

''السلام علیکم۔'' علی نے بستر پر الٹے لیٹے زمیل کو سلام کیا مگر وہ یونہی الٹا پڑا رہا۔

''ارے یار خیریت یہ رخ روشن کی ساری بتیاں کیوں گل ہیں؟ یہ لوڈشیڈنگ کیوں ہو گئی؟'' علی نے بیڈ پر بیٹھ کر اس کا شانہ تھپکا۔

''کچھ نہیں یہ دیکھو۔'' زمیل نے نیلا لفافہ علی کو تھما دیا۔

''وہ گھر سے خط آیا ہے اس لیے اداس ہو؟'' علی نے خط پر سرسری انداز میں نظر ڈالی۔

''ہاں اور یہ بھی ہے۔'' زمیل نے ایک تصویر بھی اس کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

''ہیں..... یہ کیا بھئی؟'' علی نے حیرانگی سے لمبی سی ہیں کی تو زمیل کی بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔

''یار پچھلے ایک گھنٹے سے میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ سوچا شاید تمھیں کچھ سمجھ آ جائے اب ایسا کر بھائی تو اس پر غور کر میں کھانا گرم کرتا ہوں۔''

''لو بھلا اب اس میں کیا دیکھوں؟'' تصویر کسی فنکشن میں اتاری گئی تھی اور تصویر میں لڑکی کی پشت تھی اور پوری کمر کالے سیاہ گھنے لمبے بالوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ تصویر کی الٹی طرف لکھا تھا نام آفرین حسن۔ تعلیم بی۔اے قد پانچ فٹ چار انچ' بالوں کی لمبائی تین فٹ دو انچ۔ علی نے تصویر اور پھر موصوفہ کے کوائف پڑھ کر تصویر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی اور واش روم میں چلا گیا۔

زمیل کھانا گرم کر کے لے آیا تو دونوں ٹیبل پر آ گئے۔ علی نے زمیل کا تباہ حال موڈ دیکھا تو ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا اور چند ساعتوں بعد زمیل بہت زور و شور سے قصے سنا رہا تھا اور باتوں کے دروان ہی پھر سے تصویر کا ذکر آ نکلا تو علی نے اسے چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

''ویسے نام کافی اچھا ہے۔ آفرین' تعلیم بھی ٹھیک ہے اور بالوں کی تعریف نہ کرنا تو زیادتی ہوگی اور یوں بھی خوبصورت لمبے بال تمھاری کمزوری ہیں۔ ویسے آنٹی نے خط میں واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ وہ اتنی اچھی لڑکی کو کسی طور بھی مس نہیں کریں گی اور تمھاری پسند کے مطابق محترمہ کے بال واقعی بہت خوبصورت ہیں اور گھر والوں کی پسند پر بھی آفرین حسن پوری اترتی ہیں۔ اس لیے تمھارا کوئی بہانہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ اس لیے فوراً سے پیشتر ٹکٹ کٹواؤ اور پاکستان جانے کی تیاری کرو۔ تاکہ باقاعدہ طور پر تمھاری تقریب منگنی ارینج کی جا سکے۔''

علی چپ ہوا تو زمیل جلے بھنے انداز میں کہہ کر بستر میں گھس گیا کہ یہ سب وہ خود بھی خط میں پڑھ چکا ہے۔ مگر پھر اس کی تمام طراری دھری کی دھری رہ گئی۔ جب ڈیڈی کا فون آیا کہ منگنی کی رسم اس کی غیر موجودگی میں بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ تو وہ بادل نخواستہ جانے کے لیے تیار ہو گیا اور ایک ہفتے کی چھٹی پاکستان روانہ ہو گیا۔

''اے واہ زمیل عمر کیا کہنے تمھارے کہاں تو منگنی پر تیار نہ تھے اور اب نکاح کر بیٹے۔'' علی نے خیالوں میں ہی زمیل کے خوب کان کھینچے۔ زمیل کو گئے دو ہفتے ہو گئے تھے۔ چار مرتبہ اس کے فون آ چکے تھے' دو مرتبہ علی نے بھی فون پر بات کی تھی۔ ہر مرتبہ ہی زمیل نے اسے بھی آنے کا کہا مگر اس کے سٹر عنقریب شروع ہونے والے تھے۔ اس لیے زمیل بھی چپ ہو گیا۔ مگر جب زمیل کے نکاح کی خبر سنی تو اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر پہنچ جائے۔ البتہ علی کے گھر والے اس تقریب میں شریک ہوئے تھے۔

زمیل کا فون آیا تو پتہ چلا موصوف ابھی کچھ دن ٹھہریں گے اس لیے فی الحال تصویریں بھجوا رہے ہیں اور شام کی ڈاک سے ہی اسے تو تصویریں مل گئیں۔ شیروانی' آڑھے پاجامے میں کلاہ سر پر جمائے سلیم شاہی کھسے اور گلاب کے پھولوں میں چمکیلی براؤن آنکھوں میں روشنیاں بھرے لبوں پر جگمگاتی مسکراہٹ سمیت زمیل عمر کسی اور دنیا کا باسی لگ رہا تھا۔

علی نے تمام تصویریں بہت غور سے دیکھیں۔

''ہیں.....'' ایک لمبی ''ہیں'' یہ کیا حرکت ہوئی؟'' علی نے جھنجلا کر سر جھٹکا۔ اس نے سامنے پڑی تصویر کو پھر سے دیکھا۔ وہ آفرین حسن ہی تھی۔ تصویر کی پشت پر زمیل کی تحریر اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ آفرین عمر یعنی آپ کی بھابی۔

علی کو غصہ تو بہت آیا بھلا اتنا فضول مذاق۔ اس نے تصویر کو گھورا۔ وہ شاید نکاح کے عین موقع

پر اتاری گئی تصویر تھی۔ ظاہر ہے بہ وقت نکاح تو دلہن کو یوں بھی پورا ڈھک دیا جاتا ہے اور یہاں بھی آفرین کے سر پر بڑی سی چادر ڈالی ہوئی تھی اور وہ جھک کر سامنے رکھے نکاح نامے پر دستخط کر رہی تھی۔ اس لیے سوائے نکاح کے کاغذات پر رکھے اس کے ہاتھوں کے علاوہ تمام وجود چادر میں چھپا ہوا تھا اور علی زمیل کا شدت سے انتظار کرنے لگا کہ کب وہ آئے اور علی اس تمام کارروائی کا حال سن سکے۔

زمیل واپس آ گیا تھا ڈھیروں خوشیاں بٹور کر اس کی مسکراہٹ میں شوخی اور گنگناہٹ میں جھنکار شامل ہو گئی تھی اور سب سے پہلے علی کے گلے لگ کر اس نے بتایا تھا کہ وہ علی کو کتنا مس کرتا رہا تھا اور گھر میں قدم رکھتے ہی اس نے ڈھیروں تصویریں اس کی گود میں ڈال دی تھیں۔ زمیل اور آفرین کی مسکراتی ہوئی تصویریں اور ساتھ ساتھ ہر لمحہ کی تفصیل یوں بتائی کہ علی کو لگا وہ تمام تقریب میں خود بھی موجود رہا تھا۔ رخصتی کا پروگرام آفرین کے ایم۔اے کے بعد تھا۔

علی کے سمسٹر جونہی ختم ہوئے اس نے واپس وطن روانگی کے لیے تیاری شروع کر دی۔ زمیل نے تو یہ سن کر اس کی جان عذاب میں ڈال دی اور جوں جوں علی کی تیاری مکمل ہو رہی تھی زمیل کی آہ و زاری میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور ہجر و فراق پر مبنی شعر تو اتنے تواتر سے پڑھ رہا تھا کہ علی تو اس کی حالت پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گیا۔

ابا جان اور امی جی اس کی اچانک آمد پر حیران رہ گئے اور خوش بھی۔ وہ بھی خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اسے خبر تھی کہ ایک ماہ تو پلک جھپکتے میں گزر جائے گا۔ اس لیے اپنے کم وقت کو بہتر انداز میں گزارنے کے لیے زبردست پلاننگ کر لی تھی۔ جن میں سب سے اہم زمیل کے گھر والوں سے ملاقات کرنا۔ دوستوں سے ملنا اور زیادہ سے زیادہ وقت اپنے گھر اور گھر والوں کے ساتھ اور کچھ وقت رشتہ داروں کے لیے۔

اسے آئے دو ہفتے ہو گئے تھے دن گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ زمیل کے فون آتے رہے تھے اور فون پر وہ لہک لہک کر اپنی تنہائی اور بیزاری کا حال بتاتا۔

دیواروں سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے
ہم بھی پاگل ہو جائیں گے ایسا لگتا ہے

اور علی سوائے اسے تسلی دینے کے اور کیا کرتا۔

آج صبح سے ہی اس کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ موسم بھی دلفریب تھا۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ درختوں پر ہریالی چھائی ہوئی تھی سرسبز پتوں میں ایک فرحت بخش تازگی کا احساس ہو رہا تھا اور علی کا دل جھومنے اور گنگنانے کو چاہ رہا تھا اور پھر وہ ثوبان کی طرف نکل گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ زمیل کے لیے کوئی اچھی سی کتاب وغیرہ لے لے گا۔ مگر شاپ پر جا کر پتہ لگا کہ ثوبان تو کراچی گیا ہوا ہے۔

گھر میں کیا کرتا گاڑی لے کر نکل گیا۔ اسکے وجود کے ساتھ ساتھ اس کا ذہن بھی ادھر ادھر بھٹک رہا تھا اور پھر نہ جانے کیوں اس پر اداسی کا دورہ پڑ گیا۔ عثمانیہ کے خواب آگیں ماحول میں بے کل دل اور اداس آنکھوں سمیت وہ اس ماحول سے بہت دور تھا۔ اردگرد بیٹھے مسکراتے لوگ، سر جوڑ کر باتیں کرتے پل بھی اسے اس ماحول میں نہ لا سکے۔

اس کے بغیر آج بہت جی اداس ہے
جالب چلو کہیں سے اسے ڈھونڈ لائیں ہم

ڈرامائی انداز میں نہ جانے کس طرف سے نہایت ترنم سے یہ شعر پڑھا گیا یا شاید اس کے اندر سے ہی یہ آواز آئی تھی۔ نہایت سرد آہ سینے سے خارج کر کے اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی

اور آنکھیں تو گویا حیرانی سے باہر ہی آنے لگیں۔ دل دھڑ دھڑ کر کے اس کے کانوں میں ہی بجنے لگا۔

جس کو ڈھونڈا تھا اک زمانے میں
سامنے آیا تو دیکھا نہ گیا

علی کی آنکھیں تو کھلی تھیں مگر شاید اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کوئی شکل نہ تھی کوئی چہرہ نہ تھا صرف ایک احساس تھا۔

وہ جو ہو ماضی کچھ دیکھا نہ کچھ سنا جائے
ایک احساس دل و جاں میں اترتا جائے

اور جب علی اس احساس دل جاں کی کیفیت سے باہر آیا سامنے کی خالی میز اس کا منہ چڑا رہی تھی اور کوفت سی کوفت تھی۔ بھلا اتنی بھی کیا بے دھیانی اب کیا پورے شہر کی خاک چھانیں۔ اس نے خالی کپ میز پر رکھا اور اس میز کو اس طرح گھورا کہ کھا ہی جائے گا۔ تیز قدموں سے باہر کی طرف پیش قدمی کرتا علی زاد ٹھٹک کر رک گیا۔ براؤن میز پر سرخ گلابوں سے سجے گلدان کے بالکل ساتھ ہی سبز کور والی موٹی سی درمیانے سائز کی ڈائری مسکرا رہی تھی۔ علی پہلے تو متعجب ہوا مگر پھر ادھر ادھر نظر ڈال کر ڈائری اٹھا لی۔

اپنے بیڈ پر آرام سے بیٹھ کر علی نے ڈائری کھولی۔ ”مائدہ عرفان عرف ماہی“ جلی حروف میں مسکراتے حروف اس کے چہرے پر بھی زندگی کے رنگ بکھیر گئے۔ اس نے ساری ڈائری پر جلدی جلدی نظر دوڑائی کہ شاید مزید کچھ معلومات مل سکیں۔ مگر ڈائری کے چکنے سفید اوراق پر چند غزلیں نظمیں چند اشعار اور مختلف تاریخیں درج تھیں۔

ایک پل کے قیدی

دن مہ و سال بنتے جاتے ہیں
سارے منظر بدلتے جاتے ہیں

سوئی آنکھوں میں جاگتے سپنے
رات بھر کوئی گیت گاتے ہیں
بھاگتے دوڑتے ان لمحوں کو
اپنی مٹھی میں بھرنا چاہتے ہیں
مگر
وقت تو ایسا اڑتا پنچھی ہے
جس کی اونچی اڑان کے آگے
کوئی بھی جال اب تک بن نہ سکا
اس کے پر کوئی بھی کتر نہ سکا
مگر
کوئی وقت کو یہ سمجھاؤ
اس کی اونچی اڑان کے آگے
ہم نے گھٹنے بھی نہیں ٹیکے
وقت سب کچھ بدل تو سکتا ہے
پر میرا دل بدل نہیں سکتا
میری آنکھوں میں پنہا نظر کو
کوئی لمحہ جکڑ نہیں سکتا
دن مہ و سال یوں گزرتے رہیں
حال ماضی میں چاہے ڈھلتا رہے
ہم کو کچھ فرق اب نہیں پڑتا
سب زمانوں کے سنگ بہتے ہوئے
ہم اس ایک پل میں رہتے ہیں

پوری ڈائری اچھی طرح کھنگالنے کے بعد وہ یوں مطمئن ہو گیا گویا اس کے سر سے بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ سامنے رکھے ہوئے آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے اس نے شاید زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی سرمئی چمکتی آنکھوں کو توصیفی نظروں سے دیکھا۔

کیا واقعی؟ اس کی آنکھیں کسی کے لیے زندگی کی خوشیوں کی پیامبر ہو سکتی ہیں؟ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ امی جی کو اس کی آنکھیں بہت پسند تھیں کیونکہ سارے خاندان میں زیادہ تر آنکھیں بالکل کالی تھیں یا چند ایک افراد کی آنکھیں براؤن مگر اسے چمکیلی سورج کی سنہری کرنیں بکھیرتی

روشن روشن آنکھیں اچھی لگتی تھیں۔ مگر آج اسے اپنی سرمئی آنکھیں بھی اچھی لگ رہی تھیں شاید اس لیے کہ وہ خود کو اپنی نہیں بلکہ ماہی کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور اس کے ذہن میں ڈائری میں لکھی نظم گھوم رہی تھی۔ نہ جانے کیا سوچ کر یہ نظم لکھی گئی تھی!

تم اپنی سرمئی آنکھیں
کبھی پرنم نہیں کرنا
تمھیں شاید خبر نہ ہو
تمھاری
سرمئی آنکھوں میں
کسی کے
دو جہان بستے ہیں
تم
اپنی سرمئی آنکھوں میں
کوئی بھی
غم نہیں رکھنا

اسے یقین تو نہیں تھا مگر پھر بھی اس کا دل گنگنانے کو چاہ رہا تھا۔ خاص طور پر نظم ''ایک پل کے قیدی'' اور پھر اس کے نیچے درج تاریخ اس کے گمان کو یقین میں بدلنے پر مجبور کر رہی تھی اور ''اجنبی'' وہ تو اس اچانک مختصر ملاقات کی طرف واضح اشارہ لگتا تھا۔ ثوبان کراچی سے واپس آ گیا تھا اسے بھی علی کی آمد کا پتہ چلا تو دوڑا چلا آیا۔

''اور سنا کیسی گزری؟ امریکہ کی ہواؤں فضاؤں نے کچھ اثر ڈالا یا ابھی تک طبیعت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔'' ثوبان نے علی آتے ہی سے بے تکلفی سے سوال کیا۔

''وہ کون تھی؟ آپی؟ بھلا کیا پیارا سا نام تھا؟'' ثوبان نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا تو علی فوراً کہہ بیٹھا۔

''نشاء اور نشاء کی آپی کا نام ہے مائدہ عرفان۔'' علی زاد نے بے خود ہو کر ثوبان کو بتایا تو وہ اچھل ہی پڑا۔

''کیا' یعنی..... پلیز علی مجھے صاف صاف بتاؤ بھلا یہ سب کس طرح ممکن ہوا۔''

میں تو سمجھ رہا تھا تو تو بھول بھال گیا ہو آج کل بھلا اتنی مختصر سی ملاقات کو کون یاد رکھتا ہے اور امریکہ کی آزاد فضاؤں میں رہتے ہوئے۔'' ثوبان تو علی کی توقع سے بڑھ کر بے صبرے پن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اور پھر علی نے اپنے جانے کے بعد اور پھر آنے سے لے کر ڈائری تک تمام واقعات تفصیل سے سنا دیئے۔ تو ثوبان تو حیران ہی رہ گیا اور اس کے آنکھوں میں تیرتی بے یقینی پر علی نے ڈائری اسے تھما دی۔ جس پر خوبصورت تحریر میں لکھا نام' دیکھ کر ہی ثوبان آرام سے بیٹھ گیا اور اس انہونی پر خود کو یقین دلانے لگا۔ واقعی جذبے صادق ہوں تو خوشبو بن کر دوسرے تک پہنچ جاتے ہیں اور جو لوگ اپنے جذبوں کو اپنے اندر روح کی گہرائیوں میں پالتے ہیں وہ ضرور معتبر ہوتے ہیں۔ چلتے وقت ثوبان علی کی خوشی و خوش قسمتی پر واقعی بہت مسرور تھا۔

علی چاہ رہا تھا کہ زمیل کو بتا دے کہ اس کی سرمئی آنکھوں میں جگمگاتے خواب اور اس کی دھڑکنوں میں پنپتی کہانی کا عنوان مل گیا ہے۔ مگر نہ جانے کیوں ہر مرتبہ اس کے لب کچھ کہنے سے پہلے بھینچ جاتے اور پھر وہ واپس امریکہ چلا گیا اس یقین کے ساتھ کہ جن جذبوں کی بدولت وہ اس دل میں اپنی جگہ بنا چکا ہے۔ ایک دن وہی جذبے اسے درمحبوب تک بھی لے جائیں گے مگر اس سے پہلے وہ اپنے کیریئر کو بنانا چاہتا تھا۔ ساتھ ساتھ اٹھتے اٹھتے بیٹھتے اپنے خوابوں کی نیک تعبیر کی دعا کرتا اور اپنے جذبوں اور وقت کا پرندہ اس کے دل میں اپنی یاد کے رنگ چھوڑ کر اڑ گیا۔

وقت نے جہاں اسے شاندار کامیابی دی تھی خوش قسمتی نے ہر قدم پر اسے ایک فخر عطا کیا تھا۔ آج وہ پھر ایک سفر کر رہا تھا۔ زندگی میں نئی

منزلوں کا تعین کرتے ہوئے نئی فتوحات کے لیے پیش قدمی کرتے ہوئے اس کا رواں رواں خدائے بزرگ و برتر کے آگے سجدہ ریز تھا۔ آسمان کی وسعتوں میں اتنی اونچی اڑان پر وہ بہت سی سوچوں میں گرفتار تھا۔ زمیل کو ضروری کام تھے اس لیے اس کی واپسی چھ ماہ بعد متوقع تھی۔

وطن واپس آ کر جلد ہی علی زاد نے اپنا بزنس سیٹ کر لیا۔ امی جی کو تو اس کے ایم۔ بی۔ اے کے فوراً بعد ہی پڑ گئی تھی کہ اس کے سر پر سہرا سجا دیں مگر وہ مانتا ہی کب تھا۔ امی کے بے حد اصرار پر اس نے انھیں مطمئن کیا تھا اور جلد ہی انھیں اپنی مرضی بتا دینے کا وعدہ بھی۔ مگر ایک پریشانی سی پریشانی تھی اب بھلا کہاں ڈھونڈے۔

زمیل کی واپسی علی کے لیے خوش کن تھا اور زمیل کی آمد کے ساتھ ہی زندگی جاگ اٹھی تھی۔ وہ اپنے والد کے ساتھ ہی بزنس میں شریک ہو گیا اور پھر زمیل کی شادی بھی طے پا گئی۔ تو علی اس کے ساتھ گھن چکر بن گیا اور لگتا تھا کہ قسمت اس پر مہربان ہو گئی ہے۔ سبھی تو زمیل کی مہندی میں سسرالی رشتہ داروں کی کھیپ میں وہ بھی نمایاں تھی۔

مہندی کی رسم کے دوران وہ تمام وقت ہی علی زاد زمیل کے ساتھ ہی بندھا رہا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ علی زاد کی بدلتی رنگت آنکھوں میں جھلملاتے ستارے اور لبوں کی دھیمی مسکان زمیل عمر کی نظروں سے پوشیدہ رہ پاتی۔ اور چند ہی ساعتوں میں زمیل کی نظر علی کی نظروں کے تعاقب میں سبز رنگ کے انگرکھے میں ملبوس ملتانی کرتہ پہنے ہلکے میک اپ میں بالوں میں لمبا سا پراندہ ڈالے اس شوخ حسینہ پر جا کر ٹھہر گئی۔ جو نہ جانے کس بات پر ہنسی آئی۔ مترنم جھنکار بکھیر رہی تھی۔

''اچھا تو یہ ہے وہ گرین فش' میرا مطلب ہے محترمہ مائدہ عرفان عرف ماہی۔'' زمیل نے کھوئے کھوئے سے علی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو علی چونک اٹھا اور حیرانی سے زمیل کو تکنے لگا۔ بھلا زمیل کو کیسے خبر؟ میں نے تو ابھی اسے کچھ بتایا ہی نہیں۔

علی زاد کی سوچ بھی زمیل سے چھپی نہ رہ سکی۔ اس لیے مسکرا کر کہنے لگا۔

''چھوڑ یار تو بھی بدھو ہے اور تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔''

''مجھے پتہ تھا تم تو کچھ اگلو گے نہیں اس لیے خود ہی کھوج لگا لیا بلکہ کھوج کیا لگایا کچھ تمھاری ذاتی طبع آزمائی۔ یعنی تمھاری وہ ڈائری نے سمجھا دیا اور کچھ وہ سبز جھنڈے'' نے بتا دیا۔ زمیل نے مزے سے اسے آگاہ کیا۔

''سبز جھنڈا۔'' علی نے نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''بھئی وہ مائدہ عرفان کی ڈائری جو تم غلطی سے اپنی بک شیلف میں رکھ آئے تھے حالانکہ وہ تمھیں اپنی دراز میں رکھنی چاہیے تھی تالا لگا کر بلکہ بہتر ہوتا کہ اسے بینک کے لاکر میں جمع کروا دیتا۔'' زمیل نے تو یونہی کہا تھا مگر علی کو وہ ناراض سا انداز لگا۔ اسی لیے وہ قدرے پریشان ہوا تھا۔

کیا اسے برا لگا کہ میں نے اس معاملے میں اس قدر رازداری برتی مگر میں تو اسے بتانا چاہا تھا۔ اسے اب مناسب موقع ہی نہ ملا تو میرا کیا قصور۔ بہر حال وہ ایک بہترین دوست اور غم خوار و غمگسار ہے۔

''اے بھائی کہاں کھو گیا؟ اتنا مت سوچا کہ شاعر تو پہلے ہی ہے کچا پکا ہی سہی۔ اگر فلاسفر بھی بن گیا تو زندگی ادب کی ضخیم کتاب بن جائے گی۔ اور تمھاری شکل پر بارہ اس لیے بج گئے ہیں کہ میں تم سے ناراض ہوں۔ تو دوست میں جانتا ہوں تم بہت محتاط ہو۔ اور کسی الوزیٹ اپر چیونٹی کے منتظر ہو گے۔ مجھے بھی بتا دو۔ خیر میں تمھیں بتا

دوں کہ میں تمھیں تم سے بہتر جانتا ہوں۔ بہر حال کانگریچولیشن۔'' زمیل نے خوشدلی سے علی کا ہاتھ انعام تھام لیا۔ جو جامد و ساکت کھڑا زمیل کی بات سن رہا تھا۔

ولیمے کے روز ہی زمیل نے مائدہ عرفان کے متعلق کوائف علی زاد کے گوش گزار کر دیئے اور علی زمیل کی اس قدر کوئیک سروس پر بھونچکا رہ گیا۔ بہر حال علی زاد کی زندگی میں خوشگوار ہلچل پیدا ہوگئی تھی۔ اس کی ٹوٹی پھوٹی شاعری میں انتظار کی جگہ بہار کے رنگوں نے لے لی تھی۔

زمیل آج کل دعوتیں کھانے میں مصروف تھا اور اگلے ہفتے اس کا ارادہ شمالی علاقہ جات کی طرف نکل جانے کا تھا۔ کیونکہ بہار کے خوشگوار و حسین موسم میں قدرت کے نظارے مزید دلکش ہو جاتے ہیں۔

کیا مصیبت ہے بھلا یہ اتنا مشکل کام تو نہیں۔ علی نے ٹیلی فون کا ریسیور پٹخ دیا اور ٹیبل پر سر رکھ دیا۔ مگر پھر سے ہمت کی اور نمبر ڈائل کیا۔ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے وہ یہی کھیل کر رہا تھا۔ نمبر ڈائل کرتا مگر ریسیور رکھ دیتا۔ ہیلو ہیلو کی دلکش آواز اس کے کانوں میں اترتی تو اس کی جان میں جان آتی۔

''ہیلو.....'' اس بار آواز میں جھنجلاہٹ بہت واضح تھی۔

''ہیلو السلام علیکم۔'' علی زاد کی بھاری خوبصورت آواز اور گمبھیر لہجہ چند ساعتوں کے لیے سکوت پیدا کر گیا۔

''جی فرمائیے۔'' دوسری جانب علی کے پرخلوص سلام کا جواب گول کر دیا گیا۔

''جی ماہی سے بات کرنا تھی۔'' علی نے قدرے سنبھل کر مدعا بیان کر دیا۔

''جی مگر آپ کون؟'' دوسری طرف سے جس انداز میں پوچھا گیا اس سے صاف ظاہر تھا کہ محترمہ ہی دوسری جانب موجود ہیں اور یہ محسوس کرتے ہی مسکراہٹ علی زاد کے چہرے پر بکھر گئی۔

''میں علی زاد ہوں زمیل کا دوست۔''

''اور زمیل بھائی کے دوست مگر.....'' ماہی تعجب سے جملہ بھی مکمل نہ کر پائی تھی کہ علی نے جملہ اچک لیا۔

''جی وہ دراصل میں کافی عرصے سے آپ کو تلاش کر رہا تھا آپ کی ایک امانت تھی میرے پاس۔'' علی نے جلدی سے بات آگے بڑھائی کہ کہیں وہ فون بند ہی نہ کر دے۔

''میری امانت.....؟'' ماہی نے نہایت مہذب اور دھیمے انداز میں کہے گئے لفظوں پر غور کرتے ہوئے کہا جن میں صداقت کی جھلک تھی۔

''جی ہاں آپ کی ڈائری۔'' علی نے مطمئن انداز میں کہا تو ماہی کو اپنی گم شدہ ڈائری یاد آ گئی اور یہ بھی کہ وہ کتنی پریشان ہوئی تھی مگر نہ تو کچھ کہہ سکی اور نہ ہی کچھ کر سکی تھی۔ اب ڈائری کے اچانک مل جانے پر خوش ہوگئی۔

''ارے وہ ڈائری واقعی آپ کے پاس ہے؟'' علی زاد کے چہرے پر اطمینان اور سرشاری کی تحریر بہت واضح تھی۔

''پلیز اپنا ایڈریس نوٹ کروا دیں تاکہ وہ امانت آپ کے سپرد کر سکوں۔

''جی وہ.....'' اور چند پل ٹھہر کر اس نے پتہ نوٹ کروا دیا اور خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھ دیا جبکہ علی سامنے ٹیلی فون نمبر اور ساتھ درج پتے پر نظر ڈال کر مسکرانے لگا۔ اب تو یہ مسکراہٹ علی زاد کی ذات کا حصہ بن گئی تھی اور اگلے روز ہی ٹی سی ایس کا نمائندہ ماہی کو خاکی لفافہ اور ایک گلاب کے سرخ، گلابی اور نارنجی رنگ کے مہکتے پھولوں کا گلدستہ تھما کر چلا گیا۔

وہ پہلے حیران ہوئی اور پھر اطمینان سے

اپنے کمرے میں آ کر پہلے تو دونوں چیزوں کو دیکھتی رہی اور پھر پرسوچ انداز میں خاکی لفافہ کھول لیا۔ لفافے میں سے گرین ڈائری نکال لی۔ ڈائری سامنے رکھ کر گلدستہ اٹھایا اور ناک کے قریب لا کر ایک زوردار سانس لی اور پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ ابھی ہنسی مکمل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ فون کی بیل نے بریک لگا دیئے اور وہ گلدستہ ہاتھ میں ہی پکڑے بھاگتی ہوئی فون تک پہنچی۔

''ہیلو.....'' خوشگوار موڈ میں کہا۔ آواز خاصی پرجوش تھی۔

''السلام علیکم۔'' دوسری جانب سے نہایت متانت سے کہا گیا تو وہ سنبھل گئی اور نظر بے ارادہ ہی ہاتھ میں تھامے بوکے پر جم سی گئی۔

''ہیلو۔'' علی نے سکوت توڑا تو وہ گویا ہوئی۔

''جی وعلیکم السلام۔'' پھر خاموشی۔

''ہیلو ماہی میں ہوں علی زاد آپ ٹھیک تو ہیں نا؟'' علی کی آواز میں گھبراہٹ بہت واضح تھی۔

''جی..... جی۔'' ماہی نے اٹک اٹک کر کہا۔

''وہ میں نے اس لیے فون کیا تھا کہ آپ کی امانت آپ کو مل گئی نا اور وہ.....'' علی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''جی..... جی ہاں ابھی ابھی ملی ہیں۔ اس کی کیا ضرورت تھی خوامخواہ تکلف کیا آپ نے۔'' ماہی کو سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہے۔

''جی نہیں یہ تکلف نہیں بس خلوص ہے کہ دوستوں سے بہتر نہ کوئی تحفہ ہے اور نہ ہی ہدیہ ہوتا ہے۔ آپ اپنی چیزیں چیک کر لیجیے پوری اور صحیح تو ہیں ناں میں پرسوں فون کروں گا خدا حافظ۔'' اور فون کھٹ سے بند ہو گیا اور ماہی گومگو کی کیفیت میں دوبارہ اپنے بیڈ پر چوکڑا مار کر بیٹھ گئی۔

''لو بھلا مجھے کیا ضرورت تھی درمیان میں کود پڑنے کی اب بھلا کیا ہوگا..... ہائے۔'' اس نے سر ہاتھوں میں تھام لیا پھر کچھ سوچ کر ڈائری کھول لی اور یونہی ورق گردانی کرنے لگی۔

''ایں.....'' ڈائری کے درمیانی صفحات میں چند اشعار اور ایک آزاد نظم درج تھی اور وہ ان لفظوں کے طلسم میں کھو کر سب کچھ فراموش کر بیٹھی۔ حرفوں اور لفظوں سے ترتیب پائے ہوئے یہ مصرعے اسے بہت انوکھے بہت اچھوتے لگے اور چکنے صفحات پر بکھرے اشعار اس دلکش آواز میں ڈھل کر اس کے اردگرد خوشبو کے ہالے کی طرح پھیل گئے۔ وہ نہ جانے کب تک خیالوں میں گم رہتی کہ بیل کی آواز کے ساتھ مین گیٹ کو پیٹنے کی آواز نے اس کے حواس مختل کر دیئے۔

''ارے یہ حد درجہ بدتمیز کون ہے؟'' وہ بڑبڑاتی گیٹ کی طرف بڑھی ساتھ ہی بڑی مامی بھی تیزی سے اپنے کمرے سے برآمد ہوئیں اور ماہی کو دیکھ کر سست روی سے گیٹ کی طرف پیش قدمی کرنے لگیں کہ گیٹ کھلتے ہی سامنے موجود لڑکی ماہی کے گلے لگ گئی۔

''ہائے اللہ شکر ہے تم یہیں ہو۔'' لڑکی نے نہایت پرجوش ہو کر جذبات سے لبریز آواز میں کہا تو ماہی نے اس کا گال چوم لیا اور خود سے علیحدہ کرتے ہوئے بولی۔

''لیجیے بندی تو حکم کی غلام ہے۔ ابھی تک ڈیرے ڈالے بیٹھی ہے۔ ارے لڑکیو کیا گیٹ پر کھڑے کھڑے ہی ساری رام کہانی سنا دو گی ایک دوسرے کو۔'' بڑی مامی نے دونوں کو گیٹ پر براجمان دیکھا تو بولنے لگیں۔

''ہائے امی موصوفہ کا جوش و خروش اس مرتبہ بھی نقطۂ عروج پر تھا اور گلے لگ جانے کا انداز بہت والہانہ۔ خدیجہ بیگم مسکرا کر رہ گئیں۔

''چلو اب فریش ہو جاؤ تاکہ میں تمھیں گذشتہ دنوں کا احوال سنا سکوں۔'' ماہی کو تو جو جلدی تھی سو تھی وہ بھی بہت بلکہ ڈھیروں باتیں جمع

کر کے لائی تھی اور سب کچھ بتانے کی جلدی اس سے سوا تھی۔

خدیجہ بیگم تو کچن کی سمت گئیں۔

چائے تیار کرنے کے بعد وہ ماہی کے کمرے میں داخل ہوگئیں مگر کمرہ خالی تھا۔ اس لیے انھوں نے پکارا۔

''ماہی.....!'' اور بیک وقت دو آوازیں ان کے کانوں سے ٹکرائیں۔

''جی.....'' ایک آواز غسل خانے سے آئی تھی اور دوسری نہ جانے کمرے کے کس کونے سے۔ ان کے لبوں پر بے ساختہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اسی اثنا میں وہ گیلری سے اندر داخل ہوگئی۔

''جی مامی۔'' اس کی آواز میں محبت بھی تھی اور احترام بھی اور مامی کو اس کی یہی ادا بہت پسند تھی ہمیشہ ہی بہت ہی محبت احترام اور انکساری سے بولا کرتی۔

''بیٹا چائے تیار ہے جلدی آ جاؤ۔'' خدیجہ بیگم نے نرمی سے کہا تو وہ جی کہہ کر غسل خانے کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''محترمہ جلدی کیجیے چائے تیار ہو چکی ہے۔''

جب وہ دونوں ٹیبل تک پہنچیں خدیجہ بیگم اور عرفان صاحب ان کے منتظر تھے۔

''آؤ بیٹا۔'' پھر چاروں چائے پینے کے دوران باتیں کرتے رہے کہ دوران گفتگو عرفان صاحب نے ماہی کو پکارا تو ''جی'' کی دو آوازوں پر مسکرا کر رہ گئے۔

''ایک تو یہ بھی پرابلم ہے یعنی ماہم کو پکارو تب بھی ماہی اور مائدہ کو پکارو تب بھی ماہی۔ کبھی دونوں اکٹھی بول پڑتی ہیں تو کبھی ایک کا جواب بھی ندارد۔'' عرفان صاحب کی بات پر دونوں مسکرانے لگیں۔

چائے کے بعد دونوں اپنے مشترکہ کمرے میں آ گئیں اور بستر پر چڑھ کر مائدہ اپنے لاہور میں گزارے گئے دنوں کی روداد روانی سے سنا لگی اور ماہم اس کی باتیں سننے کے دوران سوچتی رہی کہ وہ مائدہ کو کس طرح بتائے۔

عرفان صاحب اسلام آباد کے ایک آفس میں جاب کرتے تھے۔ مالی پوزیشن بھی اسٹرونگ تھی۔ مگر شادی کے پانچ سال گزرنے کے باوجود بھی اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ مگر دنوں میں بیوی خدا کی ذات سے مایوس نہ تھے۔ زندگی سبک روی سے گزر رہی تھی کہ انہی دنوں عرفان صاحب کی سب سے چھوٹی بہن عارفہ جو دبئی میں رہائش پذیر تھیں چھٹیاں گزارنے آ گئیں۔ عرفان صاحب کی لاڈلی بہن تھیں کیونکہ والد کے انتقال کے بعد عرفان صاحب نے ہی عارفہ کی پرورش کی کیونکہ وہ اکلوتے بھائی تھے۔

دو بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں ایک جرمنی میں اور دوسری کینیڈا میں تھی۔ پھر عرفان جمال تھے۔ ان کے بعد ایک لڑکا ہوا مگر زندہ نہ رہ سکا اور پھر آٹھ سال بعد عارفہ نے دنیا میں آ کر ہلچل مچا دی۔

ابھی عارفہ پندرہ سال کی تھی کہ ایک حادثے میں والدین اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ انھوں نے تمام تر ذمہ داریاں سنبھال لیں اور ساتھ ساتھ عارفہ کو اپنے قریب تر کر لیا۔ پھر خدیجہ بیگم جب اس آنگن میں اتریں تو معصوم سی خاموش رہنے والی عارفہ انھیں عزیز تر ہوگئی۔ کبھی تو انھوں نے اپنے خاندان کے سب سے بہتر اعلیٰ تعلیم یافتہ خوبصورت مدھم اور دھیمے انداز والے عزیز کو عارفہ کے لیے منتخب کیا تھا اور دوسری جانب سے اسی گرمجوشی سے اقرار کر لیا گیا اور یوں خدیجہ کے ساتھ دو سال گزارنے کے بعد عارفہ عزیز کے ساتھ پیا دیس سدھار گئی۔ مگر اس کے ان دو سالوں میں خدیجہ بیگم کی دی گئی محبت تھی اور پھر عذیر کی صورت میں ان کی طرف

سے دیا گیا زندگی کا خوبصورت سا تحفہ تھی۔

عارفہ دور جا کر اب عرفان جمال اور خدیجہ بیگم کے مزید قریب ہوگئی تھی اور ان کی خوشیوں کے لیے ہر دم دعا گو رہتی۔

عارفہ کے آنے پر ہر طرف چہل پہل ہوگئی۔ اس کی ایک سالہ بیٹی ماہم ان سب کی توجہ کا مرکز تھی اور عارفہ تو ماہم کو خدیجہ بیگم کے حوالے کر کے مطمئن ہو کر رشتہ داروں سے ملاقاتیں کرتیں اور خدیجہ بیگم ماہی کو سینے سے لگا کر ایک گونہ اطمینان محسوس کرتیں۔ جب کبھی وہ سب اکٹھے بیٹھتے اور ماہی کو کھیلتے دیکھتے تو عارضہ ہمیشہ کہا کرتی۔

''بھابی یہ تو آپ کی بیٹی ہے۔ آپ کے پاس خوش رہتی ہے۔ ایسا کریں آپ ہی رکھ لیں۔ میں سوچ رہی ہوں اسے آپ کے پاس ہی چھوڑ جاؤں۔ عذیر بھی کہہ رہے تھے۔'' اور خدیجہ بیگم آبدیدہ ہوگئیں اس کی اتنی چاہت پر۔

واقعی ماہی ان سے بہت مل گئی تھی۔ ہر دم ان کی گود میں رہنے کی عادت بھی تو ہوگئی تھی اور خدیجہ بیگم سوچتیں عارفہ چلی گئی۔ ماہی چلی گئی تو وہ کیسے رہ پائیں گی۔ مگر خدا نے ان کی سن لی تھی کبھی تو پانچ سال بعد ان کی مراد پوری ہو رہی تھی اور انھیں لگ رہا تھا پانچ ہزار سال بعد ان کی زندگی میں بہار آ رہی ہے۔

ماہم اب انھیں اور بھی پیاری لگنے لگی تھی۔ جس نے انھیں اپنے ننھے وجود سے دلی سکون دیا تھا اور ان کی گود میں آ کر انھیں بامراد کر دیا تھا۔

عارفہ چلی گئی اور خدیجہ بیگم پہروں اداس رہتیں۔ عارفہ کا موڈ تھا کہ وہ ابھی رہے مگر ناگزیر وجوہات کی بنا پر اسے جانا پڑا مگر ہر تیسرے دن باقاعدگی سے فون کرتی اور بھابی سے باتیں کرتی اور پھر مائدہ ان کی گود میں زندگی کی خوشی بن کر مسکرانے لگی اور خدیجہ بیگم نے مائدہ کو گود میں اٹھا کر کہا تھا یہ میری ماہی ہے۔ ماہی اور بس مائدہ کا نام ہی پڑ گیا۔

پھر عارفہ ہر سال آیا کرتی گھر میں ہر طرف ماہی ماہی کی آوازیں آیا کرتیں۔ دونوں بچیاں سب کی توجہ کا مرکز تھیں۔ پھر یہ فاصلے بھی گھٹ گئے۔ عارفہ اور عذیر پاکستان آ گئے مگر ان کی رہائش کراچی میں تھی اور پھر بزرگوں کی محبتیں بچوں میں بھی حلول کر گئیں۔ ماہم اور مائدہ کی دوستی ان کا آپس میں پیار بہت گہرا تھا۔ ماہم سے چھوٹی نشاء اور پھر سہیل تھے وہ بھی مائدہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ مگر مائدہ اور ماہم کی دوستی دن بہ دن گہری تر ہوتی گئی۔ حالانکہ دونوں کے مزاجوں میں خاصا فرق تھا۔

ماہم قدرے سنجیدہ مزاج کی، سادہ سی لڑکی تھی۔ شعر و شاعری کی شوقین، ادبی کتابوں کی دلدادہ، فطرت کے حسین نظاروں کی متوالی اور نرم دل، حساس، دھیمی، ہر دم خیال رکھنے والی۔ جبکہ مائدہ قدرے شوخ تھی۔ تیز بولتی، تیز چلتی، ہر نیا گیت ہر نئی فلم شوبز کی خبریں، اور نت نئی گوسپ وہی ماہم کو سنایا کرتی۔ خوش ہوتی تو ہنسی کی جھنکار گھر کے کونے کونے میں چھنکتی اور موڈ خراب ہوتا تو ماہم کو سامنے بٹھا کر خوب رونا روتی۔ ہر بات چاہے چھوٹی سی بات کیوں نہ ہو جب تک ماہم کو لفظ لفظ نہ سنا دیتی بے چین رہتی۔

دونوں میں بہت ہم آہنگی تھی۔ دلچسپی نہ ہونے کے باوجود بھی دونوں ایک دوسرے کے مشاغل میں برابر کی شرکت کرتیں۔ مائدہ نے فلم دیکھنی ہوتی تو ماہم کو بھی ساتھ گھسیٹتی۔ نہ چاہنے کے باوجود بھی ماہم فلم دیکھتی اور بغور دیکھتی اور دیکھنے والا یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مجبوری میں کر رہی ہے اور دونوں فلم کے دوران خوب بحث بھی کرتیں۔

ماہم کو کوئی کتاب لینی ہوتی اور دونوں گھنٹوں دکانیں چھانا کرتیں۔ ماہم شعر سناتی اور مائدہ شعر کے سر سے گزرنے کے باوجود داد و

تحسین کے ڈونگرے برساتی۔ دونوں ایک دوسرے کے مزاج سے آگاہ تھیں۔ کراچی اور اسلام آباد کے درمیان میلوں کے فاصلے بھی ان کو ایک دوسرے سے غافل نہ کر پاتے۔ ماہم کراچی چلی جاتی تو ہر تیسرے دن مائدہ کا ایک دستے پر مشتمل خیریت نامہ موصول ہوتا اور ماہم کی طرف سے ماہم نامہ پہنچتا تو مائدہ اونچے اونچے گانے گنگناتی۔

ایک دوسرے کو گفٹس باقاعدگی سے بھیجے جاتے۔ خوب کتابوں، کیسٹوں اور رسالوں کی درآمد برآمد ہوتی۔ ماہم کی سالگرہ آنے والی تھی۔ مائدہ کراچی جانا چاہتی تھی کیونکہ نشاء بھی رہنے آئی ہوئی تھی۔ اس لیے مائدہ چاہ رہی تھی کہ وہ بھی نشاء کے ساتھ ہی چلی جائے۔ اسی لیے آج کل زور و شور سے خرید و فروخت میں مصروف تھی۔ ماہم کے لیے اپنی پسند کا سوٹ لیا میچنگ جیولری، ملتانی کھسہ اور اس کے فیورٹ شاعر فرحت عباس شاہ کا مجموعہ ''صحرا خرید لائے ہیں، خریدنے کا ارادہ تھا مگر وہ جس دکان سے بکس لیتی تھی وہ بند تھی اس لیے نشاء کو لے کر نکل پڑی کیونکہ کل انھوں نے کراچی جانا تھا اور کاچی میں ماہم سے گلے لگ کر چٹ چٹ اس کے گالوں کو چوم کر ایئرپورٹ سے پارکنگ تک پہنچنے تک وہ سرگوشیوں میں تمام رپورٹ اسے پیش کر چکی تھی اور ماہم اس کے گلرنگ چہرے اور کھنکتی ہنسی اور چمکتی آنکھوں کو دیکھ کر نہال ہو رہی تھی۔ رات بستر پر دراز وہ ماہم سے کہہ رہی تھی۔

''ماہی۔''

''ہوں۔'' ماہم جو گفٹ سنبھال کر رکھ رہی تھی اسی پیار بھرے انداز میں بولی۔ مگر اس کی طرف متوجہ نہ ہوئی کیونکہ مائدہ کی لائی ہوئی ''عذاب دید'' اس کے سامنے تھی۔

''اف اسے چھوڑو نا، ادھر آؤ۔'' مائدہ نے زور دے کر کہا تو ماہم اس کے ساتھ ہی دراز ہوگئی اور مائدہ کی طرف دیکھنے لگی جو کہنیوں کے بل الٹی لیٹی تھی۔

''ہاں کہو۔'' ماہم نے اس کے چہرے پر نظر جما دی اور مائدہ نے پانچویں مرتبہ بک شاپ والا قصہ من و عن دھرا دیا تو ماہم کا جی چاہا اپنا سر پیٹ ڈالے۔ مگر پھر مائدہ کی طرف طرف دیکھ کر خاموش ہوگئی۔ جس کی نظریں کھلی کھڑکی سے باہر آسمان پر چمکتے چاند کو دیکھ رہی تھیں۔

''ماہی! اس کی آنکھیں بالکل ان ستاروں جیسی روشن ہیں۔'' مائدہ نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا تو ماہم حیران ہی رہ گئی۔

''تم نے اس کی آنکھیں کب اتنے غور سے دیکھیں۔ لو بھلا اتنا وقت ہی کہاں ملا۔'' ایک تو وہ نشاء کو بڑی جلدی ہو رہی تھی اور ویسے بھی یہ بات تو مجھے اس رات اپنے بستر پر لیٹنے کے بعد پتہ چلی تھی کہہ کر خود ہی زور سے ہنس پڑی۔ ماہم کے لبوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی اور پھر مائدہ کے کہنے پر ماہم نے کئی اشعار اور ایک نظم لکھی تھی جسے پڑھ پڑھ کر مائدہ اڑتی پھرتی تھی۔

پھر خطوں میں مائدہ اپنے خوابوں کا ذکر کرتی۔ وہ کیا سوچتی ہے، کیا چاہتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ماہم اسلام آباد آتی تو مائدہ اسے لے کر جگہ جگہ گھوما کرتی۔ ماہم جانتی تھی وہ کیوں ایسا کرتی ہے۔ ہاں وہ بھی بے بس تھی اپنے دل کے ہاتھوں مگر بہت پر یقین تھی جبھی کہا کرتی۔

''ماہی کتنا عرصہ ہوگیا اور یہ دنیا کتنی بڑی ہوگئی ہے کہ ایک بندہ نہیں مل کے دے رہا۔'' اور ماہم اداس ہو جاتی تو مائدہ کا بے ساختہ قہقہہ اسے مخمصے میں ڈال دیتا اور مائدہ فوراً برگر کھانے کی فرمائش کر دیتی اور پھر سے ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو جاتی۔

پھر ماہم رہنے کے لیے اسلام آباد آ گئی۔ نشاء کے ایگزامز تھے۔ اس لیے فی الحال وہ اور عزیز ہی آئے تھے کیونکہ یہاں شادی بھی تھی۔

جس دن آفرین کی مہندی تھی اسی شام ماہم اسلام آباد پہنچی۔ گھر میں اطلاع نہیں دی گئی تھی اس لیے مائدہ تو مہندی میں جا چکی تھی۔

رات دو بجے مائدہ مہندی سے واپس آئی تو ماہم نیند پوری کرنے کے بعد اب فریش ہو چکی تھی اور مائدہ کی منتظر تھی اور مائدہ نے واپسی پر حسب عادت ماہ کو زوردار طریقے سے بھینچ کر انداز میں اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

''ہائے قسم سے ماہی میں کس طرح بتاؤں میں سوچ رہی تھی کہ کس طرح تمھیں آگاہ کروں اللہ ماہی۔'' مائدہ کی حالت عجیب ہی ہو رہی تھی۔ خوشی اس کے ہر انداز سے واضح تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مائدہ نے ماہم کو ایک مرتبہ پھر گھما ڈالا۔

''ہائے ماہی وہ مل گیا۔'' خوشی سے مائدہ کی آواز لرز رہی تھی۔ خوشی سے بے قابو وہ اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔

''واقعی۔'' ماہم حیران تھی، خوش تھی اور بے یقین بھی۔

''ہاں قسم سے تمھیں کیا بتاؤں کتنی مشکل سے میں خود کو کسی بھی حرکت سے باز رکھ پائی۔ قسم سے پہلے تو یقین ہی نہ آیا پھر حیران رہ گئی اور پھر خوشی خوشی۔ ہائے ماہی میں کیا کروں؟''

پھر تمام رات وہ ماہم کو علی کے متعلق ایک ایک بات بتاتی رہی۔

''ماہی اس کا نام علی ہے..... علی زاد۔ پتہ ہے وہ بہت سوبر ہوگیا ہے بہت ڈیسنٹ اف۔''

اور پھر وہ ہر پل ہی علی زاد کی باتیں کرتیں اور اب تو ماہم کو بھی ازبر ہوگیا تھا کہ وہ ہنستا بہت کم ہے اور مسکراتے ہوئے نچلے ہونٹ کا کونہ دانتوں تلے دبا کر مسکراہٹ روک لیتا ہے۔ جس طرف دیکھتا ہے روشنی بکھیر دیتا ہے۔ دھیمے دھیمے بولتا ہے تو ہر شے ٹھہر جاتی ہے۔ وقت بھی، موسم بھی اور میری دھڑکنیں بھی اور پھر ایک دم ہی اونچی واز میں گنگناتی۔

''دل دھڑکنے کا بہانہ ڈھونڈ لیتا ہے۔'' اور پھر خود ہی ہنستی۔

عرفان صاحب کو لاہور جانا تھا ان کے دوست کی بیٹی کی شادی تھی۔ کیونکہ تعلق بہت قریبی تھا اس لیے جانا بھی ضروری تھا۔ خدیجہ بیگم موسم کے زیر اثر تھیں اس لیے مائدہ کو جانا پڑ رہا تھا۔ ماہم کی موجودگی میں مائدہ جانا نہیں چاہ رہی تھی مگر ماہم کے زور دینے اور پاپا کے کہنے پر بمشکل راضی ہوئی۔ صرف برات تک کے لیے۔ مگر وہاں جا کر بے چاری پھنس گئی۔ کیونکہ جلال صاحب کی فیملی نے اتنے پیار سے اسے روکا کہ وہ انکار ہی نہ کر سکی اور اب وہ بغیر اطلاع کے آ گئے تھے اور مائدہ حسب عادت زور و شور سے مصروف عمل تھی۔

''ماہی۔'' ماہم نے مائدہ کو پکارا تو وہ ماہم کے انداز پر چونک گئی۔

''ہوں۔'' اور ماہم کے چہرے پر نظر جما دی۔ ماہم چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اور مائدہ کے ذہن میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔

''کیا بات ہے؟ ضرور بہت خاص ہوگی جلدی بولو۔'' اور ماہم نے کہا۔

''پہلے آنکھیں بند کرو اور وعدہ کرو تم مجھے کچھ کہے سنے بغیر پی۔سی میں ڈنر کرواؤ گی۔'' ماہم نے اسے کسی سرپرائز کے لیے مکمل طور پر تیار کر لیا اور مائدہ نے آنکھیں بند کیں اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ماہم اٹھی اور الماری سے گلدستہ اور خاکی لفافہ اٹھا کر مائدہ کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔

''آنکھیں کھول دو۔''

''ارے یہ کیا ہے؟'' مائدہ کے انداز میں حیرانگی تھی۔

''دیکھ لو۔'' ماہم کے کہنے پر عجلت سے اس

نے خاکی لفافے میں ہاتھ ڈالا تو ہرے رنگ کی ڈائری ہاتھ میں تھی۔

''ہاہ یہ کہاں سے ملی؟'' مائدہ نہ صرف حیران تھی بلکہ تشویش زدہ تھی۔

''ملی نہیں کسی نے بھجوائی ہیں ان پھولوں اور ڈائری کے اندر لکھے یہ پیغام سمیت اور وہ کون ہے اسے میں بھی جانتی ہوں اور تم بھی۔ بہتر ہے پہلے ڈائری پڑھ لو آرام سے پھر تمھیں ایک اور بمباسٹک نیوز سناؤں گی۔'' ماہم بظاہر بہت پرسکون نظر آ رہی تھی۔ جبکہ مائدہ ڈائری کے ورق تیزی سے پلٹ رہی تھی۔ اور پھر سامنے جگمگاتا علی زاد کا نام دیکھ کر وہ تقریباً پاگل ہی ہوگئی۔

''ہائے ماہی یہ اس کے پاس کیسے پہنچیں۔ ہائے میں تو پاگل ہو جاؤں گی۔'' ڈائری میں لکھی لفظ لفظ تحریروں کو پڑھتی وہ بے خود ہوتی جا رہی تھی۔

''اف میرے خدا۔ من کی آرزو یوں بھی پوری ہو جاتی ہے۔'' اور ماہم ڈر گئی کہ کہیں اس کی خوشیوں کو اس کی نظر نہ لگ جائے۔ اور پھر اس نے دھیرے دھیرے علی سے فون پر کی گئی بات بھی بتا دی اور یہ بھی کہ پرسوں پھر علی کا فون آئے گا اور مائدہ اس سے پوچھنے لگی۔

''اس کی آواز کیسی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔''

ایک دن ایک صدی کے برابر ہو گیا۔ ماہم مائدہ کو سارے گھر میں بے چینی سے گھومتا دیکھتی رہی۔ مامی بھی کئی مرتبہ پوچھ چکی تھیں کہ کیا پریشانی ہے۔

مائدہ کا صبح سے برا حال تھا۔ یوں تیار ہو کر گھوم رہی تھی جیسے علی فون کے ذریعے خود آ رہا ہو۔ دماغی پوزیشن تو تشویش ناک حالت تک خراب ہو چکی تھی۔ تمام کاموں میں گڑبڑ کرتی، بڑبڑاتی، ڈور بیل کی آواز پر فون کی طرف جھپٹی اور ماہم سر پیٹ لیتی۔

''ماہ دماغ درست کرو۔ اتنی بدحواس کیوں ہو رہی ہو۔'' اور مائدہ عرفان مسکین سی صورت بنا کر اس کی طرف دیکھتی۔

بے چینی کا عالم دوسری طرف بھی یہی تھا۔ ٹیلی فون کی بیل پر مائدہ فون کی طرف جھپٹی مگر ریسیور کان سے لگاتے ہی گویا وہ سکتے میں آ گئی۔ کمرے کی چوکھٹ پر کھڑی ماہم ''محبتیں جب شمار کرنا'' سینے سے لگائے اس کی طرف متوجہ تھی جبکہ مائدہ عرفان شاید کھڑے کھڑے ہی فوت ہو چکی تھیں یا پھر پتھر ہو گئی تھیں۔ ماہم کچھ دیر منتظر رہی کہ وہ کچھ بولے مگر پھر آگے بڑھی اور مائدہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ تو مائدہ نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

''کیا ہوا؟'' ماہم نے پوچھا۔

''کون تھا؟''

''وہی تھا علی۔'' مائدہ کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

''پھر بات کیوں نہیں کی؟'' ماہم کو غصہ آ رہا تھا۔

''کہاں تو انتظار میں فوت ہوئی جا رہی تھی اور اب۔''

''ماہم پلیز کچھ مت کہنا۔ ہائے اللہ کتنا مشکل کام ہے اس سے بات کرنا۔'' مائدہ نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی پھر سے گونج اٹھی تو دونوں نے فون کو دیکھا۔

''چلو اب بات کر لو ورنہ مامی آ جائیں گی ابھی بازار سے۔'' ماہم نے جلدی جلدی کہا۔ مگر مائدہ کی تو بولتی ہی بند ہو گئی تھی۔ مسلسل بجتی بیل اور مائدہ عرفان کا حواس باختہ چہرہ دیکھ کر ماہم سٹپٹا گئی۔

''پلیز ماہی تم ہی بات کر لو نا۔ اب تمھیں ہر بات کا تو پتہ ہے۔'' مائدہ نے التجائیہ انداز میں کہا تو ماہم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''دماغ ٹھیک ہے تمھارا؟'' ماہم نے تیز

لہجے میں کہا تو مائدہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''پلیز پیاری دوست۔'' اور پھر مجبوراً ماہم کو ہی علی سے بات کرنا پڑی جبکہ ایکسٹنشن پر ماؤتھ پیس پر مضبوطی سے ہاتھ رکھے مائدہ عرفان کی آنکھوں میں ستارے اتر آئے تھے اور چہرہ گلگوں ہو رہا تھا اور پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔

ماہم کو یہ بہت معیوب لگتا مگر مائدہ اگر اتفاق سے فون ریسیو بھی کر لیتی تو علی کی آواز کے ساتھ ہی اس کے ہوش اڑنچھو ہو جاتے۔ ہاتھ پاؤں پھول جاتے اور آواز تو بالکل ہی غائب ہو جاتی اور وہ فون رکھ کر یا ماہم کی طرف دوڑ لگاتی اکثر تو وہ اٹھی ہی ہوتی تھیں اور مائدہ فوراً ریسیور اسے تھما دیتی۔ اور ماہم اس کی مسکین صورت دیکھ کر فون اٹھا لیتی اور اسے ایکسٹینشن اٹھانے کا اشارہ کرتی اور علی اس کی ہیلو سنتے ہی کھل جاتا۔ دھیمے دھیمے انداز میں باتیں کرتا، ڈھیروں اشعار سناتا۔ جن میں کبھی ہجر و فراق کے حوالے ہوتے تو کبھی وصل قرب کی کہانی اور یہ سب سن کر مائدہ عرفان کا چہرہ گلنار ہوتا اور ماہم کی روح میں لفظ سرایت کر جاتے۔

اب وہ کوشش کرتی کہ کم سے کم بولے۔ اسی لیے علی اپنی سناتا اور وہ ہوں ہوں کیا کرتی۔ اور علی بھلا یہ سب محسوس نہ کرتا اسی لیے اس سے پوچھنے حتیٰ کہ اس بات پر معافی بھی مانگ لی جو بات اسے بری لگی ہو اور ماہم اس کے ملتجیانہ انداز پر مسکرا پڑی اور پھر مامی کی اچانک آمد کی وجہ سے فون بند کر دیا۔

مائدہ کو تو فکر لاحق ہو گئی کہ علی ناراض نہ ہو جائے۔ سو ماہم کی خوب منت سماجت کی کہ خود ہی علی کو فون کر لے پہلے تو ماہم راضی نہ ہوئی پھر ٹیلی فون سیٹ اپنے کمرے میں لے آئی اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔ دوسری طرف سے علی کی گمبھیر آواز نے اس کی ذات کے گنبد میں دلکش سی گونج دور تک پھیلا دی۔ وہ خاموش رہی۔

''ہیلو..... ہیلو۔'' علی کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔

''ہیلو ماہی..... ماہی تم ہی ہو ناں۔'' لمحے کی ہزارویں حصے میں وہ پہچان گیا تھا۔

''جی..... میں ہوں۔ پر آپ نے کیسے پہچان لیا؟'' وہ پوچھنا چاہتی تھی مگر یہ اور تمام سوالات اس کے دل ہی میں دم توڑ گئے اور دوسری طرف علی زاد نہ جانے کون سا شعر سنا رہا تھا۔ اور شعر کی نوعیت کا اسے مائدہ کے چہرے اس کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک سے ہو گیا اور پھر ماہم نے علی کو کہہ ہی دیا کہ آخر کب تک وہ اسی طرح باتیں کرتے رہیں گے؟ اور علی نے اسے یقین دلایا تھا کہ جلد ہی وہ گھر والوں کو بھیجے گا۔ شاید اسی ہفتے۔

مگر حیرت انگیز طور پر اس کی امی، زمیل کی امی کے ساتھ اسی شام آ گئیں اور اب مائدہ علی کی امی کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ گھبراہٹ اور شرم کے ملے جلے تاثرات لیے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر کھیلتی دبی دبی مسکراہٹ نے ماہم کے دل میں اجالے بکھیر دیئے تھے۔ علی کی چاہت اس کے چہرے اس کے پورے وجود سے خوشبو بن کر پھوٹ رہی تھی۔

ماہم نے ایک نظر مائدہ عرفان کے حسین سراپے پر ڈالی اور چائے کے برتن اٹھا کر کچن میں آ گئی۔ نہ جانے اسے کیا ہو رہا تھا۔ ذہن جیسے رک سا گیا تھا۔ کوئی گرہ تھی جو کھل کے ہی نہیں دے رہی تھی۔ پتہ نہیں وہ کیوں الجھتی جا رہی تھی۔ کہ فون کی گھنٹی نے اسے خیالات سے چونکا دیا اور وہ تیزی سے فون کی طرف لپکی۔ پہلا خیال ہی علی کا تھا۔

''ہیلو۔'' دوسری بیل تک وہ ریسیور اٹھا چکی تھی۔ پھولی ہوئی سانسوں کے دوران اس نے کہا اور حسب توقع دوسری طرف علی ہی تھا۔

"السلام علیکم۔" خاصا شوق انداز تھا۔
"او ہو لگ رہا ہے فون کے پاس ہی تھیں؟"
"جی نہیں تو۔" اس نے سانسیں درست کیں۔
"ماہی۔" علی کی آواز اور اس طرح پکارنے پر اس کی سانسیں تھم گئیں۔ دھڑکنیں سرپٹ دوڑنے لگیں۔
"ہوں۔" ماہم نے اپنے ہی انداز میں کہا تو وہ جھوم اٹھا۔
"ایک بات کہوں؟" اس نے جیسے اجازت مانگی۔
"جی۔" اس نے جواباً کہا۔
"جب تم ہوں کہتی ہو ناں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"
"جی۔" ماہم بس یہی کہہ پائی۔
"ہوں۔" علی نے منہ بند کر کے بالکل اسی کے انداز میں کہا تو وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔
"تمھاری ہنسی کتنی دلکش ہے بالکل ویرانے میں بہتے کسی جھرنے کی طرح سحر انگیز یا۔" علی نے شعر پڑھا۔
"آپ بھی بس۔" ماہم اتنا ہی کہہ پائی۔
"اب فون بند کروں؟" ماہم نے اجازت مانگی۔
"تمھاری مرضی۔ ویسے میں نے اس لیے فون کیا تھا کہ حالات کیا ہیں؟ ویسے امی جی کی ناکامی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور آج رات زمیل بھی واپس آ رہا ہے اپنا کیس تو بہت مضبوط ہے۔ تم تیاری شروع کر دو۔"
"تیاری..... تیاری کیسی؟" ماہم نے الجھ کر سوال داغا۔
"بھئی مابدولت سے ملنے کی بس یہاں تم لوگوں کی طرف سے ہاں ہوی ادھر مابدولت سہرے باندھ کر در جاناں پر حاضر ہوئے۔ اور پھر دیکھنا جتنا سناؤں گا اتنا ہی سنوں گا۔ اس ہوں سے کام نہیں چلے گا۔ اپنے آپ کو کب تک چھپاؤ گی۔ بس دو ماہ کی بات ہے۔" اس کا لہجہ بہت پر یقین تھا۔
"مگر آپ کو اتنا یقین کیسے؟ ابھی تو بات چلی ہے۔" ماہم کی بات پر وہ مسکراتا ہوا بولا۔
"مجھے اپنے جذبوں پر یقین ہے۔ اپنی محبت پر بھروسہ ہے۔ اپنی بے پناہ چاہت پر زعم ہے۔ یہی یقین تو مجھے تم تک لے آیا ہے۔ خیر ابھی تو ڈھیروں باتیں ہیں جو تم سے کرنی ہیں۔ محبت کا ایک خزانہ ہے جو تم پر وا کرنا ہے۔ اب تب بات ہوگی جب تمھارے نام کے آگے میرا نام جڑ جائے گا بالکل ہمارے دلوں کی طرح۔ اس حسین ملاقات تک کے لیے خدا حافظ۔ ماہی اس عرصے میں میں میرے نام کے خواب بنتا اور مجھے یاد کرنا۔ کرو گی ناں؟" اور ماہی صرف ہوں کہہ کر چپ ہو گئی۔ اور لائن کٹ گئی۔
"ماہی کیا ہوا؟" مائدہ جانے کب آئی تھی۔
"کس کا فون تھا؟"
"رانگ نمبر تھا۔" ماہم نے کہا اور خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔
علی کے جذبے واقعی شدید اور کھرے تھے تبھی تو اتنی جلدی سب کچھ طے پا گیا۔ علی کے والدین کا زور زمیل اور آفرین کی پرزور وکالت، ماہم کی زوردار قسم کی سفارش نے خوب کام دکھایا اور بس اگلے ماہ کی سات تاریخ مقرر کر دی گئی اور شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔
نشاء اور تہنیل بھی آ گئے تھے جبکہ عارفہ اور عذیر نے بعد میں آنا تھا۔ مائدہ اور ماہم بہت مصروف ہو گئیں۔ زمیل اور اس کے گھر والے علی کی طرف سے دستیاب ہوتے آفرین اور زمیل نے علی کا خوب ناطقہ بند کیا ہوا تھا۔ اور علی زاد کی دھیمی دھیمی مسکراہٹ چاندنی سی بکھیرتی رہتی۔

اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے تمام خاندان ہی تقریبات میں پیش پیش تھا اور علی زاد تو جیسے بادلوں پر پاؤں رکھے آسمان کی وسعتوں میں محو سفر تھا۔
شادی کے فنکشن شروع ہو چکے تھے۔ مائدہ کو مایوں بٹھا دیا گیا تھا۔ پیلے آڑھے پاجامے ڈھیلے ڈھالے کرتے پر تین گز کے مقلیش اور کنارے پر ہلکی سی کرن لگے دوپٹے میں خود کو چھپائے نکھری نکھری مائدہ بہت ہی حسین لگ رہی تھی۔ گھر میں مہمانوں کی چہل پہل تھی۔ ماہی، عارفہ، ماہم اور نشاء کی مصروفیت عروج پر تھی۔ عرفان صاحب، عذیر اور شہنیل کا بھی یہی حال تھا۔
آج دلہا والوں نے مہندی لانی تھی۔ گھر بھر میں صبح سے ہی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ہر کوئی اپنی تیاری میں ایڑھی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ کزنز مل کر مہندی سجا رہی تھیں۔ پھر سورج ڈھلتے ہی ہنگامے جاگ اٹھے۔ عجیب ہر بونگ مچ گئی۔ کوئی کپڑے پریس کر رہا ہے، تو کوئی استری کرنے کا منتظر ہے۔ کسی کا دوپٹہ غائب ہے۔ عجیب چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ اوپر سے فل والیم میں ڈیک بھی آن ہوا تھا۔ سب کی آوازوں میں گلوکارہ کی خوبصورت آواز دہائیاں دے رہی تھی۔
کوئی جائے تو لے آئے میری لاکھ دعائیں پائے
ماہم نے اس شعر سے تنگ آ کر ڈیک آف کر دیا۔ سارا دن بازار میں گھوم گھوم کر اس کا برا حال ہو گیا تھا اور وہ تھکن سے چور سر درد کی گولی کھا کر مائدہ کے قریب ہی لیٹ گئی اور مائدہ شاپر اٹھا اٹھا کر چیزیں دیکھنے لگی۔
ہم جانتے ہیں تم ہمیں ناشاد کرو گے
دل پھر بھی تمھیں دیتے ہیں کیا یاد کرو گے
گانوں کے بغیر سکون تھی نہ تھا۔ نہ جان کس نے ڈیک آن کر دیا اور ماہم کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے یا پھر ڈیک اٹھا کر باہر پھینک دے۔ مگر یہ دونوں باتیں ہی ناممکن تھیں۔ اس لیے مائدہ کے کہنے پر اپنے کمرے میں آ گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ اسے اپنے کمرے میں آ کر جیسے ڈھیروں سکون اس کے اندر تک اتر گیا۔ گھڑی پر ایک نظر ڈال کر وہ لیٹنے کا خیال ترک کر بیٹھی۔ اپنی دراز میں سے اپنی ڈائری نکال لی۔ ڈائری کھولی تو سامنے ہی ایک ہنستا مسکراتا چہرہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ماہم نے پین اٹھایا اور تصویر کی پشت پر چمکتے نام کے نیچے تحریر کر دیا۔
تیرے چہرے کے حسین نقش چھپا رکھے ہیں
ہم نے آنکھوں میں ستارے سے سجا رکھے ہیں
یوں چمکتا ہے تیرا نام ہتھیلی پہ میری
جیسے جگنو کئی مٹھی میں دبا رکھے ہیں
ماہم نے اپنی مہندی سے سجے سرخ ہاتھ دیکھے نشاء نے بہت مہارت سے ڈیزائن بنایا تھا۔ اس کی سلونی ہتھیلی سرخ ہو گئی تھی خوبصورتی سے بنے بیل بوٹوں کے بیچ میں ایم۔ اے لکھا ہوا تھا۔ ماہم نے اپنی سرخ ہتھیلی پر تحریر ان حرفوں کو دیکھا اور ایک آہ بھر کر ڈائری دراز میں ڈال دی۔
تمام لوگ گاڑیوں میں بیٹھ چکے تھے۔ ماہم اور نشاء کی تیاری دیکھنے کے لائق تھی۔ فیروزی آڑھے پاجامے میں بھوپالی کرتا بڑا سارا دوپٹہ شانوں پر ڈالے گولڈن کھسہ پہنے ماہم بہت حسین لگ رہی تھی۔ خاص طور پر اس کے کالے گھنے کمر سے نیچے آتے کھلے بال بہت غضب کے لگ رہے تھے۔
نشاء نے بھی ایسا ہی لباس پہنا تھا مگر اس نے پراندہ ڈال رکھا تھا اور مغلیہ دور کا کوئی شاہکار لگ رہی تھی اور پھر فرسٹ کزن ہونے کی وجہ سے وہ سب میں نمایاں تھیں۔ پوری تقریب میں وہ دونوں ہی چھائی رہیں۔
ماہم کی انفرادیت، خاموش انداز بہت

مسحور کن تھا جبکہ نشاء اپنی شوخی اور چنچل طبیعت کے باعث سب کی توجہ کا مرکز تھی۔ اور مہندی لگائی کے دوران بھی نشاء ہی زور وشور سے بولتی اور نیگ کے لیے چلاتی رہی۔ جبکہ ماہم اپنی عادت کے مطابق زیادہ خاموش ہی رہی۔

نشاء کے بار بار کہنے پر وہ بھی کہنے پر مجبور ہوگی مگر چند بار ہی نشاء کے ساتھ آواز ملائی علی تو دینے کو تیار تھا مگر زمیل بھی اپنے نام کا ایک اوپر سے علی کے کزنز معاملہ کافی دیر تک لٹکتا رہا۔

آخر ماہم کھڑی ہوگئی تھکن اس کے چہرے سے عیاں تھی گانے گانے کی وجہ پھر اتنی دیر سے نیگ وصولی کے لیے علی کا ہاتھ جکڑے بیٹھی رہی تھی کیونکہ نشاء اسے پہلے ہی پکا کر کے لائی تھی کہ پانچ سے کم پر تو چھوڑنا ہی نہیں۔ ادھر زمیل بھی اپنے نام کا ایک تھا۔ ماہم علی کا ہاتھ چھوڑ کر کھڑی ہوئی تو زمیل اور دوسرے لڑکوں نے زوردار ہوٹنگ کی۔ نشاء کا تو پارہ ہائی ہوگیا۔ گھنٹے بھر کی محنت پر پانی جو پھر گیا تھا۔ مگر علی نے سامنے لگی کرسیوں کی طرف جاتی ماہم کی طرف دیکھا۔ اور ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نشاء کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور لڑکیوں کا زوردار نعرہ فضا میں بکھر گیا۔

برأت کے روز بھی سب کا جوش عروج پر تھا۔ ماہم نے اپنی پسند سے مسٹرڈ کلر کا خوبصورت شلوار سوٹ لیا تھا۔ جس پر ریشمی دھاگوں اور شیشوں کا کام عجیب بہار دکھا رہا تھا۔ لمبے بالوں میں ڈھیلے بل دیئے ہچکولے کھاتی ناگن سی چوٹی دیکھنے والوں کو بے طرح متاثر کر رہی تھی۔

جب وہ مائدہ کے ساتھ پارلر سے واپس آئی تو برأت آ چکی تھی۔ سب کی زبان دولہا کی وجاہت و خوبصورتی کے الفاظ ادا کر رہی تھی۔ اب نشاء کی زبانی سن کر اس کا شوق دوآتشہ ہوگیا۔ اسی لیے شہنیل کو بلانے کے بہانے دوسری طرف لان میں چلی گئی اور اندر جانے کی بجائے اس طرح سائیڈ پر ہوئی کہ باقی تمام حصہ اس کی نظر کے سامنے تھا۔ بالکل سامنے سٹیج پر اپنے دوستوں اور کزنز کے درمیان وہ بیٹھا تھا۔ وائٹ تنگ پاجامہ، شیروانی، سر پر کلاہ جمائے گلے میں گلاب کے پھولوں کے ہار ڈالے، پیروں میں سلیم شاہی کھسہ پہنے، سرمئی آنکھوں سمیت وہ بہت ہی شاندار لگ رہا تھا۔ زمیل اسے دیکھ دیکھ کر اپنی شادی یاد کر رہا تھا۔ علی کی آج کی تیاری میں تمام تر عمل دخل اسی کا تھا۔

نکاح ہوا اور پھر علی کو لان کی دوسری طرف بلا لیا گیا جہاں مائدہ عرفان راجستھانی لہنگے کے اناری سرخ رنگ گولڈن اور میک اپ گولڈ کی بھاری جیولری میں اپنی تمام تر نزاکتوں اور حشر سامانیوں سمیت کوئی ماورائی مخلوق لگ رہی تھی۔

آج تو دودھ پلائی کی رسم کے وقت مائدہ کی دونوں پھپھو یو کے بچے بھی شامل تھے جو نشاء کے ساتھ مل کر بھرپور طریقے سے کارروائی کر رہے تھے۔ البتہ ماہم اب نشاء کے ساتھ ان سب کی ملی بھگت پر اور اپنی جان چھوٹ جانے پر سکون سے تمام کارروائی دیکھ رہی تھی۔ بڑی عمرانہ کے ساتھ ان کے چھوٹے صاحبزادے اعتصام آئے جبکہ چھوٹی پھپھو کی دو بیٹیاں عمامہ اور فاطمہ ہی آئی تھیں اور سب ہی نے شادی کو انجوائے کیا۔

نشاء اور شہنیل عمامہ اور فاطمہ اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے جبکہ اعتصام شہنیل کے ساتھ اپنا کیمرہ اٹھائے اس دلچسپ منظر کو دیکھنے میں محو تھا۔

''مامی جی۔'' ماہم کو آواز دیتی سٹیج تک آئیں تو ماہم آئی۔

''جی مامی۔'' کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اف۔'' ماہم کی لمبی چوٹی آفرین کے نیچے دب گئی تھی جو کچھ دیر پہلے ہی اس کے برابر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ مگر اس شور میں کس کو اس کی منحنی سی

اف سنائی دیتی۔ آفرین سوری کہہ کر اٹھ گئی تو اس نے اپنی چوٹی کو آگے کی طرف ڈالا۔ دوپٹہ شانے پر درست کیا اور مائدہ کے کان میں ابھی آئی کہہ کر سٹیج سے نیچے اتر آئی۔

مامی سے بات کر کے وہ پلٹی تو سب کا مشترکہ شکریہ سن کر مسکرا اٹھی۔ جبکہ نشاء اپنی اس شریفانہ واردات پر کامیابی سے سٹیج پر کھڑی ہزار ہزار کے نوٹ تاش کے پتوں کی طرح سب کو دکھا رہی تھی۔

رخصتی کے وقت فطری سوگواری تھی۔ دلہن کی رخصتی کے ساتھ ہی گھر میں اداسی اتر آئی۔

ولیمے کی تقریب بہت زبردست تھی۔ علی گیٹ پر ہی مہمانوں کو ویلکم کہہ رہا تھا اور جب وہ لوگ گیٹ سے اندر داخل ہو رہے تھے اس وقت بھی وہ کسی مہمان سے سلام دعا میں مصروف تھا۔ ان لوگوں کو دیکھ کر آگے بڑھا۔ ممانی اور کو ماموں جان کو سلام کر کے دعائیں لیں اور مامی جی کے ساتھ کھڑی ٹکائی بلونفیس سے کام والے سوٹ پر ہائی ہیل کے شوز پہنے لمبے بالوں کو کلپ میں قید کیے ہلکے میک اپ اور نازک جیولری میں خاموش کھڑی ادھر ادھر دیکھتی ماہم کے قریب آ کر آہستہ سے سلام کیا تو وہ جواب دیئے بغیر مامی جی کے ساتھ آگے بڑھ گئی اور وہ علی اعتصام، شہنیل، عمامہ اور فاطمہ کے پاس چلا آیا۔

ماہم مائدہ کے پاس پہنچی جس کے چہرے پر چاہت پا لینے کے بعد دھنک رنگ روشنی بن کر نظر آ رہے تھے۔ اس کی باتوں سے محبت کی خوشبو آ رہی تھی اور ماہم پر سکون ہوگئی۔ اعتصام کھٹا کھٹ تصویریں بنا رہا رہا تھا اور فوکس میں کون تھا اس کا اندازہ سب کو ہو چکا تھا۔ وہ سب کو مائدہ کے ساتھ بٹھا کر تصویریں بنا رہا تھا۔ علی کو بھی بلا لیا گیا۔ مائدہ اور علی کی تصویریں بنائی گئیں۔

''ماہی۔'' اعتصام عنصر نے ماہم کو پکارا تو وہ مائدہ سے باتوں میں مصروف تھی۔

''ماہم۔''

''ہوں۔'' اعتصام کے دوبارہ پکارنے پر ماہم نے ہوں کہا اور پھر سے مائدہ کی طرف متوجہ ہوگئی اور عنصر جو ماہم کی اکیلے تصویریں بنانا چاہ رہا تھا۔ اس کی مصروفیت دیکھ کر اپنے بیگ سے لینز نکالنے چلا گیا۔

شادی کی تقریب ختم ہوئی کچھ مہمان ابھی گھر میں ہی تھے۔ عارفہ کے ساتھ ہی عمرانہ، عمامہ، فاطمہ اور عنصر کراچی چلے گئے اور گھر میں ماہم اور مامی جی ہی ہوتے۔ مائدہ اور علی دعوتوں میں مصروف تھے پھر بھی گھنٹہ دو گھنٹہ کے لیے آتے تو گھر میں رونق سی ہو جاتی۔ مائدہ ماہم سے باتوں میں مگن ہو جاتی اور علی عرفان صاحب سے اور خدیجہ بیگم سے باتیں کرتا۔ ماہم سے علی کی کبھی ڈائریکٹ بات چیت صرف سلام اور حال احوال تک ہی محدود تھی۔

کراچی سے اماں کا فون آیا تھا۔ خدیجہ بیگم ریسیور تھامے عارفہ سے محو گفتگو تھیں۔ کافی لمبی گفتگو ہوئی اس سے پہلے خیر خیریت ہی پتہ کی جاتی تھی۔ یا ماہم کی زیادہ یاد ستاتی تو عارفہ بات کر لیتی۔ خدیجہ بیگم کی اس طویل گفتگو کا راز شام کو عرفان صاحب کے آتے ہی کھل گیا۔ جب مامی جی نے بہت خوش ہو کر بتایا کہ عمرانہ آپا نے عنصر کے لیے ماہم کی بات کی ہے اور چائے کی ٹرے لاتی ماہم کو بہت پیار سے دیکھا اور پاس بٹھا کر اس کی پیشانی پر بوسہ دے ڈالا اور یہ تمام لوگوں کا اس کی ذات پر اندھا اعتماد ہی تھا کہ اس کی بات اعتصام عنصر سے پکی کر دی گئی۔ بلکہ دو ماہ بعد شادی کی تاریخ بھی دے دی گئی۔

مائدہ کو جونہی خبر ہوئی حسب عادت ماہم کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کا گال چوم لیا اور

علی نے اسے مبارک باد دی تو وہ سر جھکا کر رہ گئی۔ نشاء نے بھی فون پر ماہم سے بات کی اور اسے خوب تنگ بھی کیا۔ اور ماہم سوچ رہی تھی عنصر جیسے لاابالی بے فکرے ہر دم بلند قہقہے بکھیرتے، ہنسی مذاق کرتے نوجوان کے ساتھ وہ کس طرح زندگی بسر کر سکے گی۔ جبکہ وہ ابھی ان سب باتوں کے لیے خود کو تیار نہ کر پا رہی تھی۔

مائدہ اور علی سیر کے لیے روانہ ہوئے گئے تھے اور ان کے ہنی مون کے لیے سارا پروگرام ہی زمیل اور آفرین نے مرتب کیا تھا اور ان دونوں کو سوچنے کا موقع ملا نہ کسی سے ملنے کا بس زمیل نے آ کر اسے مطلع کیا تیاری کرنے کا حکم دیا اور ٹکٹ ہاتھ پر رکھ کر اسے حیران کر دیا اور ایک ماہ بعد وہ واپس آئے تو مائدہ کا حسن اپنی جلوہ گری کے عروج پر تھا۔ علی بھی بہت فریش لگ رہا تھا۔ اور آتے ہی مائدہ ماہم کے ساتھ شاپنگ کرنے میں مصروف ہوگئی۔

شادی کی تقریب کا آغاز ہوا تو ایک بار پھر ہنگامے جاگ اٹھے۔ تمام فنکشن عرفان صاحب کے گھر میں ہی ہوئے کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ ماہم ان کی بیٹی ہے اور اسی حیثیت سے اس گھر سے رخصت ہو۔ مائدہ سارا وقت ماہم کے پاس ہی رہتی۔ علی کی محبت میں سرشار خود پر نازاں مائدہ علی کی والہانہ محبت کے بارے میں بتاتی۔ اس کی پسند ناپسند اور مائدہ بھی علی کی سوچ کے مطابق خود کو ڈھال رہی تھی۔ ماہم نے ہی تو اسے سمجھایا تھا کہ وہ ویسی ہی بن جائے جیسا علی اسے دیکھنا چاہتا ہے تاکہ علی بھی اپنی محبت پر اپنی بیوی پر فخر کرے اور اب مائدہ اپنے محبوب و مجازی خدا کے کہے گئے لفظوں کا آئینہ بن رہی تھی۔

ماہم کی مہندی جانی تھی۔ سب تیاریوں میں مگن تھے۔ ماہم بہت خاموش تھی اور سب اس خاموشی کو جدائی کے دکھ اور ملک سے اپنے پیاروں سے دوری کا غم سمجھ رہے تھے اور واقعی وہ بہت پریشان تھی کہ بے شک عمرانہ خالہ اس کی محبت کا دم بھرتی تھیں ان کی بیٹیاں بھی اس سے مل چکی تھیں سبھی پرخلوص تھے مگر دل کو اپنی ہی پریشانی تھی۔ اسی لیے سب نے اسے کہہ کہہ کر اس کے کمرے میں بند کر دیا تاکہ وہ آرام کرے۔ مگر آرام کیا خاک کرتی۔ سوچ سوچ کر تھک گئی تو اپنی ڈائری نکال کر بیٹھ گئی اور علی زاد کی ہنستی ہوئی تصویر اس کی نگاہوں کے سامنے تھی وہی تصویر جو علی نے ڈائری میں رکھ کر اس گلدستے کے ہمراہ بھیجی تھی۔ علی سے بات کرنے کے علاوہ مائدہ کے منہ سے اس کی اس قدر تعریف سنی تھی کہ وہ بہت متجسس ہوگئی تھی اور پھر علی سے مجبوراً یا مائدہ کے خیال سے باتیں کرتی رہی اور علی زاد کی دلکش آواز میں کہے گئے جملے اس کے کانوں میں ہر دم گونجتے رہتے۔ خاص طور پر علی جب بہت پیار سے اسے پکارتا، ماہی اور دوسرے سیٹ پر موجود مائدہ کے دمکتے چہرے کو دیکھتے ہوئے بھی وہ ہواؤں میں جھولے جھولنے لگتی۔

اس کی آنکھیں خواب بننے لگتیں۔ مگر جب وہ بیدار ہوئی تو خبر ہوئی کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اور علی کو پتہ چلا تو کیا ہوگا وہ مائدہ پر اعتبار نہ کر پائے گا۔ وہ اتنا بھی بے وقوف نہیں کہ آوازوں کے واضح فرق اور عادت و اطوار کے نمایاں بدل کو نہ سمجھ پائے اور پھر اس نے مہندی کی شام علی سے بات کی تھی وہ شاکڈ ہوگیا تھا۔ بے یقین تھا، مگر ماہم نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ گزری باتوں کو بھلا کر اپنی زندگی کا آغاز کرے۔ مائدہ تو یوں بھی علی کی محبت میں پوری ڈوب چکی تھی۔

ماہم نے علی سے معافی مانگی۔ اس سے درخواست کی تھی۔ وہ واقعی شرمندہ تھی۔ اس نے

وعدہ نبھا لیا تھا اپنی اور ماہم کی باتوں سے کسی کو بھی باخبر نہیں کرے گا اور پھر خاموشی تھی دونوں طرف۔ علی زاد خود سے الجھتا رہا۔

مہندی آئی تو وہ بے خودی کے سے عالم میں مہندی لگوائی دیکھتا رہا اور ماہم کو دیکھ کر علی زاد گنگ رہ گیا تھا۔ وہ نازک سلونی سی لڑکی، نازک احساسات، نرم جذبات کی مالک تھی۔ وہ سحر انگیز باتیں کرنے والی پیاری سی لڑکی ہی اس کے بہت قریب تھی اور بہت دور بھی۔

علی کی حالت عجیب سی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک چہرہ تو کانوں میں گونجی آواز۔ کبھی گلابی چہرے پر شریر مسکراہٹ سجائے مائدہ عرفان چھم سے آنکھوں میں اتر آتی تو کبھی ماہم کو مترنم ہنسی اس کا دل بیقرار کر دیتی۔ علی نے شادی تک خود کو سنبھالا اور پھر مائدہ عرفان کو دلہن کے روپ میں دیکھ کر وہ اپنا آپ فراموش کر بیٹھا۔ وہ اپنے آپ کو باور کراتا رہتا تھا کہ مائدہ عرفان اس کا وہ خواب ہے جس کے لیے وہ برسوں کی ریاضت سے گزرا ہے۔ یہی وہ جسے اس نے پرستش کی حد تک چاہا ہے۔ اپنے آپ کو بدل ڈالا۔ ماہم نے اس سے کہا تھا کہ وہ اس کے درمیان ایک رابطہ تھی۔ جیسے فون کی بے جان تاریں۔ مگر اب علی کو لگتا جیسے مائدہ اس کے درمیان رابطہ تھی مگر اب جانے کیا ہوگیا تھا مگر وہ ایک وعدے کی زنجیر میں قید تھا۔ اس زنجیر سے آزادی بھی نہیں چاہتا تھا۔

ماہم رخصت ہو کر چلی گئی اور گھر ایک مرتبہ پھر بے رونق ہوگیا۔ شادی کے چند روز بعد ہی ماہم انگلینڈ فلائی کر گئی تھی۔

ماہم کے تمام خدشے ایک ایک کر کے غائب ہوگئے۔ عنصر جسے وہ ایک لاابالی سا نوجوان سمجھ رہی تھی وہ تو بہت ہی گہرا نکلا۔ شادی کے پہلے روز ہی اس نے اپنا آپ کھلی کتاب کی مانند اس کے سامنے وا کر دیا اور تب ماہم کو پتہ چلا وہ ہر دم بلند قہقہے بکھیرنے والا ہر دم غیر سنجیدہ نظر آنے والا اعتصام عنصر کس قدر ذمہ دار، خوش ذوق، خیال کرنے والا اور ٹوٹ کر چاہنے والا شخص تھا۔ کتنے آرام سے اس نے ماہم کو کہا تھا اسے ایسے ہم سفر کی چاہ تھی جو اس سے اسی کی طرح ٹوٹ کر محبت کرے۔ اس کے احساسات و جذبات کی زبان بغیر لفظوں کے ہی سمجھ جائے اور پہلی ہی نظر میں ماہم میں اسے اپنی تمناؤں اپنے خواب کی تعبیر نظر آئی تھی اور وہ ہر دم ماہم کی محبت میں ڈوبا رہتا، اپنی خوش قسمتی پر شکر ادا کرتا اور ماہم کے دل میں روح کی گہرائیوں تک اس کا صداقت سے پر لہجہ اتر جاتا۔ کبھی یادوں کی ہوا چلتی تو وہ عنصر کی سنہری آنکھوں میں اپنا آپ تلاش کرنے لگی اور عنصر کی باتوں اس کی قربت میں پرسکون ہو جاتی۔ عنصر کی کامیاب محبت اس کی مسکراہٹ ماہم کے زخموں پر مرہم کا کام کرتی۔

علی کو لگتا تھا وہ دو حصوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ مائدہ بولتی تو اس کا لہجہ اور انداز ماہم کی آواز میں بدل جاتی۔ علی زاد کے جسم اور روح کی پکار الگ الگ تھی۔ علی زاد نے اپنی چاہت پانے کے لیے اپنے آپ کو بدلا تھا۔ ایک طویل انتظار کیا تھا۔ اس کی سلگتی آنکھوں کو کچھ سکون ملا تھا۔ مگر روح بے قرار تھی۔ پھر بھی وہ مطمئن تھا۔ اپنے جذبوں کی صداقت پر۔ مائدہ وقت کے ساتھ علی زاد کی سوچوں کا آئینہ بنتی گئی تھی۔ اس کی چاہت بادل بن کر علی زاد کے جلتے سلگتے من پر پڑتی تو اسے سیراب کر دیتی۔ ماضی سے رابطہ توڑ لینا ممکن تو نہیں تھا۔ اس کے دل کے در وا ہوگئے تھے۔ ایک میں مائدہ تھی، اپنی بے لوث چاہت سمیت اور دوسرے میں ایک بے نام چاہت جو طلب میں نہیں ڈھلی تھی۔

☆☆☆

عشق میں کیسی مجبوری

تحسین اختر

''مسکان آؤ میرے ساتھ تمھیں انکل سے ملواؤں۔'' رباحہ نے مسکان سے کہا۔

''نہیں روبی ماما پسند نہیں کرتیں کہ میں یوں کسی اجنبی سے ملوں۔''

''کم آن آؤ تو ہم کون سا دور جا رہے ہیں بس وہ سامنے ہی تو جانا ہے۔'' اس نے رشین سلاد کا ڈونگا فریج سے نکال کر بریانی کی ڈش کے ساتھ رکھا اور مسکان کو پکڑا دیا۔

''تم ہی دے آؤ نا۔'' وہ ابھی بھی ہچکچا رہی تھی۔

''زیادہ دیر نہیں بیٹھیں گے بس پانچ منٹ۔'' وہ اسے مسلسل ترغیب دے رہی تھی۔

''اور اگر ماما کو پتہ چل گیا تو؟'' وہ اپنی ماما سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کرتی تھی۔

''بابا نہیں پتہ چلتا تم آؤ تو۔'' وہ باہر نکلتے ہوئے بولی۔ ناچار اسے بھی رباحہ کے پیچھے قدم بڑھانے پڑے۔

''مجھے ہمیشہ سے یہ بلیک ماربل سے بنا ہوا گھر اونچے اونچے درختوں میں گھرا ہوا پراسرار اور خاموش سا بہت اٹریکٹ کرتا ہے۔'' مسکان نے رباحہ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''اسی لیے تو تمھیں ساتھ لائی ہوں کہ اس پراسرار اور خوبصورت گھر کو اندر سے بھی دیکھ لو۔''

''میں تمھارے جیسی بہادر نہیں ہوں پھر ماما کی اجازت کے بغیر کہیں جانا مجھے خود اچھا نہیں لگتا۔''

''کچھ نہیں ہوتا۔'' رباحہ نے کہہ کر ڈور بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔

سلیم دوڑتا ہوا آیا اور گیٹ کھول دیا۔

''آپ تو بیل پر ہاتھ رکھ کر ہٹانا ہی بھول جاتی ہیں بی بی جی۔'' سلیم نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا ہے؟'' رباحہ نے اس کے ہاتھ میں بڑا سا چمچ دیکھ کر کہا۔

''میں کچن میں تھا آپ نے اتنی لمبی بیل دی کہ میں جلدی میں دوڑتا ہوا یہاں تک آیا ہوں۔''

''کیا پکا رہے تھے؟'' رباحہ نے دونوں اطراف سے پھولوں میں گھری روش پر چلتے ہوئے کہا۔

''ماش کی دال۔''

''کیا یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے ماش کی دال۔ تم انکل کو ایسے ہی کھانے کھلاتے ہو کیا؟''

''صاحب کی پسند سے بنا رہا ہوں۔''

''چھوڑو ماش کی دال شام میں بنا لینا۔ میں یہ رشین سلاد اور بریانی بنا کر لائی ہوں یہ پکڑو۔'' اس نے ڈش مسکان کے ہاتھ سے پکڑی اور سلیم کے ہاتھ میں تھما دی۔

''ہائے باجی آپ کتنی اچھی ہیں۔ میرے تو منہ میں پانی آ رہا ہے۔''

''اچھا زیادہ باتیں نہ بناؤ یہ تمھارے لیے نہیں ہیں۔ میں انکل کے لیے لائی ہوں کہاں ہیں وہ؟''

''اپنے بیڈروم میں ہیں۔'' وہ جواب دے کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔

''آؤ مسکان۔'' وہ مسکان کا ہاتھ پکڑ کر ان کے بیڈروم کی طرف بڑھ گئی۔ بیڈروم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سامنے ہی بیڈ پر نیم دراز وہ اخبار

پڑھ رہے تھے۔

''ہیلو انکل۔'' رباحہ نے ان کے قریب جا کر کہا۔

''اوہ رباحہ بیٹی آؤ..... آؤ۔'' وہ اخبار ایک طرف رکھ کر خوش دلی سے بولے۔

''انکل یہ میری دوست مسکان جس کا میں اکثر آپ سے ذکر کرتی ہوں۔''

''اچھا..... اچھا آؤ بیٹی۔'' انھوں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی تو پھر گویا ہٹانا ہی بھول گئے۔ ویسا ہی دراز اور متناسب سراپا۔ ویسی ہی

روشن پیشانی۔ ویسا ہی ستواں ناک اور گلاب کی پنکھڑیوں سے ہونٹ۔ اف اللہ اتنی مشابہت۔

''انکل کہاں کھو گئے ہیں؟'' رباحہ کی آواز انھیں واپس حال میں کھینچ لائی۔

''اوہ سوری آؤ بیٹی بیٹھو۔'' انھوں نے سائیڈ پر پڑے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں وہاں بیٹھ گیں۔

''تمھارے پاپا کا کیا حال ہے رباحہ؟''

''ٹھیک ہیں۔ شام کو آئیں گے آپ کی طرف۔''

''اچھا مسکان بیٹا آپ ایزی ہو کر بیٹھیں۔'' انھوں نے مسکان کی طرف سرسری سا دیکھ کر پیار سے کہا۔ ورنہ اس کا چہرہ ان کے دل میں ہلچل سی مچا گیا تھا۔

''میں تمھارے بارے میں انکل کو اتنا کچھ بتا چکی ہوں کہ اب مزید کسی تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے انکل مسکان کو میری طرح آپ کا گھر بہت پسند ہے۔ ہم دونوں بڑی حسرت سے اس گھر کو دیکھا کرتی تھیں۔'' رباحہ نے مسکان اور ان کو بیک وقت مخاطب کر کے کہا۔

اتنے میں سلیم کولڈ ڈرنکس لے آیا۔

''صاحب جی کھانا کب کھائیں گے باجی آپ کے لیے بریانی بنا کر لائی ہیں۔''

''اور رشین بلا دھی۔'' رباحہ نے ٹکڑا لگایا۔

''کیوں تکلیف کرتی ہو رباحہ؟''

''تکلیف کیسی انکل آپ بھی تو میرے لیے میرے پاپا کی طرح ہیں ان کے لیے بنایا تو آپ کے لیے بھی لے آئی اس میں تکلیف کیسی؟''

''تم بہت اچھی ہو رباحہ۔''

''تھینکس انکل اور مسکان کیسی ہے؟''

''مسکان بھی بہت اچھی ہے۔'' انھوں نے نظریں رباحہ کی طرف ہی رکھیں۔

''اچھا انکل ہم چلتے ہیں۔''

''اتنی جلدی؟''

''ہاں پھر آئیں گے ایکچولی مسکان اپنی ماما کی اجازت کے بغیر آئی ہے۔ اس لیے زیادہ دیر بیٹھیں گے تو وہ پریشان ہوں گی۔

''اوکے پھر بھی ضرور آنا مسکان بیٹی۔'' انھوں نے ایک نظر مسکان پر ڈالی اور کہا۔

''جی انکل۔'' وہ سعادت مندی سے کہہ کر رباحہ کے پیچھے باہر نکل گئی۔

''مہک..... مہک تم جانے کہاں ہو گی اس وقت۔ لیکن تم تو میرے آس پاس ہی ہو اور یہ لڑکی مسکان کتنی مشابہت ہے تم میں اور اس میں۔ زندگی کم ہوتی جاتی ہے۔ دن گزرتے جا رہے ہیں اور ایک بھی سحر ایسی نہیں آتی جو تمھارا کوئی سندیسہ، کوئی پیغام لائے۔ میں زندگی میں صرف ایک بار تمھاری شکل تمھاری وہ ستارہ آنکھیں، تمھارا وہ چاند چہرہ دوبارہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک بار۔''

حسنین احمد نے سر بیڈ کی پشت سے لگایا اور یادوں کی کن من کن من برستی بوندوں میں بھیگنے لگے۔

وہ اپنی لاڈلی اور چہیتی بہن سیرت کی شادی میں شرکت کے لیے گوجرانوالہ سے ملتان آئے تھے۔ گوجرانوالہ میں ان کی لیکچرر شپ کی جاب تھی۔ دو سال پہلے انھوں نے پی سی ایس کا امتحان دیا تھا۔ اس میں کامیاب ٹھہرے تھے اور انھیں گوجرانوالہ میں تعینات کر دیا گیا تھا۔ سیرت نے فون کر کر کے انھیں پاگل کر دیا تھا کہ وہ جلدی آنے کی کوشش کریں۔ لیکن کالج میں ایگزام کی وجہ سے انھیں جلدی چھٹی نہیں مل سکی تھی۔ گھر والے پریشان تھے اور سیرت ناراض لیکن وہ پھر بھی مہندی والے دن ہی پہنچ سکے تھے۔ گھر آتے ہی وہ کاموں میں لگ گئے تھے۔ انھیں وہ اپنی لاڈلی بہن کو بڑی شان سے رخصت کرنا چاہتے تھے اس لیے سارا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا

تھا کہ کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

وہ باہر گیٹ پر لائٹیں لگوا رہے تھے مزدور دیوار پر چڑھے ہوئے تھے اور وہ نیچے کھڑے ہدایتیں دے رہے تھے۔

''باؤ جی سب جگہ لائٹیں لگ گئی ہیں میں سوئچ آن کر کے آتا ہوں۔ آپ ادھر کھڑے ہو کر دیکھیں کوئی کمی وبیشی تو نہیں رہ گئی۔'' ایک مزدور بولا اور سوئچ آن کرنے چلا گیا۔

روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا اور اردگرد کی ہر شے رنگ و نور میں نہا گئی۔ اسی وقت مہک نے گیٹ سے اندر قدم رکھا۔ رنگ برنگی روشنیوں میں اس کا وجود جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ حسنین تو پلکیں جھپکنا بھول گیا۔ اورنج اور گرین کلر کے لباس میں مہارت سے کیا ہوا میک اپ اس کے وجود کو دوآتشہ کر رہا تھا۔ ہاتھوں میں گیندے کے پھول مہک رہے تھے۔ حسنین ساکت تھا اور وہ اپنا راستہ روکے جانے پر پریشان۔ پھر اسے ہوش تب آیا جب وہ سائیڈ سے ہو کر اندر بڑھ گئی اور وہ وہیں کھڑا سوچتا رہا۔

''کون ہو سکتی ہے اتنا مکمل اور ہوش اڑا دینے والا حسن۔'' وہ پہلی نظر میں گھائل ہو گیا تھا۔

پھر باہر کے مختلف کام کرتے ہوئے بھی حسنین بار بار اندر کی طرف جا رہا تھا۔ اتنے میں دنیا اس کی کزن ماریہ کی بیٹی اسے بلانے آئی۔

''ماموں آپ کو سیرت آنٹی بلا رہی ہیں۔''

''اچھا ابھی آتا ہوں۔'' اور کچھ دیر بعد اندر جاتے ہوئے قدم من من بھاری ہو رہے تھے اور عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔

''کیا پاگل پن ہے میں کوئی ٹین ایجر تو ہوں پھر یہ کیسی بدحواسی ہے؟'' وہ اپنے نادان دل کو بھی جھڑک رہا تھا لیکن سب کچھ بے اثر ہو رہا تھا۔

''بھائی آپ گاڑی نکالیں ہمیں پارلر جانا ہے۔'' سیرت نے حسنین سے کہا۔ وہ سیرت کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ نظر ایک بار پھر اٹھی تو واپس ہٹنا بھول گئی۔

''بھائی.....!''

''ہوں.....'' وہ گڑبڑایا۔

''آؤ۔'' وہ گاڑی کی چابی کو سائیڈ پاکٹ میں محسوس کرتے ہوئے بولا۔

سیرت بڑی سی چادر اوڑھے گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔ وہ بھی ساتھ تھی۔ اس سے گاڑی چلانا مشکل ہو رہا تھا۔

''بھائی یہ مہک ہے۔'' کچھ دیر بعد جانے سیرت کو کیا خیال آیا تھا کہ اس نے خود ہی تعارف کی رسم نبھائی۔

''مہک۔'' گاڑی میں ہر طرف اسی کی مہک پھیل گئی تھی۔ اتنی حسین صورت پر ایسا خوصورت نام اس کی شخصیت کو چار چاند لگا رہا تھا۔

''بھائی فضہ کے چچا کی بیٹی ہے مہک۔ ان کے ابو کا ٹرانسفر ملتان میں ہو گیا ہے پہلے یہ لوگ صادق آباد میں رہتے تھے۔ ابھی تو یہ اپنے چچا کے ساتھ رہ رہے ہیں لیکن جلدی ہی اپنا گھر لے لیں گے۔'' سیرت نے تفصیل بتائی۔

''یا اللہ اپنا گھر انھیں کہیں نہ ملے۔ یہ یہیں رہ جائیں۔'' میرے دل نے اس لمحے شدت سے دعا مانگی تھی۔ فضہ وغیرہ ہمارے پڑوسی تھے اور گذشتہ کئی سالوں سے اکٹھے رہتے رہتے رشتہ داروں سے بھی زیادہ پیار تھا ہم لوگوں میں۔

''فضہ کہاں ہے؟'' مجھے خیال آیا کہ مہمان یہاں ہے اور میزبان غائب۔''

''اس کا پیر ہے سوموار کو کہہ رہی تھی آج ہی تیاری کر لوں گی تاکہ کل کو بارات میں بھرپور طریقے سے شریک ہو سکوں۔''

''اچھا۔'' میں نے مرر مہک پر سیٹ کیا اور خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔

''صاحب جی چائے..... صاحب جی۔''

سلیم نے مجھے ہلایا تو میں گویا گہرے خواب سے بیدار ہوا۔

''کیا بات ہے؟'' مجھے اس وقت اس پر بہت غصہ آیا تھا۔ میں اس لحاظ سے خود کو خوش نصیب سمجھتا تھا کہ جب بھی چاہتا یادوں کی محفل سجالیتا تھا لیکن یہ سلیم کسی نہ کسی طرح مجھے یادوں کی دنیا سے واپس لے آتا تھا۔

''صاحب جی بڑی اچھی ہوا چل رہی ہے نا۔''

''ٹھیک ہے پھر مجھے لے چلو باہر۔''

اس نے مجھے وہیل چیئر پر بٹھایا اور باہر لان میں لے آیا۔ کچنار کے اکٹھے تین درختوں پر جامنی پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ مارچ کا مہینہ تھا۔ دھیرے دھیرے چلتی پھولوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ اس نے کچنار کے درختوں کے نیچے میری چیئر روک دی جامنی پھول ٹوٹ ٹوٹ کر میری جھولی میں گرنے لگے۔ سلیم نے مجھے کتنی دفعہ کہا تھا۔

''صاحب جی کچنار پر کلیاں آ گئی ہیں۔ انھیں توڑ کر گوشت میں ڈال کر پکاؤں؟''

بہت سے لوگوں کی طرح اسے بھی کچنار گوشت بہت پسند تھا۔ لیکن میں نے اسے کلیاں توڑنے سے سختی سے منع کیا تھا۔ کبھی کبھی کونپلوں کو کھلنے سے پہلے ہی نوچ لینا کہاں کی شرافت ہے۔ اسے میری بات عجیب لگی تھی اور شاید غصہ بھی آیا تھا۔

''کلیاں کھل جائیں گی تو پھول بھی مرجھا جائیں گے۔ نیچے گر جائیں گے پھر کیا فائدہ؟''

''تم نہیں سمجھو گے سلیم۔'' میں جانتا تھا میری بات میری منطق سلیم کی سمجھ سے باہر ہے۔

''صاحب جی آپ ہوا کے مزے لیں میں ذرا مارکیٹ تک جا رہا ہوں۔ چائے کی پتی اور گھی ختم ہو چکا ہے وہ لے آؤں۔''

''پیسے ہیں؟''

''ہاں جی۔''

میں ایک ہی دفعہ گھر کے خرچے کے لیے سلیم کو پیسے دے دیتا تھا۔ پھر وہ جانتا اور اس کا کام۔ وہ خود بہت سمجھدار تھا۔ گھر کو اچھے طریقے سے چلانا بخوبی جانتا تھا۔ اس لیے مجھے کبھی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔

وہ چلا گیا تو تنہائی میں ایک دفعہ پھر میں یادوں کے حصار میں تھا۔

آج سیرت کی بارات تھی۔ مجھے صبح سے ہی اس کا انتظار تھا۔ میں ادھر سے ادھر پھرتے ہوئے مسلسل اسی کو سوچے جا رہا تھا۔ سیرت ماریہ کے ساتھ پارلر جا چکی تھی۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں برآمدے میں کرسیاں سیٹ کروا رہا تھا۔ جب وہ فضہ اور فضہ کی امی اندر آئیں۔

''السلام علیکم خالہ جان۔'' میں نے فضہ کی امی کو دیکھ کر فوراً سلام کیا۔

''وعلیکم السلام کیسے ہو حسنین۔ تم تو آتے ہی ایسے مصروف ہوئے کہ صورت بھی نہ دکھائی۔''

''بس خالہ کام ہی اتنے تھے کہ آتے ہی مصروف ہو گیا اور تم سناؤ فضہ گڑیا کیسی ہو اور پیپرز کی تیاری کیسی ہوئی ہے؟'' میں نے خالہ جان کو جواب دے کر فضہ سے پوچھا تو فضہ نے پیچھے مڑ کر کہا۔

''آؤ مہک۔''

مہک کے نام پر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ خالہ جان اندر جا چکی تھیں۔ وہ دونوں ابھی کھڑی تھیں۔ پنک اور گولڈن سوٹ میں وہ آج کل سے زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ گولڈن لمبے بال سوٹ سے ہم رنگ ہو کر ہوا میں اڑ رہے تھے۔ چنا ہوا مختصر سا پنک دوپٹہ بالوں کو چھپانے سے قاصر تھا۔ وہ دونوں وہیں کھڑی جانے کیا باتیں کر رہی تھیں۔ میں صرف ان کے ہلتے ہونٹوں کو دیکھ رہا تھا۔ میری سماعتیں کچھ بھی سننے سے قاصر تھیں۔ وہ دونوں اندر چلی گئیں اور میں وہیں کھڑا تھا۔

پھر تیسری قیامت خیز گھڑی وہ تھی جب سیرت رخصت ہو رہی تھی۔ سب کی آنکھیں پرنم تھیں۔ بابل کا گھر چھوڑنے کا دکھ ہی ایسا ہوتا ہے۔ میں نے اور بابا جان نے قرآن پاک کے سائے میں سیرت کو رخصت کیا تھا۔ سب کچھ نہایت خوش اسلوبی سے انجام پا گیا تھا لیکن اب ایک محسوس کی جانے والی اداسی گھر کے در و دیوار پر چھا گئی تھی۔ میں امی کو تسلی دے رہا تھا۔ جب میری نظر برآمدے کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی مہک پر پڑی۔ وہ رو رہی تھی۔ کاجل پھیل کر آنکھوں کو مزید خوبصورت بنا رہا تھا۔ اتنی حساس لڑکی ہے یہ۔ سیرت کی رخصتی پر کیسے رو رہی ہے۔ فضہ امی کے لیے پانی لینے کچن میں گئی تھی وہ واپس آئی تو میں نے مہک کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''فضہ اسے چپ کرواؤ۔''

فضہ میرے اشارے پر مہکے کے پاس چلی گئی اور اسے چپ کروانے لگی۔

میری چھٹیاں ابھی باقی تھیں۔ میں فرصت کے لمحات کو جی بھر کر انجوائے کر رہا تھا۔ مہک نے بھی میری نگاہوں کا ارتکاز محسوس کر لیا تھا۔

ایک دن وہ کچھ لینے ہمارے گھر آئی تو میں نے واضح طور پر اس کی چال میں لرزش محسوس کی تھی۔ وہ مجھ سے گھبرا رہی تھی۔ شاید اس سے بات کرتے وقت میری نگاہیں جیسے اس کے چہرے پر جم جاتی ہیں۔ اس بات نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ امی جان نہا رہی تھیں۔ وہ جانے لگی تو میں نے اس کا راستہ روک لیا۔

''مہک تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔'' پلٹتے وقت میں مجھے اپنی آواز ہوا کا خوشگوار جھونکا محسوس ہوئی تھی۔ وہ بے حد نروس ہو رہی تھی۔

''مجھے گھر جانا ہے۔'' اس نے مدھم سی آواز میں کہا۔

''میں تمھیں گھر جانے سے منع نہیں کر رہا میں تو تمھیں صرف اپنے دل کا حال سنا رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ تمھاری معصوم صورت ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔'' اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے بہہ رہے تھے۔ جانے وہ گرمی کا اثر تھا یا میری باتوں کا۔ میں اپنی بات کہہ کر راستے سے ہٹ گیا اور وہ منٹوں میں صحن کا دروازہ پار کر گئی۔ میں اپنی بات اس تک پہنچا کر بہت ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

ساری آنکھیں تھیں آئینے اس کے
سارے چہروں میں انتخاب تھا وہ
سب گھل مل کے اجنبی رہنا
اک دریا نما سراب تھا وہ
خواب یہ ہے کہ وہ حقیقت تھا
یہ حقیقت ہے کوئی خواب تھا وہ
دل کی دھرتی پہ آسماں کی طرح
صورت سایہ و سحاب تھا وہ

''یار بڑے دن ہو گئے ہیں انکل سے ملے ہوئے۔ کیوں نہ آج ان کی طرف چلا جائے۔'' رباحہ مسکان سے کہہ رہی تھی۔

''نا بابا مجھے تو تم معاف ہی رکھو۔ اس دن بھی تمھارے بہت مجبور کرنے پر میں تمھارے ساتھ چلی گئی تھی۔ اب ماما کو میں روز روز دھوکا نہیں دے سکتی۔''

''تو ٹھیک ہے ابھی دیکھو پھر میرا کمال۔'' وہ اٹھ کر ٹیلی فون اسٹینڈ تک آئی اور مسکان کے گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

''ہیلو' آنٹی رباحہ بول رہی ہوں۔ ہاں..... ہاں مسکان میرے پاس ہی ہے۔ آپ پریشان مت ہوں۔ اچھا آنٹی یہ ہمارے ساتھ ہی میرے ایک انکل رہتے ہیں میں ان سے ملنے

جا رہی تھی سوچا مسکان کو بھی ساتھ لے جاؤں۔ نہیں آنٹی ایسی کوئی بات نہیں۔ بھلا ایسی ویسی جگہ یہ میں مسکان کو لے کر جاؤں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔ او کے خدا حافظ اینڈ تھینک یو۔"

"لو اب بتاؤ چل رہی ہو یا نہیں؟ آنٹی نے اجازت دے دی ہے۔"

"اب تو ضرور چلوں گی۔" مسکان بھی خوش ہو کر بولی۔

مسکان کا گھر رباحہ کے گھر سے دو لائنیں پیچھے تھا جبکہ رباحہ اور انکل کے گھر ایک ہی لائن میں کچھ فاصلے پر تھے۔

گیٹ کھلا ہوا تھا۔ سلیم پائپ سے پودوں کو پانی دے رہا تھا اور انکل ہاتھ میں چھوٹی سی قینچی پکڑے گلاب کے پودے کی کانٹ چھانٹ کر رہے تھے۔

"رباحہ انکل وہیل چیئر پر؟" مسکان انھیں وہیل چیئر پر بیٹھے دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔

"اوہ یار کیا میں نے تمھیں بتایا نہیں وہ معذور ہیں دونوں ٹانگوں سے۔"

"اوہ ویری سیڈ۔" مسکان کو بہت دکھ ہوا تھا۔ اتنی مکمل شخصیت کا مالک اپنی ذات میں ادھورا ہوگا یہ کبھی مسکان نے سوچا بھی نہیں تھا۔

"آؤ بچو وہاں کیوں کھڑی ہو؟"

"ہیلو انکل۔" دونوں نے ایک ساتھ کہا اور ان کے قریب چلی آئیں۔

"کیسی ہو تم دونوں؟"

"بالکل اے ون آپ کیسے ہیں؟" رباحہ بولی۔

"میں بھی الحمدللہ ٹھیک ہوں۔"

سلیم کچھ دیر بعد کولڈ ڈرنکس لے کر آیا تو رباحہ بولی۔

"آج ہم صرف کولڈ ڈرنکس نہیں پئیں گے۔ آج ہم اور بھی بہت کچھ کھائیں گے کیونکہ آج ہم باقاعدہ پرمشن لے کر آئے ہیں۔"

"ویری گڈ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ سلیم تم ایسا کرو جو جو کچھ بھی گھر میں ہے سب لے آؤ۔"

"اور مسکان آپ کیا کرتی ہیں؟" انھوں نے مسکان کو چپ بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔

بلیک اسکارف کے ہالے میں سنہری بال چمک رہے تھے۔ وہ نگاہیں چرا گئے۔ مسکان دھیرے دھیرے انھیں اپنی شب و روز کی مصروفیت کا حال بتانے لگی۔

"آپ کے فادر کیا کرتے ہیں؟"

"ان کا انتقال ہو چکا ہے۔" مسکان کے جواب دینے سے پہلے رباحہ بول پڑی۔

"بہت افسوس ہوا بیٹا لیکن قدرت کے کاموں میں ہمارا کیا دخل۔ اس کی ماما سکول میں پڑھاتی ہیں۔ یہ اور اس کی ماما اکیلے ہی رہتی ہیں۔" رباحہ نے مزید بتایا۔

"کسی دن ملواؤں گی میں آپ کو اپنی ماما سے۔" ماما کے ذکر پر مسکان کے چہرے پر فخریہ مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔

اندھیری رات تھی۔ ایک عالم محو خواب تھا۔ بس وہ جاگ رہے تھے۔ نیند ان سے کوسوں دور تھی۔ انھوں نے وقت دیکھا بارہ بجنے والے تھے۔ پھر انھوں نے لیٹے لیٹے ٹی آن کیا۔

تم سے الفت کے تقاضے نہ نبھائے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے

ان کا ہاتھ ایک چینل پر آ کر رک گیا تھا۔ گلوکارہ درد بھری آواز میں ایک جادو سا جگا رہی تھی۔ وہ گانے کے بولوں میں الجھے ہوئے جانے کہاں جا پہنچے۔

ان کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں آج انھیں واپس گوجرانوالہ جانا تھا۔ دل بہت اداس ہو رہا تھا۔ یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اپنا سب کچھ تو وہ وہیں چھوڑے جا رہے تھے پھر گوجرانوالہ پردیس بن گیا تھا۔ ملتان سے پہلے انسیت تھی اب تو اس مٹی سے عشق ہو چلا تھا۔

"آپ جا رہے ہیں یہ سوچے بغیر میں کیسے رہوں گی؟" مہک نم آنکھوں سے کہہ رہی تھی۔ گزرے چند دنوں میں وہ بے حد قریب آ گئے تھے۔

"تم ایسے کرو گی تو میں جا نہیں پاؤں گا۔"

"تو مت جائیں۔" اس کا دل مچل مچل کر کہہ رہا تھا۔

"لگی جانا ضروری بھی ہے اور مجبوری بھی۔ اول تو میں یہاں ٹرانسفر کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر میں تمھیں اپنے ساتھ گوجرانوالہ لے جاؤں گا۔"

"وہ کیسے؟" وہ حیرانگی سے بولی۔

"بیاہ کر۔"

اس کے جسم کا سارا خون چہرے پر سمٹ آیا تھا۔

"میں وعدوں میں ہی نہ رہ جاؤں کہیں؟"

"ایسے مت کہو مہک تم تو میری زندگی ہو اور اپنی زندگی کو کبھی کوئی چھوڑ سکتا ہے بھلا۔" وہ امید اور انتظار کا دامن مہک کے ہاتھ میں پکڑا کر گوجرانوالہ چلے آئے۔

ازل سے تا ابد جاناں
فلک کے چاند تاروں سے
میری دھرتی کے ذروں سے
پہاڑوں کی بلندی سے
صبا کی شوخیوں سے
اور پھولوں کی ملاحت سے
تپش خورشید کی
اور چاند کی روپہلی کرنوں سے
افق کی وسعتوں
اور نیلگوں گہرے سمندر سے
کہیں زیادہ کہیں بڑھ کر
مجھے تم سے محبت ہے

"ہاں حسنین احمد مجھے تم سے ایسی ہی محبت ہے، اتنی ہی شدت سے میں تمھیں چاہتی ہوں لیکن کیا کروں میں رسم و رواجوں کی پابند ایک لڑکی بھی تو ہوں۔ میں اتنا واضح اظہار نہیں کر سکتی۔ یہ محبت اس کی شدتیں میرے دل کو وسیع سمندر میں جتنا بھی گہرائی میں لے جائیں۔ اوپر سے میں ایسی ہی پرسکون رہوں گی۔ مجھے اپنے پندار کا بھی بھرم رکھنا ہے۔ مجھے اپنی ماں کی تربیت کا خیال رکھنا ہے۔ اپنے باپ کی عزت کی پرواہ کرنی ہے۔ ہاں اگر مجھے ان سب چیزوں کی پرواہ نہ ہو تو حسنین احمد میں سب زنجیریں توڑ کر تمھارے پاس چلی آؤں کہ تمھارے بنا جینا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ وہ مدھم چاندنی میں رات کے آخری پہر میں کھڑکی کے پاس کھڑی بہت شدت سے حسنین احمد کو سوچ رہی تھی۔

انھوں نے ماں کو فون پر اپنی پسند بتا دی تھی۔ مہک ایسی لڑکی نہ تھی جس کو کوئی رد کر سکتا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک مکمل لڑکی تھی۔ ماں کو بھی مہک بہت پسند تھی پھر ان کے خوبرو بیٹے کے ساتھ تو مہک جیسی پیاری لڑکی ہی جچ سکتی تھی یہ ان کا بھی خیال تھا۔

"میں ان لوگوں سے جلد ہی بات کروں گی۔" وہ جوش سے بولی تھیں۔

"نہیں ماں ابھی نہیں میں ملتان آؤں گا تب بات کرنا ابھی نہیں۔"

"ٹھیک ہے جیسے تمھاری مرضی لیکن تم کب تک آ رہے ہو؟"

"بہت جلد ماں۔"

"اپنا خیال رکھنا بیٹا۔ خدا تمھیں اپنی حفاظت میں رکھے۔" ماں نے دعائیں دے کر فون بند کر دیا تھا۔

حسنین احمد کو اپنی منزل قریب بہت قریب

نظر آ رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ وہ ساری رات اس نے خیالوں ہی خیالوں میں مہک سے باتیں کرتے ہوئے گزار دی تھی۔

گرمیوں کی چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا ان چھٹیوں میں گھر جائے گا تو اپنے گھر والوں کو مہک کے گھر اس کا ہاتھ مانگنے بھیجے گا۔ وہ یہ چند دن گن گن کر گزار رہا تھا۔

کوچ گوجرانوالہ سے ملتان جا رہی تھی۔ حسنین احمد بہت خوش تھا۔ آنے والے لمحات کا تصور ہی کتنا خوش کن تھا۔ جیسے ہی کالج بند ہوئے اس نے اپنا رخت سفر باندھا تھا۔ مہک مجھے دیکھ کر کتنا خوش ہوگی۔ وہ مہک کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ جب اس نے زوردار دھماکے کی آواز سنی۔ پھر ایک چیخ و پکار اور پھر انھیں اردگرد کا ہوش نہیں رہا تھا۔ ایکسیڈنٹ بہت شدید تھا۔ ان کی کوچ سامنے سے آنے والے ٹرک سے ٹکرا گئی تھی۔

انھیں ہوش آیا جب اس سانحے کو گزرے دو دن ہو چکے تھے۔ پہلے تو انھیں کچھ سمجھ نہ آئی کہ وہ کہاں ہیں۔ پھر ایک دم سے یاد آیا کہ وہ کوچ میں تھے۔ جب ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔

''اف اللہ۔'' خوف کے مارے پورے بدن میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا۔

''تو کیا میں زندہ ہوں؟'' پہلا خیال یہی آیا تھا۔

کچھ دیر بعد اسے امی اور ابو کے چہرے نظر آئے تھے۔ ان کی جیب سے ملنے والے شناختی کارڈ سے ان کے گھر اطلاع دی گئی تھی۔ ان کو آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ دونوں ان کی طرف لپکے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ خود بھی انھیں پریشان دیکھ کر حوصلہ چھوڑ بیٹھے تھے۔

''آپ پلیز ایسے مت کریں۔ مریض کو حوصلہ دینے کی بجائے آپ لوگ خود رو رہے ہیں۔'' نرس نے ڈرپ ہٹاتے ہوئے کہا تھا۔

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بیٹا تمھیں ہوش آ گیا ہے۔'' ابو جان نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں اب۔ آپ لوگ کیوں رو رہے ہیں؟'' وہ ابھی دواؤں اور انجکشنوں کے زیر اثر تھا۔ اس لیے یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ عمر بھر کے لیے دونوں ٹانگوں سے محروم ہو گیا ہے۔

زندگی ایک دم سے ہی بہت بے رحم ہو گئی تھی۔ اس حادثے نے سب ارمان سب خواب چھین لیے تھے۔ وہ اپنے ادھورے وجود کے ساتھ زندہ تو تھے لیکن ایک بے جان لاش کی مانند۔ سب سپنے کہیں کھو گئے تھے۔

کل شام کو ہی تو مہک کی امی ان کے پاس آئی تھیں اور رو رو کر فریاد کی تھی کہ ''بیٹا تم مہک کو سمجھاؤ وہ تم سے شادی کرنا چاہتی ہے تم اسے کسی طرح منع کر دو۔ تمھارے سوا وہ کسی اور کی بات نہیں مانے گی۔ بیٹا تم خود سوچوں میں اس کی زندگی برباد ہوتے کیسے دیکھ سکتی ہوں۔'' وہ جاتے ہوئے کہہ گئی تھیں۔

''تو کیا مہک اب ایک بھولا بسرا خواب ہو جائے گی؟ کیا میں اس کے بغیر رہ پاؤں گا؟ لیکن میں اسے کیا دے پاؤں گا' ادھورے وجود کے ساتھ۔ میں تو خود دوسروں کا محتاج ہو گیا ہوں۔ میں اس کا سہارا کیسے بن سکتا ہوں۔'' گذشتہ شب انہی سوچوں میں گزر گئی تھی وہ ایک پل بھی سو نہ پائے تھے۔

لیکن فیصلہ تو بہر حال انھیں کرنا تھا۔ محبت قربانی بھی تو مانگتی ہے۔ ضروری نہیں طلب ہی طلب ہی سب کچھ ہو۔ سچی محبت خود غرضی سے بالکل پاک ہوتی ہے اور وہ مہک سے سچی محبت کرتے تھے۔ انھوں نے پیغام بھیج کر مہک کو بلوایا تھا۔ مہک پیغام سنتے ہی بھاگی آئی۔ اسے دیکھتے

ہی ان کی آنکھوں کی بجھتی شمعیں جلنے لگی تھیں۔ لیکن یہ تو کوئی اور تھی۔ ملگجے کپڑے بکھرے بال اور زرد چہرہ۔

''مہک تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟''

''کیا ہوا ہے مجھے؟'' اس کی آواز میں درد ہی درد تھا۔

''تمھیں پتہ ہے تمھیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے کتنا دکھ ہو رہا ہے کیا تم نے مجھے دکھ دینے کے لیے یہ حالت بنا رکھی ہے؟''

''میں آپ کو دکھ دوں گی؟ کیسی بات کرتے ہیں؟'' وہ محبت سے بولی۔

''اچھا سنو خالہ بتا رہی تھیں تمھارا کزن سلمان آ رہا ہے جرمنی سے۔''

''ہاں تو پھر؟''

''پھر کیا بھئی کیسا بندہ ہے یہ سلیمان۔ تمھیں کیسا لگتا ہے؟'' میں نے لہجے کو نارمل رکھنے کی پوری کوشش کی۔

''آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''سیدھی سی بات ہے تمھاری رائے پوچھ رہا ہوں۔ خالہ جان تمھاری شادی کرنا چاہ رہی ہیں اس سے۔''

''آپ بھی؟'' اس نے شاکی نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور اٹھ کر باہر جانے لگی۔

''ٹھہر جاؤ مہک میری پوری بات سن کر جاؤ' وہ رکی نہیں دروازے تک پہنچ گئی۔

''تو آج تم بھی میری بے بسی کا تماشا دیکھ رہی ہو۔ میں اب تمھارا راستہ نہیں روک سکتا اس لیے تم میری بات سننا نہیں چاہتی۔'' اس بات پر اس کے بڑھتے قدم رک گئے تھے۔

''ادھر آؤ بیٹھو۔'' وہ سامنے کرسی پر بیٹھی تو آنکھوں سے آنسو بھی نکلنے لگے۔ اس کے آنسو مجھے اپنے دل پر گرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے لیکن میں اس لمحے کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ مجھے محبت میں سرخرو ہونا تھا۔

''یہ کیا پاگل پن ہے؟''

''یہ پاگل پن نہیں ہے۔ آپ بدل جائیں گے میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔''

''میں بدلا نہیں ہوں۔ مجھے قدرت نے بدل دیا ہے۔ اب میں تمھارے قابل نہیں رہا۔ مہک تمھیں میری محبت کی قسم آج زندگی میں پہلی دفعہ تم سے کچھ مانگ رہا ہوں۔ میرے ادھورے وجود کو لوگوں کی نظروں میں قابل نفرت مت بنانا۔ جو تمھارے گھر والے کہتے ہیں چپ چاپ مان لو۔ میں سمجھوں گا تم نے محبت کا حق ادا کر دیا۔''

اس کے آنسوؤں میں تیزی آ گئی تھی۔

''آپ مجھ سے میری زندگی مانگ لیں میں اپنی جان نکال کر آپ کی ہتھیلی پر رکھ دوں گی لیکن پلیز اپنے یہ الفاظ واپس لے لیں۔''

''مجھے تمھاری زندگی نہیں چاہیے مجھے اپنی بات کا بھرم چاہیے بولو تم کیا کہتی ہو؟'' وہ خاموش رہی۔

''بولو مہک مجھے اور اذیت مت دو۔''

کتنے لمحے ایسے ہی خاموشی کی نذر ہو گئے۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ پر خاموش تھے میں اپنے دل کے ٹکڑے سمیٹ چکا تھا اور وہ اس عمل سے ابھی گزر رہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کتنی دیر بعد کہا اور اٹھ کر باہر بھاگ گئی۔ اس کے جانے کے بعد دو آنسو حسنین احمد کی آنکھوں سے نکلے اور خاموشی سے ان کے گریبان میں جذب ہو گئے۔

محبت کرنے والے سنا ہے
آنکھوں میں تارے لیے پھرتے ہیں
اور چہرے پر قوس قزح کے
رنگ بھی سارے لیے پھرتے ہیں
ہاں بات ہے ساری قسمت کی
ورنہ اپنی بھی خواہش تھی

کہ
تارے دسترس میں ہوتے
سارے رنگ دھنک کے اپنے بس میں ہوتے
بات تو ساری قسمت کی ہوتی ہے۔ بعض لوگ قسمت بنتے بنتے رہ جاتے ہیں۔ موتی کی طرح ہاتھ سے پھسل جاتے ہیں اور بعض لوگ زندگی میں کہیں نہیں ہوتے مگر وہ زندگی بن جاتے ہیں

ساتھ والے گھر میں ڈھولک بج رہی تھی۔ دو دن بعد مہک' سلیمان حسن کی زندگی میں رنگ بکھیرنے جا رہی تھی۔ اس نے امی سے کہہ کر دروازے' کھڑکیاں بند کروا دیئے تھے لیکن ڈھولک کی تیز آواز بند دروازوں سے بھی نکل کر اس کی سماعتوں میں اتر رہی تھی۔ مہک دوبارہ ان کے گھر نہیں آئی تھی۔ اب وہ یہاں لینے بھی کیا آتی۔ سب کچھ تو ختم ہو گیا تھا۔ اس کا ہر راستہ انھوں نے خود بند کر دیا تھا۔

کس قدر تکلیف دہ تھا آرزوؤں کا سفر
مسئلہ در مسئلہ اور سانحہ در سانحہ

ایک سانحے کے بعد زندگی مسلسل حادثوں کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ آج پتہ چلا تھا کسی اور کا کہہ دینا اور کسی اور کا ہوتے دیکھنا اپنے اندر کتنا نمایاں فرق رکھتا ہے۔ ہمت اور برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔

''یا اللہ یہ دن دیکھنے سے پہلے موت ہی کیوں نہ دے دی۔'' دل پر زخم لگے تھے۔ ہر زخم مر جانے کی دعا مانگ رہا تھا۔ ان مسرت بھری آوازوں اور گیتوں کو اس گھر میں بجنا تھا' گونجا تھا۔ مہک کو دلہن بن کر ان کے کمرے میں آنا تھا۔ لیکن اب تو سب کچھ بدل گیا۔ جگہ بدل گئی قسمت بدل گئی مقدر بدل گیا۔ آج مہک کی رخصتی کا دن تھا۔ انھوں نے نیند کی گولیاں کھا کر وہ دن گزارا تھا۔ ہوش سے بے ہوشی اچھی تھی۔

اگلے دن وہ نیند سے بیدار ہوئے تو ہر طرف سکون تھا' خاموشی تھی۔ طوفان تھم چکا تھا۔ لیکن طوفان کے بعد کے اثرات تو باقی تھے۔ ہر چیز کھنڈر ہو گئی تھی۔

پھر وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ وقت کے ایک ایک لمحے کے حساب انھوں نے دیا تھا۔ انھیں مہک کی اور مہک اور ان کی کوئی خبر نہ تھی۔ معذوری نے ان کی زندگی سست بنا دیا تھا۔ پھر جب یکے بعد دیگرے امی اور ابو جان کا انتقال ہو گیا تو انھوں نے اپنا آبائی گھر بیچ دیا۔ اس گھر میں اس کے پیاروں کی یادیں تھیں۔ مہک کی محبت کے ریزہ ریزہ سپنے تھے۔ وہ یہاں رہ رہ کر پاگل ہونے لگے تھے۔ جاب تو کب کی چھوڑ چکے تھے۔ کتابوں کے ترجموں پر گزارا ہوتا تھا اب۔ پھر انھوں نے اپنے دوست وقار کے کہنے پر پنڈی کے ایک پرسکون علاقے میں سیاہ پتھروں سے بنا پودوں میں گھرا یہ گھر خریدا اور یہاں شفٹ ہو گئے۔

ٹی وی سے شوں شوں کی آواز آ رہی تھی۔ رات کی نشریات کا اختتام ہو چکا تھا۔ وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے تھے۔ کئی گھنٹوں سے ایک ہی پوزیشن میں لیٹے لیٹے بازو سن ہو رہے تھے۔ گردن اکڑ گئی تھی۔ آج پھر انھوں نے کئی سالوں کا سفر گھنٹوں میں طے کیا تھا تھکن تو ہونا تھی۔ رات گہری ہو چلی تھی۔ انھوں نے ٹی وی آف کیا۔ سائیڈ لیمپ بجھایا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئے۔ نیند آنکھوں سے میلوں دور تھی اور ذہن درد سے شل ہو رہا تھا۔

خیال و خواب ہوا برگ و بار کا موسم
بچھڑ گیا تیری صورت بہار کا موسم
کئی رتوں سے مرے نیم وا دریچوں میں
ٹھہر گیا ہے ترے انتظار کا موسم
وہ آگ ہے کہ مری پور پور جلتی ہے
مرے بدن کو ملا ہے چنار کا موسم
وہ میرا نام لیے جائے اور میں اس کا نام
لہو میں گونج رہا ہے پکار کا موسم

واہ کیا کمال کی شاعرہ تھی یہ پروین شاکر بھی۔ دل سے احساسات کو کھینچ کر صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کا بہترین فن اس کے علاوہ اور کسی کے پاس نہیں تھا۔ مجھے اس کے ہر ہر لفظ میں اپنے جذبات کی ترجمانی کا احساس ہوتا تھا۔

اچانک اس پرسکون ماحول میں ارتعاش سا پیدا ہوا پھر کسی کی چیخ کی آواز آئی۔ میں نے کرسی کو گھسیٹا اور باہر لان میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس لے آیا۔ سامنے کا منظر بے حد واضح تھا۔ رباحہ فرش پر پاؤں پکڑے بیٹھی تھی۔ مسکان اس پر جھکی ہوئی تھی۔ سلیم پاس کھڑا تھا۔ میں اس منظر کو دیکھ کر سمجھ سکتا تھا کہ ہوا ہوگا۔

کچھ دیر پہلے سلیم اپنے من پسند مشغلے سے جی بہلا رہا تھا۔ وہ فارغ وقت میں پانی کا پائپ لگا کر پانی کا چھڑکاؤ کرتا رہتا تھا۔ ابھی بھی وہ گیٹ کے پاس پائپ لیے کھڑا تھا۔ میرا خیال تھا کہ رباحہ اور مسکان گیٹ کھلا دیکھ کر اپنے دھیان میں آئی ہوں گی اور رباحہ گیلے فرش پر سے پھسل گئی۔

''لگ رہا ہے بہت گہری چوٹ آئی ہے۔'' مسکان اس کے پاؤں کا معائنہ کرتے ہوئے بولی۔

سلیم کرسی لے آیا تھا۔ مسکان نے کھینچ کھانچ کر رباحہ کو گیلے فرش سے اٹھا کر کرسی پر بٹھا دیا تھا۔ وہ تکلیف کی شدت سے رونے لگی۔

''پاپا بھی گھر پر نہیں ہیں کیا کروں؟'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''ڈاکٹر کے پاس کیسے جائیں مجھے تو گاڑی بھی چلانا نہیں آتی۔'' سلیم شرمندگی سے کہنے لگا۔

''ڈرائیور بھی نہیں ہے۔''

''ماما گھر پر ہیں۔ رباحہ تم بیٹھو میں انھیں فون کر کے بلاتی ہوں۔ وہ ابھی آ جائیں گی۔'' مسکان اندر رہائشی کمروں کی طرف چلی گئی فون کرنے۔ میں جو چیئر گھسیٹتا ہوا باہر آ رہا تھا مسکان کو دیکھ کر رک گیا۔

''انکل وہ رباحہ کو چوٹ لگ گئی ہے۔ میں ماما کو بلانا چاہتی ہوں فون کر کے۔''

''ٹھہرو مسکان یہ ڈاکٹر ہاشمی کا فون نمبر ہے پہلے اس نمبر پر ٹرائی کرو شاید ڈاکٹر صاحب مل جائیں۔''

''جی انکل۔'' مسکان نے کارڈ پکڑتے ہوئے کہا۔

''انکل وہ تو ہاسپٹل چلے گئے ہیں۔'' مسکان نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔

''چلیں پھر آپ اپنی ماما کو بلا لیں۔'' وہ فون کرنے لگی تو میں رباحہ کے پاس جانے کے لیے مڑا۔

''ماما آ رہی ہیں چپ ہو جاؤ رباحہ۔'' مسکان باہر آ کر رباحہ کو تسلی دینے لگی۔

''ارے رباحہ بیٹا بس کرو اب چپ ہو جاؤ۔'' مجھ سے واقعی اس کی تکلیف دیکھی نہ جا رہی تھی۔ میں اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔

اتنے میں کھلے گیٹ سے ایک گاڑی تیزی سے اندر آئی اور ہمارے پاس آ کر رک گئی۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور باہر نکلنے والی شخصیت کو دیکھ کر مجھے اپنی نظروں کے سامنے زمین آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔

''مہک۔'' میرے لبوں نے ہولے سے سرگوشی کی۔ وہ بھی مجھے دیکھ چکی تھی اس کی حالت مجھ سے بھی بری تھی۔ زمین نے اس کے قدم جکڑ لیے تھے۔ وہ ساکت جامد کھڑی تھی۔

''آیئے مما۔'' مسکان کی آواز نے ہم دونوں کی محویت کو توڑا تھا۔ وہ چند قدم آگے بڑھی اور ہم لوگوں کے قریب چلی آئی۔ وقت اسے

ہولے سے چھوتا ہوا گزرا تھا۔ وہ ذرا بھی نہیں بدلی تھی۔ بس جسم تھوڑا سا بھر گیا تھا اور سنہری بال جو ہمہ وقت ماتھے پر پڑے رہتے تھے سمٹ کر اسے اور بھی گریس فل بنا رہے تھے۔ آسمانی کلر کی ساڑھی میں وہ آج بھی قیامت لگ رہی تھی۔

''ماما یہ انکل.....'' مسکان اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

''میں جانتی ہوں انھیں۔'' مہک نے اس کی بات کاٹ دی۔

''آپ جانتی ہیں؟'' وقتی طور پر رباحہ اپنی تکلیف بھول کر بے اختیار کہہ اٹھی۔

''ہاں بیٹا بہت اچھی طرح۔''

''کیسی ہو مہک؟'' اتنی دیر میں میں اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' مجھے لگ رہا تھا وہ ابھی تک مجھ سے ناراض ہے۔ پھر اس نے اور مسکان نے سہارا دے کر رباحہ کو گاڑی میں بٹھایا اور وہ مجھ پر ایک نظر ڈال کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھی۔

میں اس گھر میں آنے کے بعد آج پہلی بار باہر نکلا تھا۔ سلیم میری چیئر دھکیلتا ہوا آ رہا تھا۔ میرا رخ مہک کے گھر کی طرف تھا۔ کئی دن میں نے اسی کشمکش و پیچ میں گزار دیئے تھے کہ میں اس سے ملنے جاؤں یا نہ۔ سلے ہوئے زخموں کو ادھیڑنا خود کو اذیت میں مبتلا کرنے کے مترادف تھا لیکن آج اتنے برسوں بعد میں دل سے ہار گیا تھا۔ میں اس کی ناراضگی ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس دن اس کے خفا خفا سے چہرے نے میرے دل پر ایک بوجھ سا ڈال دیا تھا۔ سورج اپنا سفر تمام کر کے مغرب میں پاؤں ڈالنے لگا تھا۔ پرندے اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف واپس لوٹ رہے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور میرا دل مہک کے گھر کی طرف جاتے ہوئے بے اختیار دھڑک رہا تھا۔ اس عمر میں، میں خود دل کی ایسی بے تابی پر حیران تھا۔ لیکن محبت کہاں عمروں اور وقت کی محتاج ہوتی ہے۔ اس کے اپنے قاعدے اور اصول ہیں۔ یہ تو ایسے سمندر کی مانند ہے کہ ایک بار اس میں گرنے والے کو کبھی ساحل نہیں ملتا۔ باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ اس کی طوفانی موجیں کناروں پر اچھالنے کے بجائے اندر ہی اندر غوطے دیتی رہتی ہیں۔ میں بھی کب اس سمندر سے نکل سکا تھا۔ ڈھونڈنے پر بھی مجھے آج تک کنارا نہیں مل سکا تھا۔

سلیم نے بیل پر ہاتھ رکھا تو مسکان باہر آئی۔ وہ مجھے اپنے دروازے پر دیکھ کر بے حد حیران بھی ہوئی اور خوش بھی۔

''انکل آیئے نا۔'' اس نے سلیم کے ہاتھ ہٹا کر میری چیئر کی پشت پر ہاتھ رکھ دیئے۔

''صاحب جی فون کر دیجیے گا میں لینے آ جاؤں گا۔'' سلیم مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

''یہ مہک کا گھر ہے۔'' میں لان میں کھلے رنگ برنگے پھولوں کو دیکھ کر سوچ رہا تھا۔

''میری مہک کا گھر۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے میری مہک کا گھر ضرور تھا میرا نہیں۔ عجیب بات ہے نا۔ جو ہمارا ہوتا ہے ہماری سانسوں میں بسا ہوتا ہے۔ اس کی چیزیں ہماری کیوں نہیں ہوتیں وہ کہنے کو سمجھنے کو محسوس کرنے کو ہمارا ہوتا ہے لیکن پھر بھی ہماری ملکیت نہیں ہوتا۔''

مسکان مجھے چھوڑ کر اپنی ماما کو بلانے چلی گئی تھی۔

''آپ.....؟'' میرے قریب سے ہی یہ آواز ابھری تھی اور میرا رواں رواں کان بن گیا تھا۔

وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ ہم دونوں خاموش تھے بعض دفعہ کہنے کو بہت کچھ ہوتا ہے لیکن لب خاموش رہتے ہیں۔

''انکل کافی؟'' مسکان میرے سامنے کافی رکھ کر باہر نکل گئی۔

''پلیز لیں۔'' مہک نے حق میزبانی ادا کیا۔

''مہک ابھی تک ناراض ہو؟'' گرے سوٹ اور بلیک شال میں وہ بہت اداس اور تھکی تھکی نظر آ رہی تھی۔

''نہیں۔'' اس نے نظریں جھکائے ہوئے کہا۔

''مجھے سلمان کی بے وقت موت پر بہت افسوس ہے۔ مسکان نے مجھے بتایا تھا۔''

''افسوس مگر کیوں؟'' مجھے اس کی اس بات پر شاک سا لگا تھا۔ اس کی ذہنی رو شاید بھٹک رہی تھی۔

''تمھیں نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے سختی سے کہا۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ زندہ لوگوں کے لیے افسوس یا تعزیت نہیں کی جاتی۔''

''کیا.....؟''

''ہاں سلیمان زندہ ہے اور جرمنی میں اپنی جرمن بیوی کے ساتھ خوش باش زندگی گزار رہا ہے۔''

''لیکن وہ مسکان؟''

''میں نے اسے کسی بھی قسم کے احساس محرومی سے بچانے کے لیے شروع سے ہی یہ بتایا ہوا ہے۔''

''اوہ۔'' مجھے ساری بات سمجھ آ رہی تھی۔

''مسکان کی پیدائش سے دو ماہ پہلے وہ مجھے چھوڑ گیا تھا بقول اس کے کہ مجھے پانے کے بعد حاصل کر لینے کے بعد اسے مجھ میں کوئی دلکشی نظر نہیں آتی تھی۔ اس کا انٹرسٹ ختم ہو گیا تھا۔ ویسے بھی جنھیں چھوڑ دینا ہو کسی کو انھیں وضاحتوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلاوجہ بھی کسی کو چھوڑا جا سکتا ہے۔'' اس نے پہلی بار اتنی لمبی بات کی تھی اور مجھے شرمندہ کر دیا تھا۔

''مہک بخدا میں نے تمھاری زندگی کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے ایسا کیا تھا۔''

''زندگی تو میری پھر بھی خراب ہو گئی۔'' اس نے دکھ سے کہا۔ اس کی اس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''جو بدنصیبیاں قسمت میں رقم ہوں وہ مل کر رہتی ہیں۔ میں آپ کے ساتھ رہتی تو شاید میری زندگی اس طرح خراب نہ ہوتی۔'' اس نے اس طرح پر زور دے کر کہا۔

''مہک پلیز میری طرف سے بدگمان مت ہو۔ خود کو میری جگہ پر رکھ کر سوچو۔ کیا تم وہ نہ کرتی جو میں نے کیا؟''

''نہیں۔'' اس کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ محبت تکلیفوں سے نہیں گھبراتی۔''

''مہک پلیز مجھے مزید شرمندہ مت کرو۔''

''میں آپ کو شرمندہ نہیں کر رہی۔ میں آپ کو وہ حقیقت بتا رہی ہوں جس کا سامنا مجھے کئی سالوں سے ہے۔''

''میں نے تو تمھیں خوش دیکھنا چاہا تھا۔''

''اچھا، پھر بھی میں خوش نہیں رہی۔'' وہ استہزائیہ ہنسی۔

''میری خوشی سلمان کے ساتھ نہیں تھی یہ وقت نے ثابت کر دیا اور شاید سلمان نے خود بھی۔''

''مہک مجھے معاف کر دو۔ میری خوشی تو تمھارے سکھ سے مشروط تھی ورنہ میں تو آج تک کانٹوں پر چلا ہوں۔''

''شادی نہیں کی؟'' اس نے چونک کر سوال کیا۔

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''کوئی ایک معذور شخص سے شادی کر کے کیا پاتا اور پھر میں تمھارے علاوہ کسی اور کے ساتھ زندگی کیسے گزارتا۔''

''تو گویا ہم دونوں خوش نہیں رہے۔'' وہ بولی۔

الگ ہو کر ہم دونوں کیسے خوش رہ سکتے تھے۔ یہ حقیقت تھی اور مجھے اعتراف تھا اس کا۔ اتنے میں مسکان پکوڑوں کی پلیٹ تھامے چلی آئی۔

''انکل کھا کر بتائیں کیسے ہیں؟ میں نے خود بنائے ہیں آپ کے لیے۔''

''ارے بیٹا تم نے اتنی تکلیف کی ہمارے لیے۔'' مجھے اس کے انداز پر بے حد خوشی ہو رہی تھی۔

''تکلیف کیسی انکل آپ تو ہمارے مہمان ہیں۔''

''اچھا۔'' میں پکوڑے کھاتے ہوئے نم آنکھوں سے ہنسنے لگا۔

''حسنین ایک بات کہوں برا تو نہیں مناؤ گے۔'' وقار میرے سامنے بیٹھا ہوا مجھے کہہ رہا تھا۔

''کہو میں برا کیوں مناؤں گا؟'' میں نے اسے دوستی کا مان دیا۔

''تم مہک سے شادی کر لو۔''

اس کے الفاظ تھے یا ڈائنامائیٹ مجھے اپنا آپ ریزہ ریزہ ہوتا محسوس ہوا۔

''کیا.....؟''

''ہاں یار۔'' وقار نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''آخر کب تک ایک دوسرے کی خاموش محبت میں یوں سلگتے رہو گے۔ ویسے بھی یہ موقع قدرت نے فراہم کیا ہے۔ مہک کو سہارے کی ضرورت ہے اور تمھیں ایک ساتھی کی۔''

''میں اس کا کیا سہارا بنوں گا؟''

''کیوں مرد کے سائے کو بھی یہ دنیا بڑا سہارا سمجھتی ہے اور پھر اس کمی کے علاوہ جو تمھارے بس میں نہیں تم میں کیا کمی ہے۔''

''لوگ کیا کہیں گے؟''

''لوگوں کو چھوڑو۔ ان کی تو عادت ہے کچھ نہ کچھ کہنے کی۔ ویسے بھی جو دنیا سے ڈرتا ہے دنیا اسے ڈراتی ہے اور جو ڈرنا چھوڑ دیتا ہے اس سے دنیا ڈرتی ہے۔''

''لیکن.....؟''

''لیکن کیا یہ کوئی غلط کام نہیں۔ جس پر تمھیں شرمندہ ہونا پڑے۔''

''یار مہک کبھی نہیں مانے گی۔''

''یہ بھی تمھاری بھول ہے وہ آج بھی تمھاری پکار کی منتظر ہے۔''

وقار تو کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا لیکن میرے لیے سوچوں نے نئے در وا کر گیا۔ میرا دل اس کی باتوں پر بے قابو ہوا جا رہا تھا جبکہ دماغ گم سم تھا۔

محبت وہ سیلاب ہے جس کو
دلوں کی بستیاں آواز دے کر بلاتی ہیں
یہ جب چاہے کسی بھی خواب کو تعبیر مل جائے
جو منظر بجھ چکے ہیں ان کو بھی تنویر مل جائے
دعا جو بے ٹھکانہ تھی اسے تاثیر مل جائے
کسی رستے میں رستہ پوچھتی تقدیر مل جائے
محبت روک سکتی ہے
کسی گرتے ستارے کو
یہ چکنا چور آئینے کی کرچیاں
جوڑ سکتی ہے
جدھر چاہیں بھاگیں موڑ سکتی ہے
کوئی زنجیر ہو محبت توڑ سکتی ہے

آج بلیک ماربل سے بنے ہوئے خاموش اور پراسرار گھر کی خاموشی ٹوٹ گئی تھی۔ گیٹ سے لے کر کمروں تک بے تحاشا پھول کھلے ہوئے تھے۔ روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ رباحہ اور مسکان ہنستی ہوئی قہقہے بکھیرتی ہوئیں اندر باہر آ جا رہی تھیں۔ سلیم گنگناتے ہوئے بار بار چائے بنا رہا تھا۔ آج وہ بھی لٹھے کے کلف لگے سفید شلوار قمیض میں نکھرا ہوا لگ رہا تھا۔ آج مہک کا نکاح تھا۔ آخر کار آج انھیں اپنی منزل مل گئی تھی۔

نکاح کے بعد چائے اور مٹھائی سے لطف اندوز ہونے کے بعد سب لوگ چلے گئے تھے۔ رباحہ اور مسکان ادھر بکھری چیزیں اکٹھی کر رہی تھیں۔

کہتے ہیں کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ جو دن ان کی زندگیوں میں آج آنا تھا وہ برسوں پہلے کیسے آ سکتا تھا۔ ان کی محبت اور لگن سچی تھی۔ انھوں نے دل پر جبر کر کے اپنے پیاروں کی لاج رکھی تھی اور اس کا صلہ آج بڑے خوبصورت انداز میں انھیں مل گیا تھا۔

مہک نئی نویلی دلہن کی طرح شرما رہی تھی اور حسنین احمد کا دل اس انہونی پر ابھی تک بے یقین تھا۔ محبت زنجیر بن کر ان کے دلوں سے لپٹی ہوئی تھی۔ پھر وہ الگ کیسے رہ سکتے تھے۔ آج ان کے پاس الفاظ نہیں تھے لیکن ان کے دل ایک ساتھ دھڑک رہے تھے۔ برسوں بعد اظہار کیا۔ الفاظ کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ ایک دوسرے کے بغیر گزری راتیں وہ کربناک دن ان کی سچی محبت کے گواہ تھے۔ باہر رباحہ ہنستے ہوئے مسکان سے کہہ رہی تھی۔

''مسکان تم دنیا کی واحد لڑکی ہو جو کہہ سکتی ہو میں نے اپنے ماما، پاپا کی شادی میں شرکت کی ہے۔''

اور مسکان اس کی اس بات پر اتنے زور سے ہنسی تھی کہ اندر بیٹھے حسنین اور مہک کے لبوں پر ایک ساتھ مسکراہٹ آئی تھی۔ ملاپ کی پہلی کرن بن کر۔ حسنین نے مہک کا سادہ سا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگایا تو مہک کے اندر محبت کا پہلا لمس ٹھنڈک بن کر اتر آیا تھا۔

☆☆☆

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیے

ابنِ انشاء

طنز و مزاح، سفرنامے

اردو کی آخری کتاب
آوارہ گرد کی ڈائری
دنیا گول ہے
ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں
چلتے ہو تو چین کو چلیے

قدرت اللہ شہاب

یا خدا
ماں جی

بابائے اردو مولوی عبدالحق

قواعد اردو
انتخاب کلامِ میر

ڈاکٹر سید عبداللہ

مقامات اقبال
طیف غزل
طیف اقبال
طیف نثر

مکمل فہرست طلب کیجیے

لاہور اکیڈمی

۵-۲ مزنگ روڈ
لاہور

پتھر ہے سیاں

نبیہ نقوی

فر کے گھنے ریشوں کے کالر کے درمیان نازک گردن پر سجا کافی کلر کے تراشیدہ بالوں والا سمکھن سے چور چہرہ، بے پناہ حسین فیروزی آنکھیں جو مسلسل پانی کا دریا بہا رہی تھیں۔ گہرے گلابی لب جن پر پپڑی جم چکی تھی۔ نازک ہاتھ سیاہ دستانوں کی قید میں تھے۔ نیلی جینز پر سیاہ کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ مٹی کیچڑ سے جوتوں بھرے ہوئے تھے۔ تینوں کا دماغ اس سے سوال کر کر کے بچی ہو چکا تھا وہ کوئی جواب دیئے بغیر روئے جا رہی تھی۔ بھیگا چہرہ، بہتی ناک، برستی آنکھیں کالروں سے کبھی کبھی رگڑ لیتی یا آستینوں سے اردو، انگریزی میں کئی طرح کے سوال پوچھے۔ کون ہیں؟ کہاں سے آئی ہیں؟ کدھر جانا تھا؟ کیا مصیبت آ پڑی؟ اس کی اس طرح مدد طلب کرنے پر وہ تینوں تشویش زدہ تھے۔

وہ تینوں بہترین لباس میں ملبوس تھے۔ سب سے زیادہ مقبول شخصیت فرجام تھے۔ محفلوں کی جان، وہ ایک اہم فنکشن کے مہمان خصوصی تھے۔ ان کی غیر موجودگی سے گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ ان کے ہمراہ دو عزیز دوست ملک اصغر اور سہیل شیرازی تھے جو فرجام کے دست راست کہلاتے تھے۔ ہر خاص و عام دعوت میں ان کے ہمراہ ضرور ہوتے۔ تینوں باتوں میں مصروف گاڑی میں جا رہے تھے۔ وہ ڈیفنس کلب کی جانب جا رہے تھے۔ موڑ کاٹتے کاٹتے ایک چیختی چلاتی لڑکی عین گاڑی کے سامنے بھاگتی ہوئی آ گئی۔ اسے کوئی پروا نہ تھی کہ یہ گاڑی اسے کچل کر گزر سکتی ہے۔ فرجام نے ایمرجنسی بریک لگائی۔

''پلیز ہیلپ می..... ہیلپ می..... پلیز۔''

وہ گڑگڑائی۔ تینوں ہکا بکا رہ گئے۔ مدد کریں کہ نہ کریں تذبذب ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ لڑکی نے انھیں تذبذب میں مبتلا دیکھا تو خود ہی پچھلی

مکمل ناول

سیٹ کا دروازہ کھول کر سیٹ میں دھنس گئی۔ بجلی کی سی تیزی سے دروازہ بند کیا اور گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر بلک اٹھی۔

اس کے اس اقدام پر وہ مزید بوکھلائے۔ فرجام علی نے گردن موڑ کر کافی کلر کے بکھرے بال دیکھے۔ کس بے قراری سے رو رہی تھی۔ لڑکی۔

''کیا کروں؟'' انھوں نے اپنے برابر بیٹھے شیرازی سے پوچھا۔ شیرازی نے پلٹ کر ملک کو دیکھا۔

''جانے کون مصیبت زدہ ہے فرجام! اس نے ہم سے مدد مانگی ہے۔ انسانیت اور اخلاق کا تقاضہ ہے کہ اس لڑکی کی حفاظت کی جائے۔'' شیرازی نے تائید میں گردن ہلائی۔

فرجام نے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر اندر کی لائٹ جلائی۔ کوٹ کی آستین کھینچ کر کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ پھر گاڑی میں لگی گھڑی میں دیکھا۔ دونوں ایک ہی وقت بتا رہی تھیں۔

انھوں نے لائٹ آف کی پہلے ہی کافی دیر ہوگئی تھی۔ اب یہ لڑکی آ گئی۔ اب گاڑی دوبارہ واپس گھر کی طرف ڈیفنس کی طرف جا رہی تھی۔ موڑ کاٹتے کاٹتے ٹائر احتجاجاً چیخ اٹھتے مگر انھیں پروا نہ تھی۔ انھوں نے گیٹ پر گاڑی روک کر ہارن بجایا اور پھر جیسے ہاتھ ہٹانا بھول گئے۔

''او یار بس کرو۔'' شیرازی نے ٹوکا تو انھوں نے جلدی سے ہاتھ ہٹا لیا۔ ملازم نے جلدی سے آ کر گیٹ کھولا۔

جب کار سے ان تینوں کے علاوہ ایک روتی ہوئی لڑکی وہ بھی میم جیسی اتری تو ملازم جو ان تینوں کی شرافت کا قائل تھا انھیں مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ اسے لیے ایک کمرے میں آ گئے۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ گھبرائی گھبرائی سی صوفے پر بیٹھ گئی۔ اور روتی برستی آنکھوں سے فرجام کو دیکھا۔ ان کی نگاہ بھی اس کی گہری فیروزی پتلیوں والی کشادہ آنکھوں پر تھی کتنی بے تحاشا گھنی اور لمبی پلکیں تھیں جو بری طرح بھیگ رہی تھیں۔ نگاہیں ملیں تو انھوں نے فوراً نظریں پھیر لیں۔ تب اس نے ڈری ڈری نظروں سے ان تینوں کو دیکھا تو ملک اصغر علی نے اسے تسلی دی۔

''آپ یہاں خود کو بالکل محفوظ سمجھیں۔ یہ ہمارے دوست فرجام علی کی رہائش گاہ ہے ان کا شمار شہر کے معزز لوگوں میں ہوتا ہے۔ شہر کے بے شمار لوگ ان کے گھرانے سے واقف ہیں۔'' ملک اصغر ان کے متعلق بتانے لگا۔

فرجام کے والد مرحوم کا شمار شہر کے مخیّر ترین افراد میں ہوتا تھا۔ کئی ہسپتال اور سکولوں کے سرپرست تھے۔ ان کا بیٹا فرجام علی اب ان کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ فرجام دردانہ امیر بانو ان کی وفات کے بعد تنہا رہ گئے تو ان کی والدہ امیر بانو نے اپنے شوہر کو تایا زاد بہن کو اپنے پاس بلوا لیا۔ وہ ایک سال پہلے بیوہ ہو چکی تھیں۔ چار بچے تھے۔ دو بیٹوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ ایک بیٹا عدیل تھا۔ بیٹی ثوبیہ دردانہ سے دو سال بڑی تھی۔ ان کے آنے سے امیر بانو کو ڈھارس ملی۔ ارجمند کو بھی سہارا مل گیا اور گھر میں بھی چہل پہل ہوگئی۔

دن گزرتے رہے۔ فرجام علی کو اپنی خداداد صلاحیتوں اور بے پناہ وجاہت کی وجہ سے خاندان میں اور بے شمار پھیلے حلقہ احباب میں انفرادی مقام حاصل تھا۔ انھیں اپنی صلاحیتوں کا بخوبی علم تھا۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا کہ وہ کچھ مغرورانہ انداز اختیار کر لیتے۔ پھر بعد میں انھیں اس پر افسوس بھی ہونے لگتا۔ جلد یا بدیر معذرت بھی کر لیتے دل والا گوشہ نرم ہی تھا۔

اسے لمبے چوڑے تعارف پر فرجام نے

ملک کو گھورا بھی۔ یہ نروس لڑکی کیا توجہ دے رہی ہوگی۔ لڑکی خاموش بیٹھی رہی۔ فرجام علی کو فکر دامن گیر تھی۔ فنکشن میں ضرورت سے زیادہ دیر ہو چکی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ جلد سے جلد اس لڑکی کو جہاں جانا ہے وہاں پہنچا کر جان چھڑائیں۔ مگر وہ ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ فرجام علی نے زچ ہو کر ملک، شیرازی سے کہا۔

''یہ لڑکی کوئی چال نہ چل رہی ہو۔ گونگی بھی نہیں ہے اس نے چلا کر مدد طلب کی تھی۔'' پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہوئے۔

''اپنے بارے میں بتایئے ورنہ آپ کو پولیس اسٹیشن پہنچا دوں گا۔ خواہ مخواہ ہمارا قیمتی وقت ضائع کر رہی ہیں۔'' وہ گرج کر انگلش اور اردو میں بولے۔ سوچا جانے ان دونوں میں سے کون سی جانتی ہے مدد تو اس نے انگلش زبان میں طلب کی تھی۔ لڑکی مارے خوف کے ویسے ہی پریشان تھی۔ مزید دہل گئی چہرے کی سرخی پیلاہٹ میں تبدیل ہونے لگی۔ کئی گہرے سانس لیے۔

''یار آرام سے دیکھ نہیں رہے کتنی پریشان ہے۔'' ملک کی ہمدردیاں اس لڑکی کے ساتھ تھیں۔

''ہم کسی پریشانی میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔'' شیرازی نے فرجام کا ساتھ دیا۔

''خاموش رہو مجھے ڈر ہے کہیں لڑکی بے ہوش نہ ہو جائے پانی وانی منگا کر پلاؤ۔'' ساتھ ہی ملازم کو آواز دے دی۔

''برکت.....!'' ملک کے کہنے پر ملازم ٹھنڈے پانی کا گلاس لے آیا۔

لڑکی نے تشکر بھری نظروں سے ملک کو دیکھا اور بے تابی سے گلاس لبوں سے لگا لیا۔ ساتھ ہی آنسو اور بھی روانی سے قطار در قطار پھسل

بی۔ اے
ایف اے۔ ایف ایس سی
کے
امتحانوں میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے لیے
اپنے جانے پہچانے اور آزمودہ
درسی
ماڈل ٹیسٹ
پیپرز
کا مطالعہ کیجیے
اپنے شہر کے کتب فروش سے طلب کریں
یا
براہ راست ہمیں لکھیں
درسی کتب خانہ چوک اردو بازار لاہور

پڑے۔

''برکت کھانے میں جو بھی ہے وہ لے آؤ ہوسکتا ہے اسے بھوک لگی ہو۔'' برکت حیرت سے لڑکی کا جائزہ لے رہا تھا۔ نیا حکم سنتے ہی چلا گیا۔

لڑکی نے خالی گلاس قریبی تپائی پر رکھا۔ اس کا بازو سمیت ہاتھ کانپ رہا تا۔

''یہ واقعی کوئی مصیبت زدہ ہے۔ بہت خوفزدہ نظر آتی ہے۔'' فرجام کو اپنا کرخت لہجہ یاد آیا تو انھیں افسوس ہوا۔

انھوں نے فنکشن کے آرگنائزر کو فون کر دیا کہ وہ ایک ضروری کام کی وجہ سے تاخیر سے آئیں گے۔ فنکشن شروع کرا دیا جائے۔ وہ جتنی جلد ممکن ہو سکا آ جائیں گے۔ فون کر کے واپس اسی کمرے میں آ گئے۔ ملازم نے کھانے کی ٹرے رکھ دی تھی۔ لڑکی نے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا البتہ بار بار نگاہ ضرور ڈال رہی تھی۔

''پلیز شروع کریں گھبرائیں مت میں آپ کی ہر ممکن مدد کروں گا۔ آپ میرے رویے کو بھول جائیں۔ سوری۔'' انھوں نے بہت نرم لہجے میں کہا۔

لڑکی پلکیں جھپکا جھپکا کر انھیں دیکھنے لگی۔ ابھی تو اس قدر رعب جما رہے تھے۔ اب معذرت کرنے لگے۔ عجیب ذہن پایا ہے موصوف نے۔

ملک نے کہا۔ ''میرا خیال ہے یہ ہمارے سامنے کھانے سے جھجک رہی ہے۔'' پھر اس نے لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا۔

''آپ اطمینان سے کھائیں۔'' وہ تینوں کمرے سے باہر نکل گئے اور کھڑکی سے اس کو دیکھنے لگے۔ تجسس میں تو مبتلا تھے ہی۔

لڑکی نے پھلکے پر قیمہ' سلاد پھیلایا' رول کر کے نوالہ دانتوں سے توڑا۔ ذرا چبایا۔ ایک دم سے اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ شاید مرچوں کی وجہ سے۔ وہ جلدی سے پانی کا گلاس اٹھا کر آدھے سے زیادہ پی گئی۔ پھر پڈنگ کا چمچہ بھر کر منہ میں رکھا۔ رول کھول کر جائزہ لیا۔ دوسرا پھلکا اٹھا کر اس پر صرف سلاد رکھ کر رول کر کے کھانا شروع کر دیا۔

''سو فیصد فارنر..... یا مکس بلڈ۔ مطلب ہے کہ پاکستانی انگریزی خون۔'' شیرازی نے سرگوشی کی۔ اس کے مکس بلڈ پر ملک کو زور سے ہنسی آ گئی اور فرجام لڑکی کے دستانوں سے آزاد سرخ و سفید' بے حد خوبصورت' نازک' گلابی نیل پالش میں رنگے ناخنوں والے ہاتھوں کو دیکھتے رہے۔ انھوں نے سر جھٹکا۔

''میرا خیال ہے ہمیں لڑکی سے کوئی خطرہ نہیں۔ برکت سے کہہ دیتا ہوں خیال رکھے تب تک گھر والے بھی شادی سے واپس آ جائیں گے۔ اب ہم لوگ چلتے ہیں کافی تاخیر ہو چکی ہے۔''

''لڑکی کو بتا دیا جائے۔'' ملک نے مشورہ دیا۔

''لڑکی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں' برکت بتا دے گا۔'' فرجام نے اپنی اہمیت کا احساس دلایا۔

''ایک تو تمھاری سمجھ نہیں آتی ایک طرف اکڑ فوں۔ دوسری طرف بھی ایسے ہو جاتے ہو کہ تم جیسا مخلص' نیک' پیارا' شریف بندہ کوئی نہ ہو۔''

''بہت زیادہ جھک جاتا ہوں تو فوراً احساس جاگ اٹھتا ہے کہ مجھے اس طرح نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے جچتا نہیں میری زندگی اور ٹائپ کی ہے۔'' فرجام نے سنجیدگی سے کہا۔

''اچھا احساس ہے ہمیں تو اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ پل میں تولہ' پل میں ماشہ۔'' وہ تینوں ملازم کو ہدایات دے کر چلے گئے۔

ملازم نے اندر آ کر دیکھا۔ وہ اپنا کوٹ اوڑھے صوفے پر لیٹی تھی۔ جیسے ہی گھر والے لوٹے ملازم نے انھیں سارا احوال سنایا۔ سب نے حیران ہو کر کمرے میں جھانکا۔

''حسن ہے کہ قیامت۔'' ثوبیہ نے ہولے سے کہا۔

''واقعی آفت ہے۔'' دردانہ نے تائید کی۔

''رنگ کتنا خوبصورت ہے۔ انگریز تو ضرورت سے زیادہ سفید ہوتے ہیں شلجم سے۔ یہ رنگ تو ایمان سے پورے کا پورا گلابی گلاب کا پھول۔'' ثوبیہ کی تشبیہ پر دردانہ کو ہنسی بھی آئی مگر انکار بھی نہ کر سکی۔

''ماشاء اللہ خوبصورت لڑکی ہے۔ جانے کس گھر کا چراغ ہے۔ خدا اسے دراثوں تک پہنچائے۔'' پھپھو ارجمند نے کہا۔

''خدا برے وقت سے بچائے۔'' امیر بانو کمرے سے باہر جاتے ہوئے بولیں۔

کافی رات گئے تک اس کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں پھر جانے کب وہ سو گئیں۔

صبح آنکھ کھلی تو جلدی جلدی ہاتھ منہ دھو کر دانی اور ثوبیہ بھاگی بھاگی اس کے کمرے میں گئیں۔ وہ ابھی تک سو رہی تھی۔

ان دونوں کو بہت بے چینی تھی۔ کم بے چین ملک' شیرازی بھی نہ تھے۔ دونوں کا باری باری فون آیا تھا۔

''کون لڑکی ہے معلوم ہوا؟'' شیرازی کا پھر فون آیا۔

''ابھی تک تو پتہ نہیں چلا سو رہی ہے۔'' فرجام نے بتایا۔

''یہ اچھی رہی۔ اس طرح پرسکون ہو کر سو رہی ہے جیسے اسے یہیں آنا تھا۔'' شیرازی نے ہنس کر کہا۔

فرجام نے فون بند کر دیا۔ وہ فون کے قریب ہی ایزی چیئر پر بیٹھے مختلف اخباروں کے پلندے پر جھکے تھے۔ یعنی آفس گول۔

''بھئی میرا قطعی موڈ نہیں ہو رہا کالج جانے کا۔'' دردانہ بولی

''یہی میرا بھی پروگرام ہے۔'' ثوبیہ بولی۔

عدیل سویرے نکل گیا تھا۔ اس کے آفس میں کوئی ڈیلی کیشن آنا تھا۔

''ارے اٹھ گئی ادھر آؤ دانی۔'' ثوبیہ نے پکارا۔ دانی اور ثوبیہ اندر آ گئیں۔ لڑکی نے گھٹنوں پر گرم کوٹ ڈال رکھا تھا۔ پنک گرم قمیض پہنے ہوئے تھی۔ وہ بہت حیران نظر آ رہی تھی۔ فیروزی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

لڑکی نے حیرت سے ان دونوں کو دیکھا۔

''اسلام علیکم۔'' دردانہ بولی۔

لڑکی نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سر اٹھایا۔

''ہمیں آپ کے بارے میں فرجام بھائی نے بتایا تھا۔ وہی جو گاڑی کو چلا رہے تھے۔ میں بہن ہوں ان کی۔ یہ میری کزن ہیں ثوبیہ۔'' لڑکی کے چہرے پر اطمینان سا پھیل گیا۔

''آپ بے فکر رہیں جہاں جانا چاہیں گی آپ کو پہنچا دیں گے۔ آپ یہاں بالکل محفوظ ہیں۔''

''آپ کا نام کیا ہے؟'' ثوبیہ نے پوچھا۔

''شارمین۔'' اس کے سوکھے لب ہلے۔ وہ زبان پھیر کر انھیں تر کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''بہت اچھا نام ہے آپ ہاتھ منہ دھو لیں پھر باتیں ہوں گی۔ ناشتہ بھی کرنا ہے۔''

دردانہ اور ثوبیہ اس سے انگلش میں باتیں کر رہی تھیں۔ دردانہ سوچ رہی تھی۔ اسے اردو بھی آتی ہوگی۔ سلام اپنی زبان میں کیا تھا تو جواب دیا تھا اس نے۔ لڑکی انتہائی آہستگی سے مسکرائی۔ اب اس کے چہرے پر رات والی گھبراہٹ نہیں تھی۔ البتہ وہ بے حد جھجک رہی تھی۔ اس نے

کوٹ ایک طرف رکھا۔ صوفے سے ٹانگیں لٹکائیں شوز پہننے لگی۔

دردانہ نے جھٹ اپنے پیروں سے چپلیں اتار کر بڑھائیں اس نے تھینکس کہہ کر چپلیں پہن لیں اور باتھ رم میں چلی گئی۔ دردانہ ثوبیہ اسے دیکھ رہی تھیں۔

کتنی پیاری ہے۔ سرو جیسا قد ہے۔ بال کتنے گھنے ہیں۔ بالکل کافی کلر کے۔ خدا کا شکر ہے کہ بھائی جان مل گئے۔ کوئی اور نہ ملا۔ ورنہ خدا جانے غریب کا کیا حشر ہوتا۔ سامان وغیرہ کچھ نہیں۔'' انھوں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ شولڈر بیگ ہی تھا جو ساتھ ہی لے گئی تھی۔

''کہیں اسمگلر تو نہیں ڈرگز ہوگی پرس میں۔'' ثوبیہ نے خدشہ ظاہر کیا۔

''زیادہ جاسوسی کہانیاں نہ پڑھا کرو۔ سو کروڑ دفعہ منع کر چکی ہوں۔ یہ کتنی ڈری ہوئی ہے۔ ایسے تھوڑی ہوتے ہیں اسمگلر۔'' دردانہ نے شارمن کی حمایت کی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ گلوگیر آواز میں اپنی داستان سنا رہی تھی۔ فرجام بھی بیٹھے تھے۔

سلطان صاحب امریکہ میں ایک عرصے سے رہائش پذیر تھے مالی طور پر بہت خوشحال تھے۔ سلوا نامی انگریز خاتون کی زلف کی اسیر ہوگئے۔ وہ تین چھوٹے چھوٹے بچوں کی ماں تھی۔ دولڑکے ایک لڑکی مالی طور پر بے حد خستہ حال تھی۔ دن بھر کام کرتی تب کہیں جا کر بچوں کا پیٹ بھرتی۔ شوہر دو سال پہلے ایک ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ شریف عورت تھی۔ شکل وصورت کی بے حد اچھی۔ سلطان صاحب سے ایک اتفاقی ملاقات محبت کا روپ دھار گئی۔ وہ بچوں کے مستقبل کے لیے پریشان تھی۔ انھیں دولت مند دیکھ کر مکمل طور پر قابو میں کرلیا۔ یوں دونوں کی شادی ہوگئی۔

اچھی خوراک' خوشحالی نے سلوا کو اور روپ دے دیا۔ بچے بھی بہت خوش تھے۔ سلطان تینوں بچوں کو پیار کرتے تھے۔ یوں ہی کچھ مدت گزری۔ تب ایک پھول سی بچی نے آنکھ کھولی۔ سلطان کی اپنی اولاد۔ وہ بے حد خوش تھے۔ انھوں نے کہا۔

''یہ مسلمان ہے۔ میری بچی۔'' خود ہی اس کے کان میں اذان دی۔ نام شارمن رکھا۔ کبھی کبھی دبی زبان سے سلوا سے کہتے۔

''اسلامی کتابوں کا مطالعہ کیا کرو۔ میری بچی مسلمان ہے اس کی پرورش اسلامی طریقے سے ہونی چاہیے۔''

مذہب کی بات پر سلوا اکتا جاتی۔ ''ہر قوم کا انسان سمجھتا ہے میرا مذہب افضل ہے۔ اگر تمھاری لڑکی مسلمان ہے تو خود اس کی پرورش پر توجہ دو۔'' سلطان صاحب لڑائی جھگڑے سے دور بھاگتے تھے۔ جتنا ہوسکتا بچی پر توجہ دیتے۔ وہ بڑی ہوتی گئی۔ اس کے کان میں یہ بات پڑ گئی تھی کہ وہ مسلمان ہے۔ باقی بہن بھائی غیر مسلم ہیں۔ وہ سلطان صاحب کے ساتھ عید مناتی کرسمس بھی اسی شوق ولگن سے مناتی۔ سلطان صاحب اسے یہ سمجھا کر مطمئن تھے کہ ہم دونوں مسلمان ہیں۔ انھوں نے اسے اپنی بولی سکھائی۔ اردو وہ ٹھیک ٹھاک بول لیتی۔ البتہ نماز روزے سے ناواقف تھی۔ سلوا بھی ان کے درمیان میں نہیں آئی تھی۔ اسے یہ خوبصورت سی لڑکی بہت عزیز تھی مگر کبھی کبھی چڑ جاتی۔

''سلطان اس لڑکی کو ستیاناس کر رہا ہے۔ اس لڑکی کو ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔'' اسے اطمینان تھا کہ سلطان صرف نام کا ہی مسلمان ہے اور یہی حال بیٹی کا تھا۔ البتہ وہ اس وقت الجھ جاتی جب وہ کہتے اس کی شادی مسلمان لڑکے سے کروں گا

ہوسکتا ہے اپنے رشتے داروں میں کوئی لڑکا ہو۔ میں اسے پاکستان ضرور بھیجوں گا بلکہ ہم دونوں جائیں گے۔''

''کون جانے دے گا تمھیں۔'' سلوا کہتی۔

وہ اب سلطان کی پروا نہیں کرتی تھی۔ پیسے کی ریل پیل نے اسے کافی خودسر بھی بنا دیا تھا۔ اپنی من مانی کرتی تھی۔ شارمن کو تمھاری بچی اور لوسی' جیفر ریبک کو اپنے بچے کہتی۔ لڑکے تو پسند نہیں کرتے تھے۔ لوسی کو البتہ شارمن سے کچھ لگاؤ تھا۔

ان دنوں سلوا کا ایک کزن راجہ بہت آنے لگا تھا۔ راجر بری طرح سے شارمن پر فریفتہ ہوگیا تھا۔ اس سے شادی کا خواہاں تھا۔

شارمن کو اس سے بہت خوف آتا تھا۔ وہ اس سے بھاگتی تھی۔ لوسی اپنے اوباش کزن کو شارمن کے قریب رہنے کا بھرپور موقع دیتی۔ سلطان صاحب بھی یہ رنگ دیکھ رہے تھے۔

'ڈیڈی مجھے راجہ سے بہت ڈر لگتا ہے۔ پلیز آپ اس سے کہہ دیں کہ وہ یہاں نہ آیا کرے۔'' وہ خوفزدہ ہو کر کہتی سلطان صاحب نے ایک دن سلوا سے اس سلسلے میں بات کی تو اس نے کہا۔

''راجر شارمن کو بہت پسند کرتا ہے۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''وہ بدمعاش ہے۔ اس نے پہلے دو شادیاں کی ہیں میری بچی بہت معصوم ہے۔ وہ راجر کو پسند نہیں کرتی۔ اور پھر وہ مسلمان ہے۔ میں اس کی شادی کسی مسلمان سے کروں گا۔''

''یہ سب تمھاری غلط تربیت کا نتیجہ ہے ورنہ یہ شارمن کی خوش نصیبی ہے کہ راجر جیسا اسمارٹ انسان اسے پسند کرتا ہے۔ اس کی شادی راجر سے ہی ہوگی۔''

سلوا کو بھی ضد سی ہوگئی۔ شارمن ماں سے ڈرنے لگی۔ سلطان صاحب کو اپنے ایک عرصے سے بھولے ہوئے رشتے دار یاد آنے لگے۔ بیوی سے کہا اس بات کا ایک ہی حل ہے تمھیں پاکستان اپنی بہن کے پاس بھیج دوں۔ شارمن تو راجر سے عاجز تھی اس نے جھٹ ہامی بھر لی۔

سلطان صاحب نے چپکے چپکے ساری کاغذی کارروائی مکمل کی۔ پاکستان میں مقیم اپنی بہن کا ایڈریس بھی شارمن کو دے دیا۔ شارمن جانے کے لیے تیار تھی کہ اچانک سلطان صاحب پر دل کا دورہ پڑا۔ ایک رات سوئے تو پھر کبھی نہ اٹھ سکے۔ اجل نے آلیا۔

شارمن باپ سے سب سے زیادہ قریب تھی۔ وہ صدمے سے پاگل ہوگئی۔ سلطان صاحب کافی پیسہ چھوڑ کر گئے تھے۔

بچے باپ سے ڈرتے تھے وہ سر پر نہ رہا تو اور آگے نکل گئے۔ سلوا کی بھی مصروفیات بڑھ گئیں۔ راجر کھلے عام آنے لگا۔ اسے دیکھ کر شارمن اپنے بیڈروم میں جا چھپتی۔ سلوا راجر کو تسلی دیتی۔

''فکر نہ کرو میں اس کی شادی تم سے ہی کروں گی۔''

''میں ہر قیمت پر شارمن کو حاصل کروں گا۔ اگر وہ راضی نہ ہوئی تو اغوا کرلوں گا۔''

''اس کی نوبت نہیں آئے گی میں اسے راضی کرلوں گی۔'' مگر جب سلوا نے شارمن سے شادی کی بات کی تو وہ رو پڑی۔

''اوہ نو..... ممی جیفر ریبک مجھے بچالو۔ راجر مجھے نہیں پسند۔'' وہ گڑگڑائی۔

''سوری ہنی۔'' انھوں نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔

وہ تڑپ کر لوسی سے آلپٹی۔

''میری بہن مجھے تباہ ہونے سے بچالو۔ مجھے کسی طرح پاکستان بھجوادو۔''

لوسی دل کی بہت اچھی لڑکی تھی۔ وہ اپنے

رشتے کے ماموں سے سخت خائف تھی۔ جانتی تھی کہ بہت عیاش اور حسن پرست ہے۔ اس کی بے شمار گرل فرینڈز میں وہ نمبر ون فراڈی تھا۔ وہ معصوم لڑکیوں سے شادی کر کے چھوڑ چکا تھا اور اب ہر قیمت پر شارمن کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔

''اوکے میں مدد کوں گی۔'' لوسی نے تسلی دی۔ تب وہ سب سے چھپ کر شارمن کو اپنے بوائے فرینڈ کے اپارٹمنٹ میں چھوڑ آئی۔ جان کی بوڑھی ماں نے بڑی محبت سے غم سے بے حال شارمن کا استقبال کیا۔ عنقریب لوسی ان کی بہو بننے والی تھی۔ گو کہ لوسی نے ابھی ماں کو نہیں بتایا تھا مگر جان کے بارے میں قوی امید تھی انکار نہیں ہوگا۔ لوسی انھیں تمام حالات بتا چکی تھی۔ انھیں راجر پر بہت غصہ آیا۔ اس کے لاپتہ ہونے پر راجر پریشان ہوگیا۔

''تم نے اسے کہیں بھیج دیا ہے۔'' وہ سلوا سے لڑ پڑا۔

''مجھے تو خود معلوم نہیں راجر شارمن مجھے بہت عزیز تھی۔ تمھاری وجہ سے میں نے ہامی بھری میری بیٹی مجھ سے ناراض ہوگئی تھی۔'' وہ رو پڑی۔

''ممی شارمن نے بتایا تھا وہ پاکستان جائے گی ہوسکتا ہے چپکے سے اس نے بندوبست کر لیا ہو۔''

''اس کے پاس اتنی رقم نہیں تھی۔ کہیں اس نے کوئی غلط قدم نہ اٹھالیا ہو۔''

سلوا پھوٹ پھوٹ ک رو دی۔ شارمن کی محبت جاگ اٹھی تھی۔ لوسی جانتی تھی ماں کا دل نرم ہے۔ اسے شارمن سے شدید محبت تھی۔ مگر ضد میں آ کر وہ کزن کا ساتھ دے رہی تھی۔

جان اور لوسی ٹکٹ کے حصول کے لیے مصروف ہوگئے۔ کاغذات تقریباً مکمل تھے۔ دونوں اسٹوڈنٹ تھے۔ ساتھ ملازمت بھی کرتے' اتنی رقم نہ تھی۔ شارمن کے اپنے پاس بھی رقم کم تھی۔ لوسی چپکے چپکے گھر سے اس کی ضرورت کی چیزیں لے آیا کرتی تھی۔

''وہ ڈر کے مارے کھڑکی کے پاس تک نہ جایا کرتی۔ کہیں راجر کی نگاہ نہ پڑ جائے۔ وہ گھر کے کاموں میں مسز اسمتھ کا ہاتھ بٹایا کرتی۔ حالانکہ سلطان صاحب نے کافی پیسہ چھوڑا تھا مگر سب پر سلوا قابض تھی اور اس سے اتنی بڑی رقم مانگنا مشکل تھا۔ لوسی نے یقین دلایا تھا کہ وہ موقع ملتے ہی اس کے حصے کی رقم بھجوادے گی۔ تم خط و کتابت جاری رکھنا۔ شارمن نے اسے اپنی پھوپھی کا ایڈریس دے دیا تھا۔

شارمن ان تینوں سے جدا ہو کر طیارے میں سوار ہوگئی۔ مسز اسمتھ بھی چھوڑنے آئی تھیں۔ وہ سیٹ پر نڈھال سی بیٹھی تھی۔ آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے۔ طویل سفر کٹا۔

اب اس پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ وہ پاکستان کی سرزمین پر کھڑی تھی۔ سامان کلیرنس کروا کے ایئرپورٹ سے باہر آ گئی۔ ایک ٹیکسی والا خود بڑھ کر آیا۔ اس سے پوچھا کہاں جانا ہے؟ اس نے بتا دیا۔ اس نے اس کا سامان ڈگی میں رکھا۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

ٹیکسی بھاگ رہی تھی۔ وہ بے چین سی بیٹھی تھی۔ پریشانی بھی تھی کہ وہ لوگ کیسے پہچانیں گے۔ اس کے پاس اس کے ڈیڈی کی ایک تصویر تھی۔ ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہوگی تو وہ گھبرا گئی۔ ٹیکسی والا زیادہ سے زیادہ کرایہ بنانے کے چکر میں تھا۔ اس نے موڑ کاٹا تو ایک دم ہی ایک سمت سے ایک کار ٹیکسی کے سامنے آ گی۔ ٹیکسی والے نے بریک لگا دی۔ کار سے دو آدمی بجلی کی سی تیزی سے نکلے۔ ایک کے ہاتھ میں پستول تھا۔ پرس کو اس نے دونوں بازوؤں میں بھینچ لیا۔ ایک نے پستول ٹیکسی والے کی کنپٹی پر رکھ دیا۔

''کہاں سے آ رہے ہو؟''

''ایئرپورٹ سے۔'' ٹیکسی والا خوف سے کانپ رہا تھا۔

''کتنا مال ہے؟'' دوسرے نے اندر جھانکا۔ اس نے لب بھینچ لیے۔ دل ڈر کے مارے بند ہونے لگا۔

پستول والا ٹیکسی والے کی تلاش لینے لگا۔ دوسرا آدمی ڈگی میں گھسا بیگ نکال رہا تھا۔ اس نے موقع غنیمت جانا۔ چپکے سے دوسرا دروازہ کھولا اور برق رفتاری سے قریبی جھاڑیوں میں جا گھسی۔ دہشت سے اس کی بری حالت تھی۔ وہ جھاڑیوں میں دبکی بیٹھی تھی۔ گھاس پھونس کیچڑ جوتوں میں لگ گیا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر وہ لوگ بیگ گاڑی میں رکھوا رہے تھے۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ پرس اس کے پاس تھا۔ اس میں ایڈریس' نقدی اور زیورات وغیرہ تھے۔

چور اچکے نئے لگ رہے تھے۔ اتنے ہوشیار نہ تھے۔ ورنہ خدا جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے۔

''اب کیا کروں؟'' اس نے سوچا۔ دور سے گاڑیوں کے آنے جانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے پرس کوٹ کے اندر کیا۔ اس میں اس کی شناخت تھی۔ ڈیڈی کی تصویر اور پھپھو کا ایڈریس تھا۔ اس کا سامان وہ لوگ لے کر چلے گئے تھے۔ وہ کوٹ کے بٹن بند کر کے کانپتی لرزتی جھاڑیوں سے نکلی۔ تھکن سے چور تھی۔ اوپر سے خوف و دہشت اور پناہ کی تلاش نے مزید حواس باختہ کر دیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ لٹیرے اس کی تلاش میں ہیں۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو بھاگنا شروع کر دیا۔ سامنے سے آتی گاڑی کے نزدیک آنے پر اس نے گڑگڑا کر مدد مانگی۔ اور یوں فرجام اسے گھر لے آئے۔ اس نے پوری کہانی سنا کر آنسو پونچھے۔

''بڑی دردبھری کہانی ہے۔'' ارجمند بولیں۔

''آپ اپنی پھپھو کا ایڈریس بتائیں۔'' فرجام بولے۔ اس نے پرس میں سے ایک کاغذ نکال کر دیا۔

فرجام نے کاغذ کا ایڈریس بغور پڑھا۔ چونک کر شارمن کو دیکھنے لگے۔ وہ آستین سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ جل تھل نین غضب ڈھا رہے تھے۔ بالوں نے مہتابی چہرے کو اپنے گرد لے رکھا تھا۔

''اپنے ڈیڈی کی تصویر دکھائیں۔'' انھوں نے تصویر مانگی۔ اس نے ایک تصویر نکال کر بڑھائی۔ سب کی نگاہ تصویر پر پڑی وہ سب متحیر رہ گئے۔

''یہ سلطان ..... میرا بھائی۔'' ارجمند چلا پڑیں۔

''یہ تمھارا باپ ہے؟''

''یس مائی باپ۔'' وہ ملی جلی اردو میں ہچکی لیتے ہوئے بولی۔

دانی اور ثوبیہ کو اس کے مائی باپ کہنے پر بڑی زور کی ہنسی آئی۔ ہلکی سی مسکراہٹ فرجام کے چہرے پر بھی آ کر غائب ہوگئی۔

''سلطان ..... ہائیے میرا بھائی۔ بائیس سال پہلے چپکے سے امریکہ چلا گیا تھا۔ تم میری بھتیجی ہوسگی۔'' انھوں نے اسے ساتھ لپٹا لیا۔ ایڈریس وہی تھا جہاں پہلے رہا کرتی تھیں۔ شادی کو ایک برس گزرا تھا۔ سلطان کو جنون تھا۔ امیر کہ جانے کا۔ اکلوتا بھائی تھا۔ بہنیں منع کرتی تھیں مگر نہیں مانا۔ چپکے سے چلا گیا۔ بھائی کو یاد کر کے کیسا تڑپ کر روتی تھیں۔ بہنیں۔ اب تو صرف اکیلی ارجمند رہ گئی تھیں دنیا میں۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی بھائی کی یاد دل سے نہ گئی تھی۔

''کہیں میرے ساتھ فراڈ تو نہیں کر

رہیں۔'' اس کے دل میں وسوسے پیدا ہونے لگے۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا۔'' وہ شک سے بولی۔

''جاؤ ثوبیہ البم اٹھالاؤ۔'' ارجمند نے ثوبیہ کو دوڑایا۔

ثوبیہ البم لے آئی۔ اس نے البم کھول کر دیکھا۔ اس کے ڈیڈی کی بے شمار تصویریں تھیں۔ کئی میں ارجمند بھائی کے ساتھ کھڑی تھیں۔

''خدا نے کیسے اتفاق سے ملایا۔ ورنہ میری بچی پر نہ جانے کیا گزرتی۔ فرجام میرے بیٹے تمھارا بڑا شکریہ۔''

''کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔'' فرجام کر ہنس کر بولے۔

وہ بھیگی پلکیں جھپکا کر انھیں دیکھنے لگی۔ ان کی وجاہت' کل کے سوال' کبھی نرمی' کبھی گرمی' معذرت کا انداز دھونس۔ سب یاد آ گئی۔ پھر اٹھتی گرتی پلکوں کے درمیان اس نے کہا۔

''تھینک یو ویری مچ مسٹر فرجام۔'' وہ اسے خوش آمدید کہہ کر اٹھ گئے۔

دردانہ' ثوبیہ اس کے گرد ہو گئیں۔ وہ بارہا سویٹ پھپھو کہہ کر ارجمند سے لپٹ جاتی۔ امیر بانو نے بھی گلے لگا کر اس کی پیشانی چومی۔

ارجمند بھائی کی موت کی خبر پا کر بلک بلک کر روئیں۔ اس بے تابی نے شارمن کو بھی رلایا۔

''میرے بھائی کی کوئی فاتحہ نہیں ہوئی۔ سوئم' دسواں' بیسواں' چالیسواں سب کروں گی۔'' انھوں نے کہا۔

فرجام تیار ہو کر آج کافی لیٹ آفس جا رہے تھے۔ وہ ان کی رشتے دار نکل آئے گی اس کا انھیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اس افسانوی اتفاق پر وہ بہت حیران تھے۔ انھوں نے سوچا اگرچہ یہ بے انتہا خوبصورت ہے مگر مشرقی حسن کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ یہ تو غیر ملکی لگتی ہے۔ سانولا رنگ ان کا آئیڈیل تھا۔ بھولی بھالی صورت' دردانہ انھیں لڑکیاں دکھا دکھا کر تھک گئی تھی۔ انھیں کوئی لڑکی پسند ہی نہ آتی تھی۔

دوپہر کو دردانہ' ثوبیہ جا کر اس کے کپڑے وغیرہ لے آئیں۔ شارمن بے حد خوش تھی۔ وہ اردو سمجھ لیتی تھی۔ بولتے ہوئے تھوڑا سا اٹکتی تھی۔ شام کو عدیل کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ عدیل سلطان صاحب سے بہت مشابہ تھا۔ اس نے بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

''آپ بالکل میرے ڈیڈی جیسے.....''

''آپ ڈیڈی مت کہہ دیجیے گا۔ بھائی ہوں۔'' وہ شریر ہو کر بولا۔

''اونو.....'' وہ خجل سی ہو کر ہنس پڑی۔

''بھائی جان انھیں حمیرا سے ملوائیں۔'' حمیرا عدیل کی منگیتر تھی۔

''ضرور۔'' عدیل نے جھٹ ہامی بھر لی۔

وہ سب لوگ حمیرا کے گھر گئے۔ حمیرا کو بھی شارمن بہت پسند آئی۔

رات جب بیڈ پر لیٹ کر سکون سے آنکھیں بند کیں تو فرجام کا سراپا اس کی نظروں کے سامنے آ گیا۔ کتنی دیر وہ ان کے بارے میں سوچتی رہی۔ سارا دن انھیں دیکھا ہی نہ تھا۔

صبح خوشگوار باتوں کے دوران ناشتہ ہو رہا تھا۔ اس میں جھجک تھی۔ پھر نیا ماحول' مزید ستم دل کی نگری پر ہو گیا تھا۔ وہ بے بس ہو چکی تھی۔ بار بار نگاہ فرجام کو دیکھنے کو مچل جاتی۔ لاکھ خود کو سمجھاتی پھر مجبور ہو جاتی۔ دو ایک بار فرجام نے اس کی چوری پکڑ لی تھی۔ وہ خفیف سی ہو کر نگاہ پھیر لیتی۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہ ابھرا۔ انھوں نے تو بات تک نہ کی تھی۔ نہ ضرورت محسوس ہوئی۔ صرف ہیلو کا تبادلہ کیا تھا۔

شارمن نے لوسی کو خط لکھ کر تمام حالات

بتائے۔ سب کی ایک گروپ فوٹو بھی بھجوائی۔ تب لوسی کا جواب بھی آ گیا۔ اس نے لکھا تھا۔ ممی بہت خوش ہیں۔ تمھارے نام رقم کا ڈرافٹ بھجوانا ہے۔ فوراً اکاؤنٹ نمبر بھجواؤ۔

ممی اپنی غلطی پر بہت نادم ہیں۔ تم ان کی پیاری بیٹی ہو۔ جب دل چاہے امریکہ آنا۔ راجر انکل تھوڑے دنوں بعد کینڈین لڑکی سے شادی کر رہے ہیں۔ تمھارے لیے کوئی خطرہ نہیں دونوں بھائی بہت یاد کرتے ہیں۔ ہاں تصویر بہت اچھی ہے۔ جو آف وائٹ سوٹ والا ہینڈسم سا نوجوان ہے اللہ کرے اس کے ساتھ تمھاری شادی ہو جائے۔ تم دونوں پر بہت اچھے لگو گے۔''

''بے وقوف نہ ہو تو۔'' وہ بہن کا خط پڑھ کر بے اختیار بولی۔

''مسٹر فرجام تو نظر اٹھا کر مجھے دیکھتے تک نہیں۔ شادی کیسے ہو سکتی ہے۔'' اس کے دل پر اداسی چھا گئی۔ اس نے سر جھٹکا۔

وہ یہاں بہت خوش تھی۔ مگر فرجام کے سامنے زبان بند ہو جاتی۔ دل چاہتا وہ باتیں کریں یہ پلکیں جھکائے بیٹھی رہے۔ مگر وہ تو اس سے بالکل ہی لاتعلق تھے۔ شارمن دل مسوس کر رہ جاتی۔

اس کے لیے علیحدہ سالن بنتا۔ پانی موافق نہیں آ رہا تھا۔ اسے دوبارہ فوڈ پوائزن ہو چکا تھا۔ شرمندہ بھی ہوتی سب دلاسہ دیتے کوئی بات نہیں۔

''میں مرچ کھانے لگے گی۔'' وہ کہتی۔

''کھانے لگوں گی۔'' دردانہ جھٹ اس کا تلفظ درست کرتی۔

وہ اوکے۔ تھینکس کہہ کر صحیح جملہ بولتی۔ ہمیشہ وہ دو ایک نوالے دردانہ کی پلیٹ سے ضرور لیتی کہ مرچ کی عادت پڑے۔ مگر حالت بری ہو جاتی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے رخسار دباتی۔ خالی نوالہ چباتی۔ سویٹ ڈش سے ایک چمچ بھر کر کھاتی اور کہتی۔ ''سوری۔'' سب مسکرا کر رہ جاتے۔

فرجام اپنے دھیان میں کھانے میں مصروف رہتے۔ کبھی کبھی ایک آدھ نظر ڈالتے۔ اس سے اس کا چہرہ گلابی ہو جاتا۔ ناک سے بہتا پانی جلدی جلدی ادھر ادھر ہاتھ مار کر کوک کا گھونٹ' سویٹ ڈش کھانا ایک دلچسپ سین ہوتا۔

کل اس نے دردانہ کے ساتھ جا کر ریڈی میڈ سوٹ خریدے سلوا کی جانب سے بھاری رقم کا ڈرافٹ مل گیا تھا۔ اس نے لوسی کے لیے تحفہ لیا۔ جان کے لیے بھی خریدا۔ اس کا پارسل بنا کر پوسٹ کیا۔ خود اپنے لیے شلوار قمیض' کرتا لیا۔

لڑکیاں دوپٹہ لیتیں تو اسے خود بخود احساس ہوتا کہ مجھے بھی دوپٹہ اوڑھنا چاہیے۔ جب کہ کسی نے اس سے کچھ نہ کہا تھا۔ ارجمند تو بھتیجی پر صدقے واری جاتیں۔

اس نے آج کالا ہائی نیک کا کرتا پاجامہ پہنا تھا۔ سرخ نازک چپل' کتنی دلکش لگ رہی تھی وہ۔

''ہم اچھا لگا ہے نا؟'' اس نے ثوبیہ' دردانہ سے پوچھا۔

''ہاں بہت اچھی لگ رہی ہو بلکہ بہت پیاری۔ ٹھہرو میں تمھاری تصویر اتاروں۔'' دردانہ کیمرہ لینے بھاگی۔

''یہ بہت مشکل۔'' اس نے دوپٹے کی طرف دیکھا جو بار بار پھسل رہا تھا۔

اس کی اردو پر ثوبیہ مسکراتی رہی۔ اسے اچھا لگتا تھا اس کا اس طرح بولنا۔ مگر دردانہ کہتی تھی۔ میں اس کی اردو صحیح کرا کے رہوں گی۔

''یا اللہ میاں اسے میری بھابی بنا دے۔'' روزانہ نماز کے بعد اور دعاؤں میں اس نے یہ دعا

بھی شامل کر لی تھی۔

شارمن ثوبیہ اور دردانہ کے ساتھ لان میں ٹہل رہی تھی کہ فرجام کی مرسڈیز پورچ میں آ کر رکی۔ کوئی اور بھی ہمراہ تھا۔ تینوں درخت کی اوٹ میں ہو گئیں۔ فرجام کے ساتھ ایک سانولی سی پرکشش حسینہ بیٹھی تھی۔

''لو یہ پھر آ گئی۔ شہانہ قدیر' یہ بھائی جان کو لے ڈوبے گی۔ مجھے ذرا پسند نہیں۔'' دردانہ جل کر بولی۔ شہانہ مسکراتی ہوئی فرجام کے ساتھ چل رہی تھی۔ پشت پر بے حد خوبصورت لانبی سی چوٹی کمر سے نیچے جھول رہی تھی۔

شارمن بے قراری سے لب دانتوں سے کچلنے لگی۔

''دیکھنا اب یہ کھانا کھا کر جائے گی۔ امی کی چاپلوسی کرے گی بڑی تیز لڑکی ہے۔ امی جان کو مٹھی میں جکڑ لینا ہے اس نے۔'' دردانہ ثوبیہ اس کی حالت سے بے خبر باتوں میں مصروف تھیں۔

''ہمارے ڈیپارٹمنٹ کی نازیہ زبیری نے پرسوں انھیں شاپنگ سینٹر پر دیکھا تھا۔ اس نے بتایا۔ اس سے پہلے کسی کسٹم کلکٹر کے پیچھے پڑی تھی۔ قسمت کا دھنی نکلا۔ بچ گیا۔ شادی اپنی کزن سے ہو گئی۔ بہت ہی خرانٹ لڑکی ہے۔'' دردانہ نے انکشاف کیا۔

''لڑکی کیا ٹھیک ٹھاک عورت نظر آتی ہے۔'' ثوبیہ نے جل کر کہا۔

''خیر یہ تو غلط ہے۔ ہے تو بہت پیاری ہمیں اچھی نہیں لگتی یہ اور بات ہے۔'' دردانہ بولی

''ہیں..... یہ تمھیں کیا ہوا؟'' دردانہ چونکی۔ شارمن کی آنکھیں جل تھل تھیں۔ اشک بہنے کو بے تاب تھے۔

''کچھ نہیں۔'' وہ یہ کہہ کر تیزی سے اندر بھاگی۔

''یہ کیا ہوا؟'' ثوبیہ حیران ہو کر بولی۔

''میں بتاؤں یہ فرجام بھائی کو پسند کرنے لگی ہے۔ دیکھتی نہیں ہو سب کو سویٹ برادر کہتی ہے انھیں صرف مسٹر فرجام' پھر دیکھتی کیسے ہے۔ قسم سے مجھے بہت پیاری لگتی ہے۔ دل چاہتا ہے بھابی بنا لوں۔ اس وقت شہانہ قدیر کو دیکھ کر اسے دکھ ہوا۔ تبھی روئی ہے۔''

''یہ تو کھل کھلا اقرار ہے۔'' وہ بولی۔

''تو اور کیا۔''

''میرا بس چلتے تو شہانہ قدیر کو گھر میں گھسنے نہ دوں۔''

''ثوبی' دانی' بھئی میں تم دونوں کو پوچھ رہی تھی کب سے۔'' شہانہ قدیر فرجام کے ساتھ لان میں آتے ہی بولی۔

''اب اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرنا پڑیں گی۔ اوور ایکٹنگ۔'' دونوں نے ٹھسر پھسر کی۔ پھر جبراً مسکرا کر سلام کیا۔

''کبھی لائیں نا انھیں میرے گھر فرجام۔'' وہ اٹھلا کر بولی۔

''ضرور۔'' وہ اس کی اس ادا پر قربان ہو گئے۔

''کل لے آئیں۔''

''سوری آج کل میں میرے امتحان شروع ہو جائیں گے پھر کبھی سہی۔'' دردانہ نے جلدی سے عذر پیش کیا۔

''یہ سلسلہ تو چلتا رہتا ہے میں انھیں لاؤں گا۔'' فرجام جلدی سے بولے۔

''چلو جی فیصلہ ہو گیا۔'' دونوں جز بز ہو کر رہ گئیں۔

شہانہ امیر بانو کے پاس جا بیٹھی۔ ان سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگی۔ ان سے کہا۔

''آنٹی کل آپ ضرور آیئے گا۔ ہمارے گھر

ثوبیہ بھی آ رہی ہیں۔''

''میں کہاں آتی جاتی ہوں گھٹنے میں بہت تکلیف ہے۔ چلنا پھر محال ہے۔ بچیاں آ جائیں گی۔ شارمن کو بھی ضرور لے جانا۔'' امیر بانو نے کہا۔

''لو یہ امی تو پروگرام پکا کرتی جا رہی ہیں۔'' ثوبیہ نے سوچا۔

''شارمن کون ہے؟'' وہ حیران سے بولی۔ امیر بانو نے مختصراً اس کے بارے میں بتایا۔

''واہ پھر تو بہت خوبصورت چیز ہو گی۔ بلاؤ نا اسے۔'' وہ بڑے اشتیاق سے بولی۔

خوبصورت انشاء اللہ مات دے دے گی تمھیں۔ یا اللہ اس شہانہ قدر کے بال جھڑ جائیں۔ چوٹی کٹ جائے جس کے دیوانے ہو رہے ہیں۔ شارمن بال بڑھائے تو اس سے سو کروڑ درجے حسین ہو جائیں اس کے بال۔''

وہ اپنی بچکانہ دعا پر خود ہی مسکرائی اور ہولے سے دروازہ بجا کر اندر آ گئی۔

شارمن بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بار بار ہتھیلیوں سے آنکھیں صاف کر رہی تھی۔

''شاری تم اب تک رو رہی ہو؟'' وہ تشویش سے بولی۔ جب اس پر بے حد پیار آتا تو اسے شاری کے نام سے پکارتی۔ وہ گھٹنوں میں چہرہ دبا کر بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''نہیں..... نہیں یہ غلط ہے۔ پلیز رونا بند کرو۔'' اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ آنسو پونچھے۔

''نہیں میں تو نہیں رو رہی۔'' وہ زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لانے میں کامیاب ہو گئی۔ نیلے کی کنی کے مانند دمکتی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ اٹھ کر منہ ہاتھ دھونے کے لیے باتھ روم میں چلی گئی۔

''اس کا مطلب ہے کہ میرے اندازے درست نکلے۔'' دردانہ نے سوچا۔

''یہ میرے بھائی کو پسند کرتی ہے کاش بھیا بھی اسے پسند کر لیں۔ اس کا رنگ ہمارے علاقے کے پہاڑی لوگوں جیسا ہے۔ کشمیری پٹھان لگتی ہے۔ اتنی پیاری معصوم سی لڑکی ہے۔''

شارمن باتھ روم سے نکل آئی۔ رونے سے رنگت اور دہکنے لگی تھی۔ کالا کرتا سامنے سے بھیگ رہا تھا۔

''میں تمھیں بلانے آئی تھی آؤ تمھیں شہباز قدیر سے ملوائیں۔ وہی لڑکی جو فرجام بھائی کے ساتھ آئی تھی۔''

''او مسٹر فرجام کو اچھا لگتی؟'' اس نے ٹکڑے ہوتے دل سے سوال کیا۔

''لگتا ہے مگر ہمیں نہیں پسند۔ مجھے تو بالکل اچھی نہیں لگتی۔ بھائی جان کو بے وقوف بنا لیا ہے۔''

''نو..... اتنے بڑے آدمی کو بے قوف۔ مسٹر فرجیم انٹرسٹڈ ہیں نا۔'' وہ پلکیں جھپکانے لگی۔ یعنی بادل پھر گھر آئے تھے اور بارش کے آثار یقیناً تھے۔

''تم بالکل نہیں رو ؤ گی۔ ایک بات بتاؤ۔ میرے بھائی تمھیں اچھے لگتے ہیں؟''

لیس بوت..... بوت مسٹر فرجیم کو نہیں بتانا ہماری قسمت کھراب ہے۔'' وہ بے بسی سے بولی۔ اس کے دکھ بھرے انداز پر دردانہ کو اس کا تلفظ صحیح کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اسے تو خود بھی رونا آ گیا۔ میں مجبور کروں گی کہ بھائی جان شارمن سے شادی کر لیں۔ اگر انھوں نے شہانہ قدیر سے کی تو میں شریک نہیں ہوں گی۔ کچھ نہیں کروں گی۔ بات بھی نہیں کرتی پھر ان سے۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا۔

''خود کو مضبوط کرو سب کے سامنے رونا نہیں۔''

"اوکے۔" اس نے گردن جھکا کر لب کاٹے۔ یہ دونوں پہنچیں تو سب کھانے کی ٹیبل کے گرد بیٹھے تھے۔

فرجام نے سالن کی ڈش اٹھا رکھی تھی۔ شہانہ بڑی نزاکت سے نکال رہی تھی۔ فرجام مسکرا رہے تھے۔ وہ بھی بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

"کنجوسی نہیں چلے گی۔" فرجام نے اس کی پلیٹ میں مزید سالن ڈالا۔

"نہیں پلیز میں اتنا نہیں کھا سکوں گی۔" وہ نخرے سے بولی۔

شارمین نے دانیہ کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ کتنی نروس ہو گئی تھی۔ ہاتھ ٹھنڈے برف تھے۔

"یہ کیا ہو گیا ہے انھیں، امی جان اور پھپھو کا بھی خیال نہیں۔" دردانہ کو آگ ہی لگ گئی۔

"ثوبی ذرا سلاد کی پلیٹ دینا۔"

فرجام نے اسے گھورا۔ اس طرح بولنا انھیں قطعی پسند نہیں تھا۔ وہ نظریں چرا گئی۔ اس کا مقصد ہی انھیں توجہ دلانا تھا۔ دردانہ نے پہلے شارمن کو پلیٹ میں سلاد ڈالا۔

"دانی میں صرف کوک پیوں گی۔" شارمن نے کہا۔

"کھانا کھاؤ۔" دردانہ نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

"اوہ یہ ہے شارمن..... ہیلو۔" شبانہ چونک کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"السلام علیکم۔" اس کے ہیلو کہنے پر شارمن نے کہا۔

"ویری گڈ۔" دردانہ نے پیر سے اس کے پیر کو تھپکی دی۔ وہ اتنی اپ سیٹ تھی کہ مسکرا بھی نہ سکی۔

"بہت کیوٹ ہے۔" شبانہ بے اختیار تعریف کر گئی۔ سیاہ قمیض کے ہائی نیک میں اس کی نازک شفاف گردن پر حسین چہرہ بے پناہ دلکش تھا۔ چاندی سی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ فرجام لمحے بھر کو ٹھٹکے۔ پھر نگاہ اس کے ہاتھوں پر جا پڑی۔ اس نے سبز گلاس کے گرد دونوں ہاتھ لپیٹ رکھے تھے۔ سونے کا چھلا سیدھے ہاتھ کی تیسری انگلی میں جس میں ایک منا سا سرخ نگ چمک رہا تھا شارمن نے ہلکا سا گھونٹ کوک کا لیا۔ حلق میں پھندے سے پڑنے لگے تھے جنھیں دھکیلنا ضروری تھا۔

"کھانا کھاؤ بیٹی۔" ارجمند بولیں۔

"نو تھینکس۔"

"سویٹ ڈش تو کھاؤ برکت نے دنیا کا ہر فروٹ ڈال رکھا ہے اس میں۔" امیر بانو بولیں۔

بیٹے کا یہ انداز انھیں بھی نہ بھایا تھا۔ شبانہ قدیر انھیں بھی پسند نہ تھی۔ بیٹے کو پسند آ گئی تھی۔ لہذا چپ تھیں۔

"تھینکیو۔" شارمن نے پیالی میں کسٹرڈ نکالا۔

"اردو آپ کو ٹھیک ٹھاک آتی ہے۔ کل آپ ضرور آیئے گا ہمارے گھر۔" شبانہ قدیر نے براہ راست اسے مخاطب کیا۔

"میں....." شارمن نے "میں" کو کھینچا۔ پلکیں اوپر اٹھائیں۔ گھنی پلکوں کے جھرمٹ میں فیروزی آنکھوں نے حرکت کی انگلیاں کتنی گلابی ہو رہی تھیں۔ حسن دوبالا ہو گیا تھا۔

فرجام نے سرسری نگاہ ڈال کر ہٹا لی۔ خفیف سے شانے اچکائے۔ کانٹے اور چمچ کی مدد سے بڑے سلیقے سے چاول کا نوالہ منہ میں رکھا۔ اس کی نگاہ پھر شارمن کی طرف اٹھ گئی۔ وہ بڑی بے دلی سے چمچ پیالی میں گھما رہی تھی۔ یعنی کسٹرڈ کھانے کا بھی موڈ نہیں تھا۔

"تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" ارجمند نے اسے پیالی میں چمچ گھماتے دیکھا تو تشویش سے پوچھا۔

"ٹھیک بالکل۔" اس نے انھیں مطمئن کر دیا۔

"میں کل آپ سب کا انتظار کروں گی۔" شہانہ قدیر میز سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"انتظار نہیں کیجیے گا۔ آنے کا پروگرام ہو گا تو فون کر دیں گے۔" دردانہ جھٹ سے بولی۔

فرجام نے غصے سے بہن کو دیکھا۔ جانتے تھے کیوں عذر کر رہی ہے۔ انھیں پتہ تھا کہ وہ شہانہ قدیر کو قطعی پسند نہیں کرتی۔ فرجام شہانہ کو چھوڑنے اس کے گھر جا رہے تھے۔ ہنستی مسکراتی شہانہ ان کے برابر بیٹھی شارمن نے منہ پھیر لیا۔

لوسی نے شادی کی تصویر بھجوائی تھی۔ شارمن کا تحفہ بہت پسند آیا تھا۔ اس نے اسے اور جان کو بہت خوبصورت کپڑوں کے پیس بھیجے تھے۔ اس نے لکھا تھا پاکستانی کپڑے پہننے کی کوشش کرتی ہوں۔ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ تمھاری مرضی جو بھی لباس بنا لینا۔ آف وائٹ سوٹ والے کے بارے میں تم نے کچھ نہیں لکھا جان بھی کہہ رہے تھے تم۔ اس سے شادی کرنا۔ پھر دونوں مل کر امریکہ آنا۔ خوب انجوائے کریں گے۔ میری مدد ان لاتم کو بہت پیار کہہ رہی ہیں۔ ہم سب مل کے بہت خوش رہتے ہیں۔"

اس نے جواب میں لکھ دیا۔

"وہ مسٹر فرجیم ہے۔ مجھے پسند نہیں کرتا۔ کسی اور لڑکی سے شادی کرے گا۔ ویسے میں اس کو بہت پسند کرتی ہوں اور چاہتی ہوں اس سے شادی کروں۔ اگر اس سے شادی نہ ہوئی تو میں کبھی بھی کسی سے شادی نہیں کروں گی۔"

اپنی تازہ تصویریں بھی بھیجیں۔ ماں کو بھی خط لکھا آج کل اسے ماں بہت یاد آ رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا اس کے سینے میں منہ چھپا کر خوب روئے۔ اس نے سوچا کہ خود کو مصروف رکھنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔

"سویٹ عدیل بھائی میں پینٹنگ سیکھوں گی۔" عدیل سے تو وہ دنیا جہان کی باتیں کرتی۔ بڑا سکون ملتا تھا۔ وہ قریب ہوتا تو یوں لگتا باپ کے پاس بیٹھی ہے۔ وہ بھی اسے بہت عزیز رکھتا۔

"ضرور سیکھو۔" عدیل نے اس کی ہمت افزائی کی۔

"ہاں مجھے بہت بوریت ہوتا..... نو..... ہوتی۔" اس نے خود ہی جلدی سے تلفظ درست کر کے دانی کی سمت دیکھا۔

"بالکل درست تم کو اچھی اردو آ گئی ہے۔" دانی نے تالی بجائی۔

"اس خوشی میں عدیل بھائی آئس کریم کھلائیں گے۔" ثوبیہ نے نعرہ بلند کیا۔

"زبردستی کھلائی تو شارمن کو چاہیے۔ کافی مال دار ہے۔" وہ شرارت سے بولا۔

"اوکے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں۔" اس نے پروگرام کو ڈن کر دیا۔

"بہت خوب..... بہت مہنگا سودا ہے۔"

"آپ اتنے پیارے بہن بھائی ہیں پیسہ بہت۔"

"یہ ہوئی نہ بات۔ چلو اس خوشی میں میٹھے پان میرے ذمے۔" شارمن کو عدیل نے پہلی بار پان کھلایا تو سمجھ میں نہ آیا۔ جلدی سے ٹشو پیپر پر تھوک دیا۔

"اب پھینکو اسے۔" عدیل بولا۔ اس نے پان ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔

"یہاں کوئی ڈسٹ بن نہیں ہے؟" وہ ادھر ادھر دیکھتی ہوئی بولی۔

"کوئی بات نہیں اسے تم کھڑکی سے باہر پھینک دو۔"

تب اس نے ڈرتے ڈرتے پھینکا اور گردن

گھما کر دیکھنے لگی۔ جیسے کوئی جرم کر رہی ہو۔

''یہاں کوئی کچھ نہیں کہتا۔ پروا مت کرو۔ مگر تم نے پان کی توہین کی ہے۔ ہماری روایت کا حصہ ہے پان۔ کھانا پڑے گا۔''

''پتہ نہیں کیا کیا ہے۔'' وہ گھبرائی۔

''یہی تو کمال ہے مشرقی کا۔ لو کھاؤ۔'' انھوں نے دوسرا چاندی کے ورق میں لپٹا پان کھلایا۔

''اچھا..... اچھا ہے۔'' وہ تیزی سے منہ چلانے لگی۔

''اسٹون..... اسٹون۔'' وہ چلائی۔

''خبردار جو پھر منہ سے نکالا۔ پتھر نہیں ہے چھالیہ ہے دانتوں سے توڑو لطف آئے گا۔''

''یہ دو بکریاں بے تحاشہ کھاتی ہیں چھالیہ۔'' عدیل نے دانی ثوبی کی سمت اشارہ کیا۔

اب اکثر وہ پان کھاتی۔ اسے پان بہت مزے دار لگتا۔ شام کو سب لوگ مل کے پی سی لنچ کرنے آئے۔ کافی رش تھا۔

''اوہ آج ہفتہ ہے اور خالص مشرقی کھانے کا دن۔ جاتے ہوئے پان ملے گا۔''

''وہ ہوگیا میری طرف سے۔'' عدیل بولا۔

''اور آئس کریم؟'' شارمن چونکی۔

''ملے گی وہ بھی۔'' وہ انھیں لیے کرسٹل لاؤنج میں آ گیا۔ جگمگاتے فانوس جابجا لٹکے تھے۔ بے حد خوبصورت تھے۔

''ونڈرفل۔'' شارمن کو بے پناہ دلکش لگا۔

وہ ٹیبل کے گرد بیٹھ گئے۔ شارمن مینو اٹھا کر دیکھنے لگی۔

اسی وقت فرجام آتے نظر آئے۔ ان کے ہمراہ شہانہ قدیر تھی۔ دانی نے انھیں دیکھ کر برا سا منہ بنایا۔

''چڑیل لگتی ہے مجھے۔''

''تمھاری بھابی بننے کی کوشش میں ہے۔''

''خدا نہ کرے جو میں اس کی نند بنوں۔ پیلے کپڑوں میں بھنگن لگ رہی ہے۔'' ثوبیہ کو ہنسی آ گئی۔

''عدیل بھائی مجھے یہ کیریکٹر کی اچھی نہیں لگتی۔ فرجام بھائی کو جانے اس میں کون سی کشش نظر آتی ہے۔''

''موڈ درست کرو میرا خیال ہے دیکھ لیا ہے انھوں نے۔ ادھر ہی آ رہے ہیں۔'' عدیل بولا۔

مہندی رنگ کی آدھی آستین کی شرٹ اور نیلی جینز میں وہ بے حد اسمارٹ لگ رہے تھے۔

''واہ بھئی سب لوگ ہیں۔ ہماری جگہ بھی ہے۔'' وہ بولے۔

بیرے نے جلدی سے دو کرسیاں لا کر قریب رکھ دیں۔ چاروں نے کساٹا منگائی۔

''یہ میری فیورٹ آئس کریم ہے۔'' شارمن دردانہ سے بولی۔

''پتہ نہیں مجھے کیوں نہیں پسند۔ فرجام کو بھی بہت پسند ہے۔ خاص طور پر کھانے یہاں آتے ہیں۔'' شہانہ قدیر بولی۔

شارمن کے دل میں ایک مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

دردانہ ثوبیہ خود بخود خوش ہونے لگیں۔ باتوں کے دوران آئس کریم کھائی جا رہی تھی۔ البتہ شارمن کی ساری توجہ آئس کریم کی طرف تھی۔ دل میں خوشگوار ہلکورے اٹھ رہے تھے۔ شفاف پیالے میں آئس کریم تھی۔ کنارے لگے ویفر بسکٹ کو ہلکا سا دانتوں سے توڑتی۔ ہمراہ عمدگی سے کٹا فروٹ۔ بے پناہ حسین ماحول۔ دل چاہ رہا تھا یونہی بیٹھی رہے۔ کتنے قریب بیٹھے تھے فرجام۔ شہانہ قدیر کا وجود خوشی کے اس موقع پر ذرا بھی تو پسند نہیں آ رہا تھا۔ کیا کبھی ایسا ہوگا کہ میں اور فرجام یہاں بیٹھ کر آئس کریم کھائیں

گے؟

''کبھی نہیں۔'' ذہن نے جواب دیا۔ دکھ کی لہر سی اٹھی۔ وہ اس وقت آئس کریم کھا کر فارغ ہو چکی تھی۔ فرجام نے نگاہ بٹالی۔ جو بار بار اس کی آرٹسٹک ہاتھوں پر جا ٹھہرتی تھی۔

سب ہی تقریباً آئس کریم ختم کر چکے تھے۔ شارمن نے شولڈر بیگ سے رقم نکالی۔ فرجام کا ہاتھ بھی تیزی سے پرس کی جانب بڑھا۔

''شارمن نے کھلائی ہے آئس کریم۔ رہنے دیں آپ۔'' دردانہ بولی۔

''ہم انوائٹ نہیں تھے۔'' انھوں نے سنجیدگی سے کہہ کر اپنے اور شہانہ قدیر کے پیسے پلیٹ میں رکھ دیئے۔

''پلیز آپ میرے گیسٹ تھے۔'' شارمن نے اپنی توہین محسوس کی۔

''میں سمجھا تھا عدیل کھلا رہا ہے۔ چلیں شہانہ۔'' وہ کہہ کر بے اعتنائی سے چلے گئے۔

شارمن کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

''بالکل پتھر ہے۔ مجھے کچھ نہیں سمجھتا۔'' وہ دل ہی دل میں بولی۔ فضا مکدر ہوگئی۔

''رونے مت لگنا۔'' دردانہ نے اس کا بازو تھاما۔ سب کا موڈ آف ہو چکا تھا۔

''تم رکھو تمھاری آئس کریم ادھار رہی۔ میں بل دیتا ہوں۔'' عدیل بولا۔

''نہیں پلیز میں بہت اپ سیٹ۔'' اس کے حلق میں آنسوؤں کے گولے پھنسنے لگے۔ اس نے چپکے سے پلکوں کے کنارے صاف کیے۔ عدیل نے پان لیے۔

دردانہ نے وی۔ آئی۔ پی کار پارکنگ میں فرجام کی گاڑی کھڑی دیکھی۔ یعنی کہ ابھی تک وہ یہیں موجود تھے۔

''خدایا میرے بھائی کو شہانہ قدیر کے چنگل سے چھڑا۔'' اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔

اسے بھائی پر بڑا غصہ آ رہا تھا۔ پر کیا کرتی۔ مجبور تھی۔ امیر بانو سے بھی کہا تھا امی جان اگر بھائی جان نے شہانہ قدیر سے شادی کی تو مجھ بہت صدمہ ہوگا۔''

''اسے ہزاروں لڑکیوں میں سے یہی پسند آئی ہے۔ میری تو تمنا ہے فرجام جلد بیاہ کر لے۔ تم اپنے گھر کی ہو جاؤ۔''

مجھے تو ثوبیہ بھی پسند ہے۔ گھر کی بچی ہے۔ فرجام کا عندیہ لیا تھا۔ مگر وہ سنتے ہی بھڑک اٹھا۔ کہنے لگا وہ مجھے دردانہ جیسی پیاری ہے۔ میں اسے اپنی سگی بہن سمجھتا ہوں۔ میں چپ ہوگئی۔

یہ شارمن تو اتنی پیاری بچی ہے پڑھی لکھی۔

''یہ میری بہو بن جائے تو میرے دل کی خواہش پوری ہو جائے۔''

''آپ کو بھی پسند ہے۔'' دردانہ خوشی سے چلائی۔

''ہاں بے حد۔'' انھوں نے اقرار کیا۔

''فرجام بھائی پر دباؤ ڈالیں۔ آپ کی بات نہیں ٹالیں گے۔ مجھے تو اتنی اچھی لگتی ہے کہ کیا بتاؤں۔''

وہ کہتے کہتے رک گئی کہ شارمن خود انھیں جنونی انداز سے چاہنے لگی ہے۔ یہ مناسب نہیں تھا۔ ہمارے معاشرے میں کب اجازت ہے کہ لڑکی خود کہتی پھرے کہ مجھے فلاں لڑکا پسند ہے اس سے شادی کروں گی۔

''میں فرجام پر دباؤ نہیں ڈال سکتی۔ وہ جس سے چاہے گا شادی کر دوں گی۔ اپنا اچھا برا وہ خود بہتر جانتا ہے۔'' امیر بانو بولیں۔

''کہاں جانتا ہے وہ کوئی اچھی لڑکی نہیں۔ سب کہتے ہیں اچھے کردار کی نہیں۔''

''تم کہہ کر دیکھ لو میں اس معاملے میں کچھ نہیں کروں گی۔ میں فرجام کو کسی قیمت پر ناراض نہیں کر سکتی۔''

''آپ ایک دفعہ کہہ کر تو دیکھیں۔ شارمن میری بھابی بن جائے۔'' دردانہ نے زور دیا۔

''میرے اور تمھارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا بیٹی۔'' انھوں نے سمجھایا۔

شارمن کی بوریت میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ وہ کچھ کرنا چاہتی تھی۔ ملازمت وغیرہ۔ ملازمت کرنے سے امیر بانو اور ارجمند نے منع کر دیا۔ البتہ اسے مصوری کرنے کی اجازت مل گئی۔ اب اسے انتظار تھا کہ کب ایڈمشن شروع ہوتے ہیں۔

کرسمس کی آمد آمد تھی۔ شارمن نے سب کو امریکہ کرسمس کارڈ بھیجے۔ سلوانے خوبصورت لانگ اسکرٹ کوٹ شوز پارسل کیا۔ شارمن بہت خوش تھی۔ وقتی طور پر بوریت دور ہوگئی۔

''مسلمان ہو کر کرسمس کی تیاری کیوں کر رہی ہے؟'' ارجمند کو اعتراض ہوا۔

''امی آپ اسے کچھ نہیں کہیں گی۔ ہم سب اسے تحفے دیں گے۔'' ثوبیہ نے سمجھایا۔

کرسمس کے دن شارمن بے حد خوبصورت لانگ اسکرٹ میں ملبوس خوش خوش باتوں میں مصروف تھی۔ عدیل، ثوبیہ، دردانہ نے اسے تحفے دیئے وہ انھیں پا کر مسرور تھی۔ عدیل نے رات کو سیر کا پروگرام بنایا۔

''کھانا بھی باہر کھائیں گے، اوکے۔''

فرجام خوب بنے ٹھنے کہیں جانے کو تیار ہو کر کار کی چین گھماتے اپنے بیڈروم سے نکلے۔ شارمن سامنے آ گئی۔ وہ ششدر سے رہ گئے۔ اس نے بڑی محبت سے ہیپی کرسمس کہا۔ وہ اسے بری طرح گھورتے ہوئے چلے گئے۔ بارمن نروس ہو کے رہ گئی۔ اس نے بے چینی سے انگلیاں مسلیں اور تیزی سے پلکیں جھپکانے لگی۔ دردانہ تھوڑے فاصلے پر کھڑی بھائی کے رویے پر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

اگر اوپری دل ہی سے مسکرا کر جواب دے دیتے تو کیا چلا جاتا۔ شارمن سسکیاں دبائی تیزی سے چلی گئی۔

''شاری۔'' اس نے پکارا مگر وہ رکی نہیں۔ بیڈروم میں گھس گئی اور لاک لگا لیا۔

''اب یہ روئے گی۔ کتنا اچھا موڈ تھا اس کا آج گڑبڑ ہوگئی۔'' دردانہ پریشان ہوگئی۔

''شارمن۔'' دردانہ نے دروازہ بجایا۔ کھڑکی سے جھانکا۔ وہ صوفے میں دھنسی عادت کے مطابق چہرہ گھٹنوں میں چھپائے بیٹھی تھی۔

''کھولو دروازہ۔'' شارمن نے آنسوؤں سے تر چہرہ اوپر کیا اور اٹھ کر دروازہ کھولا۔

''منہ دھولو۔'' دردانہ نے اسے باتھ روم کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

شارمن منہ دھو کر تولیے سے پونچھتی چلی آئی۔ اس کا دل پھر بھر آیا۔ اس نے تولیے سے منہ چھپالیا۔

''کیا بے وقوفی ہے شارمن آج تو خوشی کا دن ہے تم آج رو رہی ہو۔''

''میں خوش نہیں۔ ختم ہوگئی خوشی۔'' اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''یا خدا اس پیاری سی لڑکی پر رحم کر۔ اسے میری بھابی بنا دے۔'' دردانہ نے دل ہی دل میں پھر دعا کی۔ اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر پیار سے کہا۔

''آؤ باہر چلیں۔''

لیکن شارمن نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور الماری سے کپڑے نکال کر باتھ روم میں گھس گئی۔

دردانہ سوچتی رہ گی۔

''کیا بنے گا اس کا۔ برباد ہو کر رہ جائے گی۔ یہاں سکون کے لیے آئی ہے مگر مزید بے سکون ہوگئی۔ کتنا خوش نصیب انسان ہوگا جس کی یہ دلہن بنے گی۔ آ جائے گی میری بھابی بن کے وہ چڑیل۔ شہانہ قدیر۔''

شارمن باتھ روم سے آئی تو دردانہ دیکھتی رہ گئی۔ وہ گہرے نیلے شلوار کرتے میں بہت خوبصورت نظر آ رہی تھی۔

''دانی پلیز مجھے ڈسٹرب نہیں کرو۔'' اس نے بستر میں گھس کر چادر اوپر لے لی۔

''عدیل بھائی کیا کہیں گے شاری۔ انھوں نے اتنے شوق سے پروگرام بنایا تھا۔ اٹھو۔'' اس نے شارمن کا کندھا ہلایا۔ وہ تکیوں میں منہ چھپائے روتی ہوئی بولی۔

''پلیز۔''

دردانہ دروازہ بند کر کے نکل گئی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ فرجام سے اس سلسلے میں ضروریات کرے گی۔

اس دن دردانہ کو موقع مل گیا۔ وہ فرجام کے ساتھ کالج جا رہی تھی۔ ثوبیہ نے لیٹ جانا تھا۔ اس نے موقع دیکھ کر بات چھیڑ دی۔

''بھائی جان شارمن بہت اچھی لڑکی ہے آپ اس سے شادی کر لیں۔''

فرجام نے ترچھی نگاہ بہن پر ڈالی۔

''پاگل تو نہیں ہوگئیں؟ میں اس آدھی انگریز آدھی مسلمان لڑکی سے شادی کر لوں۔ ہرگز نہیں۔''

''وہ پوری مسلمان ہے۔ اردو ٹھیک ٹھاک بول لیتی ہے۔ آج کل ویسے بھی لڑکیوں کو انگریزی بولنے کا شوق ہے۔ یہ تو پھر.....'' انھوں نے بات کاٹ دی۔

''میری پسند، میرا بھی تو کوئی آئیڈیل ہے۔ تم نے اس کے بارے میں کیوں نہیں سوچا؟'' اشارہ صاف شہانہ قدیر کی سمت تھا۔

''مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی۔ امی کو بھی پسند نہیں۔''

''کیوں؟ کیا خرابی ہے اس میں؟'' فرجام علی کو اپنی پسند کی توہین پر غصہ آ گیا۔ دردانہ قدرے ڈر سی گئی۔

''مجھے خالص مسلمان لڑکی چاہیے۔ اور وہ میں نے ڈھونڈ لی ہے۔ آپ صرف چٹی چمڑی دیکھ کر پھسل پڑیں۔''

''اس میں بہت اوصاف ہیں۔ وہ ہمارے گھر میں ایڈجسٹ ہو جائے گی۔ بلکہ ہو چکی ہے۔ وہ آپ کو بہت پسند کرتی ہے۔ اور آپ کے سوا.....'' وہ بھائی سے یہ بات کہتے ہوئے جھجک کر رک گئی۔

''یہ دعوے بہت سی لڑکیاں کرتی ہیں اور جانے کتنی لڑکیاں مجھے پسند کرتی ہیں۔ اب سب سے تو نہیں کر سکتا میں شادی۔ صرف ایک لڑکی یہ درجہ حاصل کرے گی اور میں شہانہ قدیر سے شادی کروں گا۔ وہ مجھے پسند ہے۔ اچھی لڑکی ہے۔''

یہ کہتے ہوئے اسی پل جانے کہاں سے چھم سے شارمن فرجام علی کی نگاہوں کے سامنے آ گئی۔ مسکراتی حسن کی بجلیاں گراتی انھیں کرسمس کی مبارکباد دے رہی تھی۔

انھوں نے زور سے سر جھٹکا اور چونک کر دردانہ کی سمت دیکھا۔ وہ بہت چپ چپ نظر آ رہی تھی۔

دردانہ پھر کچھ نہ بولی۔ بھائی کو خدا حافظ کہہ کر گاڑی سے اتر گئی۔

دوپہر کو گھر واپس آئی تو موڈ بہت خراب تھا۔ خلاف توقع شارمن آج اسے مسکراتی ہوئی نظر آئی۔

''ایڈمشن ہوا۔ آرٹ کونسل میں کلاس ہوگا۔'' اس نے خوش ہو کر بتایا۔

''ایڈمشن ہوگیا آرٹ کونسل میں کلاس ہوگی۔'' دردانہ نے مسکرا کر اس کی تصحیح کی۔

"اوکے۔" شارمن ہنس دی۔ دردانہ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کے لبوں پر ہنسی تو آئی ورنہ اس روز کے بعد اسے چپ سی لگ گئی تھی۔

شارمن کا پینٹنگ میں کافی دل لگ گیا۔ ایک لڑکی نائلہ جدون سے تو کچھ زیادہ ہی میل ملاپ ہوگیا۔ نائلہ بہت بولڈ قسم کی لڑکی تھی۔ سب سے جلد گھل مل جاتی۔ جب کہ مغربی معاشرے میں پرورش پانے کے باوجود شارمن بہت سنجیدہ طبیعت کی مالک تھی۔ لیے دیئے رہتی۔ کسی نے بات کرلی تو جواب دے دیا۔

اکثر وہ شام کو لان میں بیٹھی تصویر مکمل کر رہی ہوتی تو فرجام علی کی گاڑی کے ہارن کی آواز سن کر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ وہ انھیں دیکھتی۔ مگر فرجام علی بڑی بے اعتنائی سے گزر جاتے۔

جس روز شہانہ قدر ان کے ہمراہ ہوتی شارمن کی اچھی بھلی تصویر بگڑ جاتی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔

پینٹنگ اسے پہلے بھی آتی تھی۔ اب کافی مہارت ہوگی تھی۔ وہ کافی اچھی تصویر بنا لیا کرتی۔ جب وہ رنگ و برش کی دنیا میں گم ہوتی تو اسٹوڈنٹ لڑکے اسے چپکے چپکے دیکھا کرتے۔

آج کل بڑے زور شور سے نمائش کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ شارمن بھی گھر آ کر کام میں لگی رہتی۔ دردانہ کے امتحان ہونے والے تھے وہ پڑھائی میں جتی رہتی۔ ثوبیہ صبح کی گئی شام کے قریب یونیورسٹی سے لوٹتی۔ تینوں کی آپس میں بات چیت کم ہو ہوتی۔

اس کا آنے جانے کا مسئلہ تو حل ہو چکا تھا۔ نائلہ جدون اپنی گرے سوک میں لے جاتی اور چھوڑ جاتی۔ وہ ڈیفنس کلب روڈ کے قریب ہی رہتی تھی۔ آنے جانے کا راستہ اس کا یہیں سے ہو کر جاتا تھا۔ دو بہنیں تھیں والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ ساری جائیداد کی مالک یہ دونوں ہی تھیں۔ نائلہ آزاد خیال ضرور تھی مگر حد سے آگے نہ بڑھتی تھی۔

بڑی بہن کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ اسلام آباد میں رہتی تھی۔ شارمن اسے بہت پسند آئی تھی۔ دونوں میں بہت گہری دوستی ہوگئی تھی۔

شارمن آزاد ماحول میں پلی بڑھی تھی۔ لیکن وہ طبعاً بہت خاموش و سنجیدہ تھی۔ امریکہ میں بھی وہ کسی لڑکے سے زیادہ گھلتی ملتی نہیں تھی۔ یہاں بھی بہت ریزرو رہتی۔ اگرچہ فرجام علی کے گھر کا ماحول بہت زیادہ دقیانوسی نہ تھا۔ یہاں کا ماحول اسے بہت پسند آیا تھا۔ وہ خود بھی دردانہ ثوبیہ جیسی بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ شارمن کو سوئمنگ کی عادت تھی۔ یہاں اس کے چانسز صفر بھی نہ تھے۔ جب اسے معلوم ہوا نائلہ جدون بھی سوئمنگ کرتی ہے تو اس نے اس سے کہہ کر مقامی کلب میں جانا شروع کر دیا۔ ہفتے میں ایک بار جاتی تھیں۔

آج دونوں بڑے دنوں بعد آئی تھیں۔ نمائش کی تیاری میں مصروف تھیں۔ بقول ان کے شاہکار تصویریں بنا کر آج فرصت ملی تھی۔ کافی لڑکیاں تھیں۔ لڑکے بھی نظر آ رہے تھے۔

شارمن نیلے رنگ کا کاسٹیوم میں بڑی مہارت سے تیر رہی تھی۔

"یار تم کمال کی سوئمنگ کرتی ہو۔" نائلہ نے اس کو داد دی۔ دونوں تھک کر سوئمنگ پول سے نکل کر ڈریسنگ روم کی جانب جا رہی تھیں۔ بڑے بڑے ٹاولز اپنے گرد لپیٹ لیے تھے۔

شارمن نے اپنی تعریف پر ہولے سے مسکرا کر تھینکس کہا۔ شارمن نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا تو اس کا دم ہی نکل گیا۔ فرجام علی کسی غیر ملکی کے ساتھ وہاں جانے کب سے کھڑے تھے۔ اسے گھور کر دیکھا تو وہ لڑکھڑا سی گئی اور نائلہ کی اوٹ میں ہوگئی۔ اس کے بازو کو پکڑ لیا۔

"کیا ہوا ڈیئر۔" نائلہ اپنے بھیگے بال ہوا میں ادھر ادھر لہرا کر بولی۔

"کچھ نہیں۔ چکر آ گیا تھا۔" وہ بات بنا کر بولی۔

"نظر لگ گئی۔ ہو بھی تو قیامت۔ پھر اتنی اچھی سوئمنگ کرتی ہو۔"

"واٹ نظر.....؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

"ارے ہمارے ہاں لگا کرتی ہے۔ تم کو نہیں خبر روز ممی میری نظر اتارتی ہیں۔"

اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔ شارمن کپڑے بدل کر بال سنوار کر واپس آ رہی تھی۔ نائلہ مسلسل بول رہی تھی۔ وہ نائلہ کی باتوں کا جواب دے رہی تھی مگر دل خوف سے دھڑک رہا تھا۔ گھر آتے ہی بیڈروم میں بند ہوگئی۔ ڈر کے مارے برا حال تھا۔

"کیا بولیں گے فرجیم۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

کھانے پر وہ ڈرتے ڈرتے گئی۔ کہ دیکھئے فرجام کیا کہتے ہیں۔

مگر انھوں نے حسب معمول کھانا کھایا۔ سب سے بات چیت کی۔ ہمیشہ کی طرح اسے نظر انداز کر دیا۔ اس سے کھانا بھی نہیں کھایا جا رہا تھا۔ چپکے چپکے ان پر گھبرائی ہوئی نگاہ ڈال لیتی۔ وہ اسے دیکھتے ہی بہت کم تھے۔ آج تو اس کے ہاتھوں پر بھی نظر نہ ڈالی جو بے ساختہ پڑ جایا کرتی تھی۔

آج تصویروں کی نمائش تھی۔ شارمن نے ثوبیہ اور دردانہ سے چلنے کو کہا تھا۔ مگر اتفاق سے ثوبیہ کو ٹمپریچر ہوگیا۔ دردانہ نے پہلے یہ عذر پیش کر دیا تھا۔ اگلے روز اس کا پیپر تھا۔

نائلہ جدون نے بھی لینے نہیں آنا تھا۔ اسے صبح کہیں جانا تھا کہہ رہی تھی وہیں سے آرٹ کونسل پہنچ جاؤں گی۔ پھر اکٹھے واپس آ جائیں گے۔

جب سے اس نے داخلہ لیا تھا ہمیشہ جینز وغیرہ میں گئی۔ آج فیروزی رنگ کا بڑا خوبصورت شلوار کرتا پہنا۔ تیار ہو کے دردانہ کے پاس آئی۔ بال بھی اس نے نئے اسٹائل سے سنوارے تھے۔ شانوں کے نیچے بڑی خوبصورتی سے ہلکورے لے رہے تھے۔ کپڑوں کا رنگ آنکھوں سے میل کھا رہا تھا۔ وہ غضب کی حسین نظر آ رہی تھی۔

آرٹ کونسل پہنچی تو مخصوص گیلری میں تصاویر لگی تھیں۔ سب ہی کے دل دھڑک رہے تھے جانے کس کی تصویر انعام کی مستحق ٹھہرتی ہے۔ اس کی آنکھیں نائلہ جدون کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

"آپ نے نائلہ کو دیکھا؟" اس نے جنید آفریدی سے پوچھا۔ اس نے اس کے سراپے پر نظر ڈال کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"آپ بور ہو رہی ہیں؟" اس نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

"ہاں بڑی سخت۔" وہ رک رک کر بولی۔

"آپ کی تصویر بہت خوبصورت ہے۔" جنید نے اس کی دمکتی آنکھوں میں جھانکا۔

"ارے نہیں۔" وہ چمکیلے بالوں کو گردن کی حسین جنبش سے ہلا کر ہنس دی۔

سفید سفید دانت عنابی لبوں سے جھانکنے لگے۔ تب ہی فرجام آتے نظر آئے۔ ان کے ہمراہ ملک شیرازی تھے۔ وہ ایک دم گڑبڑا سی گئی۔ یہ یہاں کیسے آ گئے۔ دونوں اس کی سمت آئے۔

"السلام علیکم۔" اس نے پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

''جیتی رہو۔'' ملک نے مسکرا کر بزرگانہ انداز سے جواب دیا۔ شارمن بھی مسکرا دی۔

شیرازی اسے دیکھتا رہ گیا۔ اسے شارمن بہت پسند تھی۔ اس کی خواہش تھی زندگی کی ساتھی بن جائے۔ ایک روز دبی دبی زبان سے فرجام سے کہا تھا۔

''پھپھو ارجمند رشتے داروں میں کریں گی۔'' انھوں نے اپنی طرف سے انکار کر دیا۔ شیرازی دل مسوس کر رہ گیا۔

''تم سے تو ارادہ نہیں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا مطلب؟''

انھیں اس کا سوال بہت ناگوار گزرا تھا۔

''کچھ نہیں یار۔'' شیرازی نے بات ختم کر دی۔

تب شارمن دونوں کا تعارف جنید آفریدی سے کروانے لگی۔ فرجام نے اچٹتی نظر اس پر ڈالی تھی۔ اتفاق سے شارمن انھیں ہی دیکھ رہی تھی۔ فوراً لب ہلکے سے دانتوں میں دبا کر نکالا اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔ ملک شیرازی سے ہلکی پھلکی باتیں ہونے لگیں۔ پھر مہمان خصوصی آ گئے۔ ہر تصویر کا تفصیلی اور تنقیدی جائزہ لے رہے تھے۔

تب پارٹی کا اہتمام ہوا۔ اس کے بعد چھوٹے سے فنکشن کا بھی انتظام تھا۔ نائلہ جدون نہیں آئی تھی۔ شارمن افشاں رحیم کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھی تھی۔ فنکشن شروع تھا۔ دلچسپ آئٹم تھے۔ موڈی بن رہی تھی۔ تصویریں کھنچ رہی تھیں۔

شارمن پریشان تھی کہ وہ واپس کیسے جائے گی۔ وہ اکیلے جانے کے تصور سے دہل رہی تھی۔ اپنے امریکہ سے واپس آنے کے بعد کے واقعے کو بھولی نہیں تھی۔ ڈرائیور کو آنے کو منع کر دیا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ نائلہ نہیں آئے گی۔

تب ہی اس کے کان ان کے پیچھے قطار میں بیٹھے لڑکوں کی باتوں پر لگ گئے۔

''فرجام علی کے ساتھ بڑے دنوں بعد ان کے دوست نظر آئے ہیں آج وہ نہیں آئی شہانہ قدیر۔'' بڑے چبھتے ہوئے انداز سے کہا گیا۔

''سنا ہے دونوں شادی کرنے والے ہیں۔'' دوسرے لڑکے نے کہا۔

شارمن کا دل مٹھی میں آ گیا۔

''بڑی بدنصیبی ہوگی۔ اس مشہور معزز خاندان کی میں نے سنا ہے شاہانہ قدیر شادی شدہ ہے۔ باہر چلی گئی تھی۔ تین سال بعد واپس آ گئی۔ اب دو سال سے دیکھ رہے ہیں یہیں پر ہے۔ پہلے کسی کسٹم کلکٹر کے ساتھ ہوتی تھی۔ اب چھ سات ماہ سے فرجام کے ساتھ نظر آتی ہے۔''

''نہیں یار تجھے کس نے بتایا وہ شادی شدہ ہے۔'' دوسرے نے بے یقینی سے کہا۔

''رؤف ڈھول نے۔''

''اوہ ہاں اچھا..... اسے ویسے تو سارے جہان کی خبر ہوتی ہے۔''

''پھر کیا ہوگا فرجام تو مارا گیا۔''

اسی وقت انعامات کا اعلان ہونے لگا۔

صائمہ اعوان کی تصویر اول قرار دے دی گئی۔ تالیوں کی گونج میں فلش لائٹ کے جھرمٹ میں اس نے پہلا انعام حاصل کیا۔ دوسرے تیسرے انعام کا اعلان ہوا۔ خصوصی انعام کی مستحق شارمن سلطان قرار پائی۔ مائیک پر اس کا نام پکارا گیا۔ وہ سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سن نہیں سکی۔

''شارمن سلطان۔'' دوبارہ نام پکارا گیا۔

''اونو۔'' اس پر بے یقینی کی کیفیت طاری ہوگئی۔

''اٹھو بھی۔'' افشاں رحیم نے اسے ٹہوکا

دیا۔

تب وہ بے پناہ گھبرا گئی۔ ٹانگیں لرز اٹھیں۔ جاتے ہوئے دو بار پیر مڑا۔ گرتے گرتے بچی۔ اس کی بوکھلاہٹ پر کئی لوگوں کی ہنسی نکل گئی۔

وہ ہمت کر کے ڈائس پر چڑھی۔ سانس پھول گئی تھی۔ مہمان خصوصی بھی مسکرا رہے تھے۔

''آپ کو امید نہیں تھی۔'' وہ ہنس کر بولے۔

''بالکل امید نہیں تھا۔'' وہ بوکھلائی بوکھلائی لڑکی کو سب دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ فرجام کے لب پھیلے پھر جامد ہو گئے۔

شارمن تقریباً دوڑتی ہوئی آئی۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اس نے طویل سانس لی۔ ادھر ادھر سے لڑکے لڑکیاں پلٹ پلٹ کر مبارکباد دے رہے تھے۔

''تھینک یو ویری مچ۔'' وہ مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

محفل برخاست ہوگئی۔ سب باہر نکلنے لگے۔ شارمن پریشان تھی۔

''کس کے ساتھ جاؤ گی؟'' بہت قریب سے آواز آئی۔

وہ چونکی۔ دل انوکھے انداز سے دھڑکا۔ فرجام پوچھ رہے تھے۔

حیرانی سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ بہت دلکش نظر آ رہی تھی۔ انعام جو مصوری کی قیمتی کتاب اور ایک چھوٹے سے چمکتے کپ پر مشتمل تھا۔ اس نے سینے سے لگا رکھا تھا۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ ہولے سے نفی میں گردن ہلا دی۔

''ڈرائیور کو کیوں نہیں بلایا۔'' انھوں نے غصے سے کہا۔ شارمن کا دل تڑپ گیا۔ بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر قدم آگے بڑھا دیا۔

''کوئی سواری نہیں ملے گی اس وقت۔ میرے ساتھ آؤ۔'' انھوں نے الجھے الجھے انداز میں کہا۔ اسے بہت شرمندگی ہو رہی تھی۔ دروازے سے لگ کر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ فرجام علی نے اس پر اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر کار اسٹارٹ کی۔ گاڑی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ فرجام علی مسلسل بول رہے تھے۔

''اس قسم کے فنکشن اٹینڈ کرنے ہوتے ہیں تو ڈرائیور کو بلایا کرو میری ذمہ داری نہیں ہے۔ ڈرائیور نہیں ہوں میں۔''

شارمن کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے۔ وہ اس وقت کو کوس رہی تھی جب یہاں آئی تھی۔ نہ آتی تو اچھا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ نائلہ جدون نہیں آئے گی۔ اور اسے ان کے ساتھ آنا پڑے گا۔

''کتنی دفعہ کلب جا چکی ہو سوئمنگ کرنے؟'' انھوں نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''پانچ دفعہ۔'' وہ گھبرائی گھبرائی بولی۔

''آپ کہیں تو نہیں جاؤں گی۔'' جانے کیسے ہمت کر کے کہا۔

''کیا مطلب؟'' انھوں نے ترچھی نگاہ اس پر ڈالی پول میں لگے مرکزی بلب کی روشنیوں میں اس کی آنکھوں میں مچلتے پانی کو دیکھا۔

''آپ نے مجھ سے کون سی امیدیں باندھ رکھی ہیں۔ مجھے کوئی غرض نہیں ہے جو مرضی ہو کرو۔'' وہ غصے سے بھر گئے۔ شارمن ڈر کے مارے کانپ گئی۔ مزید سبکی کے احساس نے اسے بے حال کر دیا۔ عادت کے مطابق جھکی۔ چہرہ گھٹنوں میں دبا لیا۔ چپکے چپکے آنسو بہانے لگی۔ کافی کلر کے گھنے چمکتے بال منتشر ہو گئے تھے۔

''اسٹون مین شہانہ قدیر سے۔ کتنے ہنس کر ملتے ہیں۔ وہ فراڈ ہے۔ جھوٹی ہے۔ مگر اس سے کتنی محبت کرتے ہیں وہ بہت لکی ہے۔''

گیٹ سے باہر گاڑی رکی تو شارمن چونک کر سیدھی ہوئی۔ اس نے ہتھیلیوں سے آنسو

پونچھے۔ اپنا انعام سمیٹا انھوں نے دیکھا اس کا کرتا آنسوؤں کے قطروں سے بھیگ رہا تھا۔

''تھینک یو ویری مچ۔'' وہ رندھی ہوئی آواز سے بولی۔ اور اتر کر اندر چلی گ ء۔ ی جب تک اندر نہ گئی وہ اسے دیکھتے رہے۔ پھر خیف سے شانے جھٹ کر گاڑی لے گئے۔

جوتوں کی ہیل کی آواز سن کر پڑھنے میں مصروف دردانہ جھٹ بیڈروم سے نکلی۔

''آ گئیں واہ انعام ملا ہے۔'' وہ خوشی سے بولی۔ شارمن منہ چھپاتی بیڈروم میں جا گھسی۔

''مبارک ہو بہت۔'' دردانہ قریب آئی۔ شارمن رو رہی تھی۔

''شاری کیا ہوا؟'' وہ گھبرا گئی۔

شارمن نے ساری باتیں' شہانہ قدیر کے بارے میں جو کچھ سنا تھا وہ بھی بتا دیا۔ دردانہ فکرمندی سے بولی۔

''فرجام بھائی کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ وہ ان کو بے وقوف بنا رہی ہے۔ میں انھیں بتاؤں یا یہ باتیں۔ وہ تو بہت جلد اس چڑل سے شادی کرنے والے ہیں۔ یہ تو انھیں برباد کر کے رکھ دے گ۔ ی''

''میرا نام نہیں لینا۔'' شارمن نے ڈر کر کہا۔

''میں بے وقوف نہیں ہوں تم فکر نہ کرو۔'' دردانہ نے محبت سے کہا۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

''چپ ہو جاؤ میری پیاری بہن۔'' اس نے شارمن کو گلے سے لگا لیا۔

''میں کیا کرے دانی؟'' وہ بے بسی سے بولی۔

''کروں۔'' اس نے جملہ ٹھیک کیا۔

''کروں۔'' شارمن نے سسکتے ہ ء ید ہرایا تو دردانہ کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''امریکہ میں مجھے سب بوائز پر اوڈی اسٹون گرل کہتے تھے۔ میری فرینڈز کہتی تھیں اس سے میرج کرنے والا کوئی لکی مین ہوگا۔ پر مجھے کوئی اچھا نہیں لگا۔ یہاں پر مسٹر ریجیم بہت اچھا لگا۔ بہت سویٹ۔ دانی بائی گاڈ ہم اس کے علاوہ کسی مین کو پسند نہیں کرتی۔ واپس چلی جائے گی وہاں پر ہم شادی نہیں کرے گی۔'' وہ رندھی ہوئی آواز میں بولتی چلی گئی۔

اس کے عزائم پر دردانہ کا دل دہل گیا۔ کس بے قراری سے رو رہی تھی۔

''تمھیں پرائز ملا ہے۔'' دردانہ نے اس کا ذہن دوسری طرف لگانا چاہا تا کہ یہ رونا تو بند کرے۔ اس کا انتہا سے زیادہ دکھی ہونا اسے پریشان کر گیا تھا۔

''خصوصی پرائم ملا ہے۔'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے پوری روداد سنا دی۔

''ہائے کتنا لطف آیا ہوگا۔ میرے امتحانوں نے گڑبڑ کر دی۔ ورنہ مجھے ضرور جانا تھا۔ صبح اخبار میں تصویر آئے گی۔''

''دانی مجھ کو نیند آ رہی ہے۔'' اس کی آنکھوں میں پھر آنسو جمع تھے۔

''جھوٹ مت بولو۔ تم روؤ گی۔''

''یس۔'' اس نے بڑی معصومیت سے اقرار کر لیا۔

''ایمان سے بہت ہی بھولی ہو۔ فرجام بھائی کی پروا نہ کیا کرو۔ ہم ایک بہت پیارا لڑکا ڈھونڈ لیں گے۔ اس کے ساتھ شادی کرنا۔ فرجام بھائی بہت خراب ہیں۔''

''ان کو کھراب مت بولو دانی پلیز۔'' اس نے احتجاج کیا۔ دردانہ کا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ اسے شب بخیر کہتی چلی گئی۔

اگلے روز واقعی اوروں کے ساتھ اخبار میں اس کی بھی تصویر تھی۔ سب نے مبارکباد دی۔

''چلو بھئی اس خوشی میں پکچر ہو جائے۔'' عدیل نے پروگرام بنایا۔

''نو.....'' اس نے انکار کر دیا۔

''پکچر میری طرف سے ہوگی۔ شرط یہ ہے کہ حمیرا ساتھ ہو۔'' عدیل نے کہا۔

''ہاؤ سویٹ ضرور میں ابھی فون کرتی۔'' شارمن جھٹ راضی ہو کر فون کرنے بھاگی۔

''شارمن بہت اچھی لڑکی ہے عدیل بھائی۔ ہم سب کو بہت پسند ہے۔ پھر ہماری رشتہ دار ہے۔ ایک بات بتاؤں فرجام بھائی کو بہت پسند کرتی ہے۔ ان سے شادی کی خواہشمند ہے۔'' دردانہ نے کہا۔

''مجھے بہت پہلے سے پتہ ہے یہ بہترین بیوی ثابت ہو سکتی ہے۔'' عدیل نے کہا۔

''وہ ہے ناچڑیل شہانہ قدیر بس وہ پسند ہے فرجام بھائی کو۔'' وہ کٹیلے لہجے میں بولی۔

''جس روز شوہر جوتے لگا کر لے جائے گا ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔'' عدیل نے جل کر کہا۔

''تو آپ کو بھی پتہ ہے۔'' دردانہ حیرت زدہ رہ گئی۔

''سب جانتے ہیں یہ کون سی چھپی ہوئی بات ہے۔''

''فرجام بھائی کو علم ہے؟''

''انھیں شاید ابھی علم نہیں۔''

''تو آپ کیوں نہیں بتاتے؟ وہ تو اس سے شادی کرنے والے ہیں۔'' دانی گھبرا کر بولی۔

''تو اسے شرم نہیں آتی شادی شدہ ہو کر وہ یہ حرکتیں کر رہی ہے۔''

''یہ بھی تو سننے میں آیا ہے طلاق لے چکی ہے۔'' عدیل نے کہا۔

یہ سن کر دردانہ کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔

''فرجام بھائی کو میں کم از کم ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ وہ تو اتنے بلند کریکٹر انسان ہیں پھر اس عورت کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟''

''یہ تو انہی سے معلوم ہوگا۔'' شارمن بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تو وہ چپ ہو گئی۔

''میں نے حمیرا کو راضی کر لیا۔'' وہ خوش ہو کر بتانے لگی۔ اس کے رخسار دمک رہے تھے۔ چہرہ لال ہو رہا تھا۔

دردانہ کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ وہ صرف شارمن کی خاطر مسکراتی ہوئی پکچر دیکھنے چلی گئی۔ جب یہ لوگ واپس آئے تو فرجام کسی مہمان کو رخصت کر رہے تھے۔ یہ بخاری صاحب بہت مشہور مصنف تھے۔

''یہ تو ہمارے مہمان خصوصی بنے تھے۔'' شارمن ان کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

بخاری صاحب اسے دیکھ کر مسکرائے۔ اس نے بھی سلام کیا۔ پرپل شلوار قمیض' جامنی کاسنی پھولوں والے دوپٹے کو گردن میں لٹکائے' بالوں کا جوڑا بنائے اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ اسے ناپسند کرنے والے فرجام بھی بار بار دیکھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

''اسی طرح محنت کرتی رہو گی تو ایک روز پہلا انعام حاصل کر لو گی۔'' وہ اس کا سر تھپک کر مسکراتے چلے گئے۔ انھیں رخصت کر کے فرجام اپنے بیڈروم میں چلے گئے۔ یہ سب ٹی وی لاؤنج میں آ گئے۔ شارمن نے سینڈل اتار کر کرسی پر بیٹھی۔ اسے اردو پکچر بہت پسند آئی تھی۔ اسی کے متعلق ثوبیہ اور عدیل سے باتیں کر رہی تھی۔

دردانہ اندر سے فرجام کے پاس سے ہو کر آئی تھی اس کا چہرہ بڑا بجھا بجھا سا تھا۔

''کیا ہوا دانی؟ خیریت تو ہے؟'' ثوبیہ نے استفسار کیا۔

''یہ جو آئے تھے ابھی۔ اپنے بیٹے کا رشتہ

شارمن سے کرنے آئے تھے اور امی جان پھپھو کی ہاں سے پہلے فرجام بھائی نے ہامی بھر لی۔" دردانہ نے بتایا۔

"واٹ.....؟" شارمن غصے اور حیرانی سے بولی۔ دونوں ہاتھ کرسی کی سائیڈوں پر رکھ کر اونچی ہوئی اور بغیر سینڈل پہنے بھاگنے کی رفتار سے سیڑھیوں پر چڑھنا شروع ہوگئی۔

"شارمن سنوتو۔" دانی پکاری۔

وہ رکی نہیں۔ جنونی انداز میں ہینڈل گھما کر فرجام علی کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ وہ کی چین اٹھا کر پلٹے تھے۔ کہیں جانے والے تھے۔ شارمن نے بگڑے ہوئے تیوروں سے انھیں گھورا۔

"کیا بات ہے؟" فرجام علی نے انگلش میں پوچھا۔

"مسٹر بخاری کے بیٹے سے میری شادی کی منظوری کیوں دی؟" وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔ اس وقت ان سے ڈر بھی نہیں لگ رہا تھا۔

"بیٹھو۔" انھوں نے کرسی کی سمت اشارہ کیا۔

"میں نہیں بیٹھوں گی۔" وہ تڑخ کر بولی

"نہ سہی۔" وہ خود کرسی پر بیٹھ گئے اور نرم لہجے میں سمجھانے والے انداز سے بولے۔

"تم ہماری ذمہ داری ہو اور اس گھر کا بڑا میں ہوں۔ ہر کام میری مرضی سے ہوتا ہے۔ بخاری صاحب کا بیٹا مقامی بینک میں وائس پریذیڈنٹ ہے۔ بہت اچھی پوسٹ ہے۔ جانے پہچانے شریف معزز لوگ ہیں۔ تم یہاں کے مسائل سے واقف نہیں۔ یہاں لڑکیوں کی شادیاں مسئلہ بنی ہوئی ہیں۔" انھوں نے اس کے غصے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے تحمل سے سمجھایا۔

"مجھے شادی نہیں کرنی اور میں آپ کی ذمہ داری نہیں ہوں۔" وہ بے رخی سے بولی۔

"اس گھر میں رہنے والا ہر فرد میری ذمہ داری ہے تم ٹھنڈے دل سے سوچنا۔ ابھی جلد ہی نہیں ہے۔ شادی چند ماہ بعد ہو جائے گی۔"

"نہیں میں نہیں کرتی۔ میں نہیں کروں گی۔" وہ چلا اٹھی۔ اس کا رنگ غصے اور صدمے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ کتنا ظالم پتھر تھا یہ شخص لگ رہا تھا۔ بے دردی سے اس کی چاہت ٹھکرا کر اپنی مرضی سے اس کی شادی کر رہا تھا۔

"میں کسی کی ذمہ داری نہیں۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ یو اسٹون مین۔" وہ دہاڑی۔

"آرام سے بات کرو۔" وہ تیزی سے بولے۔

"اتنی بدتمیزی سے اس سے کسی نے آج تک بات نہ کی تھی۔

"میں نے یہاں پر نہیں رہنا۔"

"پھر کہاں جاؤ گی؟"

"کدھر بھی آپ کو اس سے کہا۔" اس نے قطعی انداز سے کہا۔

"تمھاری جو سوچ ہے وہ ناممکن ہے۔ سمجھیں ویسے ہر انسان کو اپنی مرضی کا اختیار ہے۔ اگر تم نہیں چاہتیں تو بخاری صاحب کو منع کر دوں گا۔"

وہ شعلے اگلتی کھڑی اپنے حسن کی تابانیاں بکھیر رہی تھی۔ دوپٹہ شانے پر ایک طرف سے گر گیا تھا۔ لب کچل کر برستی آنکھوں کو آستین سے پونچھا۔ مڑی اور بھاگتی چلی گئی۔

فرجام علی کی چین کو انگلیوں پر گھماتے ہوئے گہری سوچ میں جا ڈوبے۔

رشتے کی بات دب گئی۔ بخاری صاحب کو منع کر دیا گیا گویا اس کی بات مان لی تھی۔

"رشتہ اچھا تھا۔ اپنے گھر کی ہو جاتی۔ لوگ بھی بہت اچھے تھے۔" پھپھو ارجمند امیر بانو سے بولیں۔

"مگر بچی خود نہیں چاہتی۔ کاش فرجام مان جائے تو میں اسے اپنی بہو بنانے پر فخر محسوس کروں۔

"جانے خدا کو کیا منظور ہے۔" ارجمند بولیں۔

"یہ رشتے زبردستی کے نہیں ہوا کرتے۔ دردانہ بتا رہی تھی شارمن خود فرجام کو پسند کرتی ہے اور ان سے شادی کی خواہشمند ہے۔ اس نے تو وہاں کے حساب سے بتا دیا کہ لڑکی لڑکا پسند کر کے ماں باپ کو بتا دیتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ رواج نہیں۔"

"ہاں آپا ثوبیہ نے مجھے بھی بتایا تھا۔ میرا تو خود دل چاہتا ہے کہ شارمن نگاہوں کے پاس رہے لیکن فرجام کی مرضی نہیں ہے۔ وہ شہانہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بارے میں بہت غلط باتیں مشہور ہیں۔ جانے قسمت میں کیا لکھا ہے۔"

دونوں کافی دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتی رہیں۔

دن روزمرہ کے معمول کے مطابق گزر رہے تھے۔ دردانہ پیپر دے کر فارغ تھی۔ وہ سیدھی شارمن کے بیڈروم میں چلی آئی۔ شارمن اپنی پینٹنگ کو آخری ٹچز دے رہی تھی۔

"یار تم سارا دن پینٹنگ کرتی تھکتی نہیں؟" دانی نے پوچھا۔

"آؤ دانی کھتم ہوگیا ایگزام؟" وہ بدستور اپنے کام میں مصروف رہی۔

"ہاں وقتی طور پر فارغ ہوں۔ کچھ دنوں بعد پڑھائی شروع ہو جائے گی دوبارہ۔ یہ کیا بنا رہی ہو۔" بے پناہ خوبصورت کسی مرد کا جسم تھا۔ لگتا تھا بڑی محنت سے بنایا گیا ہے مگر گردن اور چہرہ نہ بنایا تھا بلکہ بڑی مہارت سے گردن اور چہرے کی ساخت پتھروں جیسی بنائی تھی۔

"یہ ہے کون؟ کس کا پورٹریٹ ہے۔ پتھر تو ہٹاؤ گرن اور چہرے سے میرا مطلب اسٹون سے ہے۔"

"یہ پورا اسٹون مین ہے۔ کپڑوں کی وجہ سے معلوم نہیں ہو رہا۔" وہ درد سے مسکرائی۔

"اوہ۔" وہ چونک اٹھی۔ صاف سمجھ گئی کون ہو سکتا ہے۔ اس نے اکثر فرجام کو اسٹون مین کہتے سنا تھا۔ دردانہ نے قریب رکھی پنسل اٹھائی اور تصویر کے نیچے لکھ دیا۔

"پتھر ہیں سیاں۔"

"یہ کیا لکھا؟" شارمن حیرانی سے بولی۔

"وہی جو تم کہتی ہو۔ فرجام بھائی ہیں نا یہ؟"

"تم سمجھ گئی؟"

"کون نہیں سمجھے گا۔ تمھارا اظہار اتنا کھلا ہے کہ سب سمجھ جائیں گے۔" پھر اس نے اس عبارت کا مفہوم سمجھایا۔

"آل رائیٹ۔ بالکل ٹھیک۔" شارمن نے پلکوں میں جمع ہونے والے قطرے انگلیوں سے پونچھے۔

"رویا مت کرو شاری یہ بزدلی ہے۔" دردانہ نے سمجھایا۔

"پھر میں کیا کرے؟" وہ بے بسی سے بولی۔ دردانہ نے اس کا جملہ بھی صحیح نہ کیا۔

"چلو چھوڑو اس وقت ذرا ٹہل کر آتے ہیں لان میں۔" دانی نے اس کا دھیان بٹانے کے لیے کہا۔

"اوکے۔" شارمن نے رنگ برش ایک طرف رکھے۔ بکھرے بالوں کا جوڑا سا بنایا۔ باہر چلی آئی۔

"ثوبیہ بھی آ گئی۔ تینوں باتوں میں مصروف ہوگئیں۔

پڑوس میں مسز جلال رہتی تھیں وہ ایک دن شارمن کا رشتہ لینے آ پہنچیں۔ ان کا وہ بیٹا عالمگیر حال ہی میں امریکہ سے ایم۔ بی۔ اے کر کے آیا تھا۔ شارمن کو آتے جاتے دیکھا تھا۔ وہ اسے بہت پسند آئی۔ شارمن نے سنا تو جھنجلا اٹھی۔

''کیا مصیبت۔ ہم کو نہیں کرنی میرج۔'' وہ سختی سے بولی۔

''سنا ہے وہ تمھارے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے۔'' ثوبیہ ہنس کر بولی۔

''واٹ دی..... وانہ؟'' شارمن قطعی نہ سمجھی۔

''ویسا ہی جیسے تم پتھر ہیں سیاں کے پیچھے ہو۔'' دردانہ شوخی سے بولی۔

''اوہنہ..... دانی تم نے میرا جوک بنالیا۔'' وہ شرمندہ سی ہوگی۔

''نہیں سویٹ ایسی بات نہیں۔ مجھے تو تم خود اتنی پسند ہو کہ حد نہیں۔''

''مسز جلال کو کیا کہیں؟'' ثوبی نے پوچھا۔

''انکار۔'' شارمن قطعی لہجے میں بولی۔

''اس فنگر میں صرف فرجیم میرج رنگ ڈالے گا۔ بس۔'' وہ الٹے ہاتھ کی تیسری انگلی دکھا کر صاف گوئی سے بولی۔

دانی نے لب بھینچ لیے۔

''دانی ہم سب کو بتائی فرجیم ہم کو اچھا لگتا۔ شادی کروں گی یہ برا تو نہیں لگتا۔'' وہ اچانک پوچھنے لگی۔

''تمھیں نظرانداز کر دیا ہے ورنہ ہمارے گھرانوں میں لڑکیاں اپنے منہ سے نہیں کہتیں کہ میں نے فلاں لڑکے سے شادی کرنی ہے۔ بے شرمی، بے ہودگی سمجھی جاتی ہے۔''

''بے۔ شر۔ م۔ ی۔ بے۔ ہو۔ دگ۔ ی'' شارمن نے بہ مشکل یہ الفاظ کہے۔

تب دانی کو بے شرمی اور بے ہودگی کی تشریح کرنی پڑی۔

''یہ تو کھراب بات ہوئی۔ ہم کو سب برا کہتے ہوں گے نا۔'' وہ انتہائی پریشانی سے بولی۔

''جب ہی فرجیم ہم کو پسند نہیں کرتا۔'' اس نے خیال ظاہر کیا۔

''ہاں تم گھر سے باہر کسی کو نہیں بتانا کہ فرجام بھائی سے شادی کرنا چاہتی ہو۔'' دانی سمجھانے لگی۔

''بالکل نہیں سمجھی نہیں یہ کھراب بات کہنی ہے۔'' وہ ڈر کے بولی۔

''ارے بابا خراب کہا کرو۔ اور فرجیم نہیں فرجام۔'' دانی نے کہا۔

''اوکے۔ فر۔ جا۔ ام۔ ٹھیک؟''

''ٹھیک تو ہے مگر الف کو ایک ہی بار استعمال کرو۔''

''فرجا۔ ام۔'' وہ پھر بولی۔

''فرجا۔ م۔''

''اب یہ ہی دہراتی رہو۔'' دانی نے چھیڑا۔

مسز جلال مایوس لوٹ گئیں۔ شارمن کو پھپھو ارجمن نے سمجھایا تھا کہ وہ انکار نہ کرے۔

''نہیں پھپھو۔'' وہ ان سے لپٹ کر بے اختیار رو دی۔

''میں صرف آپ کے پاس آئی ہوں۔ آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی شادی نہیں کروں گی۔''

''اچھا..... اچھا رونا بند کرو۔'' ارجمند اس کے درد سے واقف تھیں۔

فرجام جانتے تھے مسز جلال اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آئی تھیں مگر شارمن نے انکار کر دیا۔ وہ یہ بات سن کر کچھ نہیں بولے تھے۔ جو وہ چاہتی تھی انھیں علم تھا۔ وہ جانے کیا چاہتے تھے۔

''شارمن کو پینٹنگ کی کلاس میں جانا تھا۔ نائلہ جدون نے کافی دیر لگا دی تھی۔ وہ بڑا سا

شولڈر بیگ لٹکائے انتظار میں ٹہل رہی تھی۔

امیر بانو نے باہر جھانکا تو اسے ٹہلتے ہوئے دیکھا۔

''اب تک نہیں گئیں بیٹی؟''

''نائلہ نے بہت دیر لگا دی ہے۔ میں اس کے گھر چلی جاؤں گھر بہت قریب ہے۔'' شارمن نے اجازت مانگی۔

''کچھ دیر انتظار کر لو۔'' امیر بانو نے اسے پیار سے دیکھا۔ کیسی چاندسی لڑکی ہے مگر فرجام۔

''بہت دیر ہوگئی ہے۔'' شارمن نے سنہری ڈائل والی گھڑی میں وقت دیکھا۔ فرجام گھر پر تھے۔ ان سے کہنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ دوسرے وہ کب لے جاتے۔

''جاؤ پھر راستہ تو ٹھیک سے آتا ہے۔ یا ٹھہر جاؤ میں فرجام سے کہتی ہوں۔''

''نہیں امی جان ان کو نہیں پتہ مجھے آتا ہے راستہ۔'' وہ کہتی ہوئی چلی گئی۔

براؤن پینٹ، آف روائٹ ہائی نیک ڈھیلے بازو، ڈھیلی قمیض، براؤن ایزی شوز، تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی۔ ترتیب سے سنورے بال بڑے دلکش طریقے سے ہلکورے لے رہے تھے۔ جیسے ہی گیٹ سے نکلی اتفاق سے اسی لمحے عالمگیر گاڑی میں بیٹھا کہیں جانے کو تیار تھا۔

''ارے آپ شارمن سلطان کہیں جا رہی ہیں؟ آیئے میں ڈراپ کر دوں۔'' وہ اپنی خوشی دباتے ہوئے گاڑی قریب لا کر دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

''نو تھینکس۔'' اس نے ہولے سے جواب دیا۔ شارمن نے عالمگیر کے رشتے سے کچھ دن پہلے انکار کیا تھا۔

''آیئے بھی پینٹنگ کی کلاس ہے۔ آرٹ کونسل جا رہی ہیں۔ میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں۔ کوئی عذر قبول نہ ہوگا۔''

''میں اپنی سہیلی کے گھر جا رہی ہوں۔ یہاں سے قریب ہی ہے۔ ہم دونوں ساتھ ہی پینٹنگ کی کلاس میں جاتی ہیں۔''

''آج میں چھوڑ آؤں گا۔ کیا حرج ہے۔''

''لفٹ لینا کوئی بری بات نہیں۔'' شارمن نے سوچا اوکے کہہ کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

یہ وہی لمحہ تھا جب کی چین اٹھائے فرجام اپنے بیڈروم سے نکلے تھے۔ کوریڈور عبور کرتے ہوئے ان کی نگاہ نیچے پڑی انھوں نے عالمگیر کی گاڑی میں شارمن کو بیٹھتے دیکھا۔ وہ زینہ قدموں تلے روندتے ہوئے اترتے چلے گئے۔

''کوئی کولڈ ڈرنک پسند کریں گی؟'' عالمگیر نے اس کے حسین چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے ہامی بھر لی۔ وہ کولڈ کارنر کے قریب کوک کی سپ لے رہی تھی۔

اسے پتہ بھی نہ چلا کہ گرین مرسیڈیز برابر سے گزری ہے۔ اس میں بیٹھے شخص نے بڑی چبھتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ عالمگیر بے پناہ خوش تھا۔ وہ اپنے جذبات کے اظہار کے لیے بے چین تھا۔

''میری مما آئی تھیں۔ آپ نے انکار کیوں کر دیا؟ میں آپ کو بہت پسند کرتا ہوں۔'' شارمن نے اسٹرا لبوں سے نکالا۔

''مجھے شادی نہیں کرنی۔'' اس نے آہستہ سے کہہ کر اسٹرا کا سرا موڑ دیا۔ گویا مزید کوک نہیں پینا تھا۔ جب کہ ابھی آدھی بوتل باقی تھی۔

''کیوں؟ کوئی اور پسند ہے۔''

فرجام کا نام شارمن کے ہونٹوں سے نکلتے نکلتے رہ گیا۔

''ہمارے گھرانوں کی لڑکیاں اپنے منہ سے نہیں کہتیں۔'' اسے دانی کا جملہ یاد آ گیا۔

''نہیں کوئی بھی نہیں۔'' اسے اپنی آواز خود ہی جھوٹی لگی۔

''پھر مجھ میں کیا کمی ہے۔ میں آپ کو ہمیشہ خوش رکھوں گا ہر آسائش قدموں تلے ڈھیر کر دوں گا۔ ہم سال میں ایک بار امریکہ کا ٹرپ بھی لگائیں گے۔ آپ اپنی امی، بہن بھائیوں سے مل لیجیے گا۔''

''اگر یہی باتیں کرنی ہیں تو میں آپ کے ساتھ نہیں جاتی ٹیکسی لے لوں گی۔ میں اپنی مرضی کی خود مالک ہوں۔'' وہ سختی سے بولی۔

عالمگیر پھر کچھ نہ بولا۔ پھر وہ سارے راستے خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ اسے اس کی منزل پر اتارا اور وہ تھینکس کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ عالمگیر ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

آج پھر نائلہ جدون نہیں آئی تھی۔ اس کی آج کل بات چیت طے ہو رہی تھی۔ اس کا آرٹ کوئسل جانا گول ہو جاتا۔ شارمن نے گھر فون کر کے ٹائم بتا دیا کہ ڈرائیور کو اس وقت بھیج دیں۔

کلاس سے فراغت پا کر تھکی تھکی سی باہر نکلی تو آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ فرجام گاڑی میں بیٹھے تھے۔ اخبار ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ مگر آہٹ پر اسے دیکھا تو اخبار رکھ دیا۔

شاید کسی کام سے آئے ہوں۔ شارمن نے سوچا اور ادھر ادھر گردن گھما کر گھریلو استعمال کی کرولا تلاش کرنے لگی۔ فرجام نے گاڑی اس کے قریب لا کر روک دی۔ اتنے قریب کہ وہ ڈر سے اچھل پڑی۔

''میں تمھیں لینے آیا ہوں۔ گردن اچکا اچکا کر کسے ڈھونڈ رہی ہو؟'' وہ ڈپٹ کر انگریزی میں بولے۔ اس سے وہ بات ہمیشہ اسی زبان میں کیا کرتے تھے۔

شارمن ڈر کے مارے تیزی سے آ کر بیٹھی۔ اس کا بیگ ان کے کاندھے بازو سے ٹکرایا۔

''سوری..... ویری سوری۔'' اس نے گھبرا کر بیگ قدموں کے پاس رکھا۔

شارمن نے نروس ہو کر ان پر نگاہ ڈالی۔ یہ مجھے لینے کیسے آ گئے۔ اس روز کہا تھا میں ڈرائیور نہیں۔ فرجام ونڈ اسکرین پر نگاہیں جمائے گاڑی چلا رہے تھے۔

''تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر انگلش میں بولے۔

''مجھ کو اردو آتی ہے۔'' وہ جواب میں بولی۔

''میں نے کیا پوچھا ہے؟'' انھوں نے اس کی بات نظر انداز کر کے پھر انگریزی میں کہا۔

''بہت سوچا ہے۔'' وہ ہولے سے بولی۔

''وہی تو پوچھا ہے کیا.....؟''

''میں کسی کو نہیں بتاتی۔''

''کسی سے کیا مطلب؟ میں پوچھ رہا ہوں..... میں۔'' انھوں نے میں پر زور دے کر تفاخر سے کہا۔

''کیا یہ بات پھر بتاؤں کہ گھر کا ہر فرد میری ذمہ داری ہے۔'' وہ اسٹیئرنگ پر ہاتھ مار کر برہمی سے بولے۔

شارمن ان کے لہجے سے دہل کر پرے کو کھسک گئی۔ اتنی کہ دروازے سے چپک گئی۔

''دروازے میں لاک لگایا ہے؟'' انھوں نے اس کی طرف بغیر دیکھے ہوئے پوچھا۔

اس نے لاک لگایا۔ اس کا ہاتھ بری طرح سے کانپ رہا تھا۔ یہ اتنا کیوں ڈانٹتا ہے۔ میں اسے کس طرح اچھی لگ سکتی ہوں۔ اس نے گردن جھکائے ہوئے سوچا۔

''میری بات سنی نہیں؟'' انھوں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

''عالمگیر ایک اچھا لڑکا ہے۔''

''مجھے نہیں شادی کرنی۔'' وہ گردن جھٹک کر یوں ہی سر جھکائے ہوئے بولی۔

''اس کے ساتھ تفریح کرنے جانا پسند ہے۔ سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر کولڈ ڈرنک پینا پسند ہے؟'' وہ گرج کر بولے۔

شارمن نے سہمی ہوئی نگاہ ان پر ڈالی۔ ان کی پیشانی پر غصے سے بل پڑے گئے تھے۔

''بتاؤ۔'' انھوں نے اسی لہجے میں پوچھا۔

''وہ..... لفٹ۔'' شارمن ہکلا کر رہ گئی۔

''تمھیں پتہ نہیں ہم کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے گھر کی لڑکیاں یہ حرکتیں نہیں کرتیں۔ آیندہ میں آپ کو کسی کے ساتھ نہ دیکھوں۔'' شارمن کے جی میں آیا پوچھے۔

''خود تو دوسری لڑکیوں کے ساتھ ہر جگہ جاتے ہیں۔'' مگر ہمت کہاں تھی سوال کرنے کی۔

''تم نے کیا کرنا ہے؟'' وہ دوبارہ اسی موضوع پر آ گئے۔

''میں نن بنوں گی۔ واپس امریکہ چلی جاؤں گی۔'' وہ رندھی ہوئی آواز سے بولی۔

''نن.....'' انھوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

کافی کلر کے گھنے بالوں میں اس کا حسین مکھڑا کتنا اداس لگ رہا تھا۔ پلکوں کی گھنی چھاؤں بھیگنے کو تھی۔ ایک ہاتھ لبوں کے قریب تھا۔ وہ اپنے لبوں کو کاٹ رہی تھی۔

''اپنے بارے میں پتہ ہے کہ کون ہو؟ کیا ہو؟ میں دوبارہ بتاؤں مسلمان ہو تم۔ نن نہیں بن سکتیں۔''

''مجھ کو پتہ ہے پر میں وہ کروں گی جو میرا دل چاہتا ہے۔'' وہ چبا چبا کر بمشکل بولی۔

''تم نن نہیں بن سکتیں۔ سمجھیں ہمارے مذہب میں یہ نہیں ہے۔''

''میں جانتی ہوں آپ کو نہیں پسند مگر میں کیا کرے مجھ کو آپ بہت پسند۔ تو ہم نہیں کر سکتی شادی۔ میں نن.....''

''نہیں بنو گی۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر غرائے۔

''مجھے اپنی مرضی کرنی ہے۔'' وہ ہٹیلے انداز سے بولی۔

''میں یہاں سے جلدی چلی جائے گی۔ نہیں تو..... نہیں تو۔'' وہ کہتے کہتے رو پڑی۔

''ایسا نہیں کرنا ہے۔ خبردار۔'' اچانک بالکل اچانک گاڑی دوسری سڑک پر ڈالی۔ جب کہ دیکھ رہے تھے بس تیزی سے چلی آ رہی ہے۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر خطرناک طریقے سے موڑی کہ گاڑی الٹتے الٹتے بچی۔ شارمن کے حلق سے خوفناک چیخ نکلی۔ وہ ان پر جا پڑی۔ شارمن مضبوطی سے ان کا بازو تھام کر دہشت سے رو پڑی۔ بس تیزی سے گزری۔

''فرجا..... ام..... آپ ٹھیک۔'' وہ بے قرار ہو کر پوچھنے لگی۔ فرجام نے گاڑی روک لی تھی۔ وہ خود بھی کافی کنفیوز ہو گئے تھے۔

انھوں نے چہرے پر ہاتھ ملے۔ آنکھوں کو دبایا۔ پھر اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے۔

وہ کتنی بے قرار لگ رہی تھی۔

''پلیز بولیں کچھ۔'' انھیں گم صم دیکھ کر وہ رقت سے بولی۔

انھوں نے روتی ہوئی دہشت زدہ شارمن کو دیکھا۔ وہ کتنی مضطرب اور بے قرار نظر آ رہی تھی۔ چاہت اور الوہی جذبہ اس کے ہر فعل سے ظاہر ہو رہا تھا۔ کیسا تھا وہ لمحہ، کیسی تھی وہ گھڑی۔

تب وہ بے بس ہو گئے۔ سب کچھ ہار گئے۔ انھوں نے اس کی سمت رخ کیا۔

بھیگے نینوں سے برسات ہو رہی تھی۔ وہ رو رہی تھی۔ انھوں نے بے ساختہ اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ رونا بند کرو۔'' انھوں نے نرمی سے کہا۔

وہ اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ کبھی کبھی آستینوں سے پونچھ لیتی۔ فرجام کو وہ وقت یاد آ گیا جب پہلی باریوں ہی آنسو پونچھ رہی تھی۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کے حواس درست ہو چکے تھے۔

شارمن آنسو صاف کر کے ٹھیک ہو کر بیٹھی۔ وہ منتظر تھی کہ فرجام علی گاڑی چلائیں۔ کیسی خاموشی سے چھائی ہوئی تھی۔ پاس سے اکا دکا گاڑی گزرنے کی آواز بھی یہ خاموشی توڑنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

اس نے ذرا سی گردن اونچی کی۔ اپنی طرف دیکھتے فرجام کو انتہائی حیرت سے دیکھا۔ اور گڑبڑا سی گئی۔ نروس ہو کر انگلیاں دانتوں سے ہولے ہولے چبانے لگی۔

ان کی نظروں میں کیا ہے؟ کس طرح دیکھ رہے ہیں مجھ کو۔ وہ ان کی نگاہوں کے زاویوں سے الجھ رہی تھی۔ بے ترتیب دھڑکنوں کو سنبھالنا مشکل لگ رہا تھا۔ تب اس نے ہمت کر کے تہہ کیا ہوا اخبار اٹھا لیا اسے اپنے سامنے کیا۔ کئی لمبے لمبے سانس لیے۔

''یہ..... یہ..... مسٹر فر۔ جا۔ م۔ کو پتہ نہیں کیا ہو گیا'' فرجام نے اسے مزید سوچنے سمجھنے کی مہلت نہیں۔ انھوں نے جھپٹ کر اخبار اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔

شارمن کا رنگ پہلے فق ہوا پھر حیرت انگیز طور پر سرخ ہو گیا۔

''تم نے مجھے جیت لیا شارمن۔'' انھوں نے ہولے سے کہا۔ شارمن کا دماغ ایک دم پھر گیا۔ یقین کی گنجائش ہی نہ تھی۔

''جھوٹ ہے..... جھوٹ بولتے ہیں آپ..... شہانہ قدیر..... آپ کو اچھی لگتی ہے۔''

وہ ٹک اٹک کر بولی۔

فرجام متبسم نظروں سے اسے دیکھ کر بولے۔

''میں کوشش کے باوجود اس سے شادی کی ہامی نہ بھر سکا جب کہ اس نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی تھی۔

''گویا ان کو بھی پتہ تھا کہ وہ شادی شدہ ہے۔'' شارمن سوچ رہی تھی وہ کہہ رہے تھے۔

''تم میرا آئیڈیل نہیں تھیں۔'' انھوں نے صاف گوئی سے کہا۔

شارمن پہلو بدل کر رہ گئی۔ پھر یہ مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ اس کو غصہ آ گیا۔ فرجام نے اس کے بدلتے ہوئے تیور دیکھے تو مسکرا دیئے۔

''شہانہ قدیر مجھے پسند تھی۔ میں جانتا تھا اچھی بیویوں والے کوئی اوصاف اس میں نہیں تھے۔ اسے صرف پیسے سے دلچسپی ہے۔ اس پر کیا اس قسم کی کسی عورت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی عورتیں کسی بھی وقت بڑے آرام سے طلاق لے کر نئی اسامی کو تلاش کر لیتی ہیں۔ تب بھی اسی کے سحر نے مجھے مسخر کر رکھا تھا۔ تمھارے آنے کے بعد یہ جمود ٹوٹا۔ تم نے مجھے اپ سٹ کر کے رکھ دیا۔ پھر بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا تم مجھے چاہنے لگی ہو۔'' وہ ہولے سے مسکرائے شارمن شرمندہ سی ہو گئی۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔

''میں نے کبھی اس قسم کی لڑکی سے شادی کے متعلق سوچا نہ تھا جیسی تم ہو۔ تم میرے لیے چیلنج بن گئی تھیں۔ میں کوشش کے باوجود تمھیں اپنے ذہن سے نہ نکال پایا۔ اسی وجہ سے تم سے کتراتا بچتا۔ زیادہ سے زیادہ شہانہ قدیر کے ساتھ وقت گزارتا۔ تب مجھ پر ایک بے چینی سی طاری ہو جاتی تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ میرے گھر والوں کو وہ لڑکی بالکل پسند نہیں

تھی۔ وہ دانی کو بہت بری لگتی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں تمھارے لیے اقرار کر لوں۔ میں تمھیں ہی بھڑک اٹھا۔ اس میں میری شکست تھی۔ کئی لوگوں نے میرے ذریعے سے تمھارا رشتہ مانگا۔'' فرجام نے بتایا۔

''لیکن تب میں نے انکار کر دیا۔ میرے دل میں چور تھا۔ میں نے ان سے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ تمھارے رشتہ داروں میں تمھاری شادی ہو رہی ہے۔ مجھے ایک گونہ سکون تھا۔ تسلی تھی تم صرف مجھے پسند کرتی ہو۔ میرے علاوہ کسی سے بھی شادی نہیں کر سکتیں۔ تمھارے رشتے کے متعلق تمھارا شدید ردعمل بھی دیکھ لیا۔'' اس کا سر اور جھک گیا تھا۔

''تمھارے ان ہاتھوں نے میرے اردگرد کچھ ایسا حصار کھینچا تھا کہ میں ان کے شکنجے میں خود کو جکڑتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی تمھیں دیکھنے پر مجبور ہو جایا کرتا تھا۔'' انھوں نے اس کے خوبصورت ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ شارمن کے چہرے پر کئی رنگ لہرا گئے۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔ ان سے نظر ملانے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ خوشی تن بدن میں ہلکورے لے رہی تھی۔

وہ کہہ رہے تھے۔ ''آج تمھیں عالمگیر کے ساتھ جاتا دیکھ کر بہت غصہ آیا تھا۔ اس پر میں نے تم دونوں کو کوک پیتے دیکھا تو بھنا اٹھا۔ آفس جاتے ہی لوٹ آیا۔ تمھارا فون آیا تب میں ہی قریب تھا۔ ڈرائیور کے بجائے خود آ گیا۔ تمھاری رہنمائی بجا تھی۔ شاید ابھی میں جانے کتنے دن تک نہ کھلتا۔ لیکن ابھی جب گاڑی الٹتے الٹتے بچی تو تم بے قرار ہو گئیں۔ تمھاری بے قراری نے میرا ورق ورق کھول دیا۔ اب کیا چاہتی ہو؟'' انھوں نے اپنی ہر بات بتا کر اس کی طرف جھک کر دیکھا۔

''پپ..... پتہ نہیں۔'' وہ لبوں کو کچل کر مدھم سروں میں بولی۔

''دلہن بنو گی میری؟ جو سب چاہتے ہیں تم بھی چاہتی ہو اور اب میں بھی پورے ایمان پورے یقین سے کہہ رہا ہوں۔''

''اوہ..... مسٹر فر۔ جا۔ ام۔'' وہ بے پناہ جھینپ کر بولی۔

''اب بھی مسٹر لگاؤ گی۔ ڈھنگ سے میرا نام لینا سیکھو۔'' وہ اس کے انداز سے لطف لیتے ہوئے پہلی بار اس سے اردو میں بولے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ شرم، گھبراہٹ، خوشی نے یکدم غلبہ کر دیا تھا۔ آنسو لپک لپک کر اس کی خوشی میں شرکت کرنے امڈے چلے آ رہے تھے۔ وہ اس کی کیفیت سے بے خبر نہیں تھے۔ اسے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

''یہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ میری بے توجہی سے بکھر رہی تھی۔ انشاء اللہ بہت جلد اپنی دلہن بناؤں گا۔ ہمارا جوڑا ایک مثالی جوڑا ہو گا۔''

شارمن اس پورٹریٹ کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اس نے فرجام علی کا بنایا تھا۔ اسے کھد بد ہو رہی تھی۔ جاتے ہی سب سے پہلے وہ پورٹریٹ پھاڑ دوں گی جس پر دانی نے پتھر میں سیاں لکھا تھا۔ فرجام کو خبر ہوئی تو بہت بری بات ہو گی۔

''نن بنو گی؟'' اس نے سر اٹھایا۔ وہ اس کے غضب ڈھاتے نینوں میں جھانکتے پوچھ رہے تھے۔ تو شارمن نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے پھر جھکا لیا۔ فرجام نے مسکراتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی

☆☆☆

عشق کے روگ ہزار سائیں

سیما بنت عام

تیرویں قسط کا خلاصہ

ماہا ماڈل اور مسز صفوان حیات کی بھانجی ہے جسے اپنی بہو بنا کر بیگم حیات اس کی تمام جائیداد پر قابض ہونا چاہتی ہیں۔ ماہا کی بے راہ روی سے بیگم حیات کے دونوں بیٹے اعظم حیات اور معظم حیات برگشتہ ہیں' زرش نے دادی جان اور دیگر گھر والوں کی عزت نفس اور خودداری کا درس دیا۔ دوسروں پر انحصار کرنے کی بھی ضرورت کی' وہ سارم کو ناپسند کرتی لیکن اس کی جا و بے جا عنایات اس کے لیے بار ہیں۔ گھر والوں سے چھپ کر وہ ایک جاب کے لیے اپلائی کر دیتی ہے' رامین بدماغ ہے وہ بات بے بات شاہ عا ہے کان بھر کر گھر والوں کے خلاف اکساتی رہتی ہے۔ شاہ عاصم معمولی سی بات کو جواز بنا کر دادی جان سے بدتمیزی کرتا ہے' انھیں ظالم حکمران اور غاصب قرار دیتا ہے۔ دادی جان کو اس کے لفظوں سے بہت ٹھیس پہنچتی ہے بالآخر وہ زرش کو جاب کی اجازت دیتی ہیں۔

اب آپ آگے پڑھیے

تیرویں قسط

ماما!..... چائے۔'' نازش نے ڈائننگ ٹیبل پر بیگم حیات کے سامنے چائے کا کپ رکھا مگر وہ بے اعتنائی سے بنا کچھ کہے سلائیس پر جام لگاتی رہیں۔ اگلے ہی لمحے آفس کے لیے تیار فریش چہرے کے ہمراہ اعظم وارد ہوئے تھے۔

''ہیلو ایوری باڈی..... اور ماما کیسی ہیں آپ؟'' انھوں نے چہک کر ایک خاص الخاص نظر سادہ سی نازش پر ڈال کر ان کا حال دریافت کیا تھا۔ مگر وہ خاص الخاص نظر بیگم حیات کے تن بدن میں انگارے جھلسا گئی۔

''صد شکر تمھیں ماں کا خیال آیا تو سہی۔ فرصت مل گئی؟'' لطیف سے طنز کے ساتھ انھوں نے چائے کپ میں انڈیلنی شروع کی تھی۔

''اوہ نو..... ماما..... دس از ناٹ فیئر۔'' انھوں نے غالباً بیگم حیات کو کچھ جتانا چاہا تھا مگر وہ بات کاٹ گئیں۔

''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں صرف اردو ہی استعمال کرنی چاہیے' یونو دوسروں کو الجھن سے بچانے کے لیے۔'' انھوں نے صاف سیدھا نازش کی کم علمی پر طنز کرنا چاہا تھا' مگر اعظم کی نظروں میں تنبیہہ اُبھر آئی۔ نازش سرعت سے مڑی تھی اور کچن میں جا گھسی۔

''اگر تعلیم ہمیں دوسروں کو بلاوجہ ڈی ریڈ کرنے کا ہی درس دیتی ہے تو ماما غیر تعلیم یافتہ ہم سے لاکھ درجہ زائد بہتر ہیں۔''

''بالکل مگر تمھیں بیوی کے مقابلے میں ماں کو ڈی گریڈ کرنے کا حق کس نے دیا ہے؟''

''ماما اس سارے قصے کی اصل قصوروار نازش تو نہیں ہے۔''

''ہنڈرڈ پرسنٹ اعظم اس سارے قصے کی اصل قصوروار نازش ہی ہے۔''

''ماما اب یہ بحث لاحاصل ہے آخر آپ اب کیا چاہتی ہیں؟'' اعظم کا موڈ آف ہو گیا۔ وہ ایسی ہی تھیں۔ ضدی ہٹیلی' نہ جانے کیوں نازش کو سامنے پا کر انھیں اپنا بلڈ پریشر ہائی ہوتا محسوس ہوتا۔ وہ انھیں ماما کہتی تو پھر تو آگ ہی لگ جایا کرتی۔ وہ ہار کر بھی اپنی ہار نہ تسلیم کر پائی تھیں۔ اپنی اسی ضدی ہٹیلی فطرت کے سبب ہر طور اپنی ہار کو جیت میں تبدیل کر لینا چاہتی تھیں۔

نازش پھر آ گئی اور خاموشی سے اعظم کے برابر والی سیٹ سنبھال کر بیٹھ گئی۔ اعظم نے بطور خاص اس کے چہرے کا جائزہ لیا تھا جہاں اداسی کی واضح رمق تھی۔

''دوپہر کو کھانے کے ہمراہ لنچ باکس تیار کر دینا' تھرماس میں چائے بھر دینا' شاید مجھے آج رات ہسپتال ہی میں رکنا پڑے۔'' وہ نازش سے مخاطب تھیں مگر اس کی جانب دیکھنے سے قصداً گریز کر رہی تھیں۔ نازش نے اثبات میں سر ہلایا تھا مگر اعظم چونک اٹھے۔

''ہسپتال میں خیریت ماما؟'' ان کے پرتشویش لہجے نے بیگم حیات کو ادراک بخشا کہ وہ روانی میں کیسا سنگین انکشاف کر گئی ہیں۔ مگر سیکنڈ کا ہزارواں حصہ صرف ہوا تھا انھیں اپنے آپ کو سنبھالنے میں' بات زبان سے نکل چکی تھی۔ اب اس کا بدلنا ناممکن تھا مگر اس ضمن میں مزید جھوٹ گھڑنا صورتحال کو مشکوک بنا جاتا۔ ان کے شاطر ذہن نے فی الفور بات بنائی تھی۔

''ماہا ایڈمٹ ہے ویک نیس بڑھ گئی تھی۔ اس لیے دو چار روز کے اسپیشل ٹریٹمنٹ کے لیے ایڈمٹ کروایا ہے۔

''تمھیں فرصت ہی کہاں ہے گھر یا گھر کے معاملات کی خبر لینے کی اس لیے میں نے خاص طور پر تمھیں انفارم کرنا ضروری بھی نہ سمجھا۔''

''ماما آپ جانتی ہیں ماہا میرا ہیڈیک کبھی نہیں رہی۔'' انھوں نے نازش کے سامنے اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کو قصداً بے التفاتی کا مظاہرہ کیا تھا۔

''سلائس نازش کے حلق میں اٹکنے لگا تو اس نے بڑا سا چائے کا گھونٹ لیا۔

''اور وہ تمھارے انسانیت و مساوات کے درس' ہمدردی کا بخار' کیا ماہا اس سے مستثنیٰ ہے؟''

''ماما آپ کو اگر پیسے درکار ہیں تو میں چیک کاٹ کر دینے کو تیار ہوں۔''

''ماہا پیسے کی محتاج نہیں اور یہ بات تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔''

''آپ کو یکسر پیٹتے رہنے میں کیا خاص لطف محسوس ہوتا ہے ماما؟'' وہ جھلا ہی تو اٹھے جبکہ بیگم حیات کے لہجے میں سرزنش اُمڈ آئی۔

''اعظم مجھے لگتا ہے تم ماں کو مخاطب کرنے کی تہذیب بھولتے جا رہے ہو۔'' یہ ڈائریکٹ وار تھا۔ نازش بے قصور ہوتے ہوئے بھی چور سی بن گئی۔ ناشتہ ادھورا چھوڑ کر برتن سمیٹنے کے بہانے اٹھ کھڑی ہوئی اور ادھر ادھر ہاتھ مار کر چند برتن اٹھا کر رفو چکر ہو گئی۔

''تو ماما' ماہا کے سلسلے میں آپ اس سے زیادہ امید مجھ سے نہیں رکھیے گا۔'' وہ قطعیت سے کہہ کر کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ بیگم حیات نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر چائے کا کپ لبوں سے لگا لیا تاہم ان کی کرچی آنکھیں کسی گہری سوچ کی غماز تھیں۔

☆☆☆

''اور کیا کہہ رہی تھی میری بچی۔'' دادی جان نے بے تابی سے دریافت کیا۔

''اور دادی جان آپ کو بہت سلام کہہ رہی تھیں۔'' سحر کی نصابی کتاب کے ورق الٹ رہی تھی۔

''جیتی رہے..... جیتی رہے' اللہ خوش رکھے معظم بچے کو' تجھے ملانے لے گیا ورنہ ہم کہاں گھر کھوجتے پھرتے حسنہ تو بیٹا بیاہ کر ایسی پھریں جیسے کعبے سے کافر۔ دو گھڑی کو معظم آ جاتا ہے تو بچی کی خیریت بھی نصیب ہو جاتی ہے ورنہ حسنہ نے تو مڑ کر خبر لی نہ جھوٹے منہ کبھی گھر آنے کی دعوت دی۔ اب ہم بیٹی والے ہو کر کیا منہ اٹھا کر جاتے بھلے لگیں گے۔'' وہ تسبیح گھماتے ہوئے افسردہ سے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

''حسنہ آنٹی کا تو مزاج پوچھیں ہی ناں۔ میری صورت دیکھتے ہی سر میں درد شروع ہو گیا تھا ان کے۔ سلام کا جواب بھی یوں دیا جیسے لٹھ کھینچ مارا ہو۔'' سحر کی معصومیت کہ وہ بات بنانے کے فن سے ناواقف تھی اور ایسے لوگ انجانے ہی میں دلآزاری کا ارتکاب بھی کر ہی جاتے ہیں۔ دادی جان کے دل کو بھی ٹھیس لگی۔

''اللہ ہی سمجھے حسن آراء کو زبان کی تیز تو ہمیشہ ہی سے ہیں۔ بولتے ہوئے سوچنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں۔'' جانے اپنے ملنے ملانے والوں کے لیے زبان میں مٹھاس کہاں سے بھر لاتی ہیں۔ کبھی دیکھیں تو پہچانیں بھی نہیں۔ بڑھ بڑھ کر ہر کسی سے گلے ملیں گی تہذیب کے مظاہر سے۔'' سحر کے بھولپن نے فٹ سے دادی جان کی بات رد کی تھی۔ وہ خاموش سی ہو کر رہ گئیں۔

''اے ہاں جب کار کی ضرورت حسن آراء کو تھی تو تجھے کیسے واپس چھوڑ کر گیا معظم؟''

''دادی دان اپنی بائیک پر اور کس پر اور ایسی ہوا کے گھوڑے پر دوڑائی کہ سچ میری تو آدھی جان ہی نکال کر رکھ دی۔ لاکھ چیخیں ماری میں نے' مگر میں جتنی خوفزدہ تھی اسے بائیک دوڑانے میں اتنا ہی مزہ آرہا تھا۔ کان پکڑ لیے میں نے جواب بھی اس کے ہمراہ بائیک پر سوار ہوں۔''

''اے تو بچی حسن آراء کے لوٹنے کا ہی انتظار کر لیا ہوتا۔ رکشہ ٹیکسی سب فنا ہو گئے تھے کیا۔'' حسب عادت دادی جان ہول اٹھیں۔

''مجھ سے غلطی ہوگئی نازش آپا روک تو رہی تھیں مگر مجھے لگا جیسے چاہتی ہیں کہ میں زیادہ دیر نہ رکوں۔ اس لیے میں نے جلدی جلدی کی رٹ لگا دی تھی۔''

''سمجھدار بچی ہے میری چاہتی ہوگی کہ حسنہ کے رویے سے تمھاری زیادہ دلآزاری نہ ہو شاید اسی لیے۔'' دادی جان کی توجیح معقول و دل کو لگنے والی تھی۔

''مگر خیر جب رب نے حسنہ کو لوٹایا ہے تو انشاء اللہ راہ راست پر بھی ضرور لائے گا۔ اللہ حسنہ کو نیک ہدایت دے۔ ہیرا آدمی تھے رضوان حیات۔ آج اگر زندہ ہوتے تو حالات بہت مختلف ہوتے مگر اب جو کرنا ہے بہتر ہی کرنا ہے۔ ایک تل نہیں پاپا حسن آراء کا ان کے دونوں بیٹوں نے باپ ہی کی مانند مخلص' محبت کرنے والے اور سادہ مزاج' وگرنہ شاید مجھے اپنے عہد پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا۔'' وہ تیزی سے تسبیح کے دانے گرانے لگیں۔

''زرش آپ اگر شادی کی تصویریں دیکھیں تو دنگ رہ جائیں آپ' کمپیوٹرائزڈ تصاویر بنوائی ہیں اعظم بھیا نے۔ اپنی آپا کو تاج محل تک میں کھڑا کر رکھا ہے۔ اتنی بہترین تصویریں' اپنی مووی اور کیمرے سے کھنچوائی تصویریں تو پانی بھرتی ہیں ان کے آگے۔'' اس نے پہلی بار تھکے تھکے انداز میں دادی جان کے تخت پر بچھی کی بھی دیوار سے ٹیک لگائے زرش کو مخاطب کیا تھا' جس نے آنکھیں کھول کر ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔

''پھر وہی مڈل کلاس کی باتیں' کمپیوٹرائزڈ تصاویر کوئی عجوبہ تو نہیں صرف پیسے کا کمال ہے اور خیر سے ہمارے گھر والے ایسے خرچوں کو اسراف میں شمار کرتے ہیں۔ وگرنہ ایسی سینکڑوں تصاویر بنوا سکتے ہیں ہم بھی۔'' اس کا لہجہ تلخ تو ہمیشہ سے ہی تھا مگر اس میں بغاوت کی بو بھی اب دادی جان محسوس کرنے لگی تھیں۔ مگر ان کے لیے شاہ عالم والا تجربہ کافی تھا۔ اس لیے کچھ نہیں بولیں۔

''ایسے تو نہ کہیں آپا' زرش آپا کی شادی پر کیا کم پیسہ خرچ ہوا ہے۔'' سحرش کا لہجہ شاکی سا ہو گیا۔

''اپنی حیثیت سے بڑھ کر کیا ہے سب کچھ دادی جان اور امی جان نے۔''

''تو گڑیا جب ہاتھی پالتے ہیں دروازے بڑے کرنے ہی پڑتے ہیں۔'' اسکا لہجہ کاٹ دار ہو گیا۔

''خیر ایسی بات نہیں۔ بچپن سے طے شدہ نسبت تھی' کوئی ان کا اسٹینڈرڈ دیکھ کر تو نہ ریجھ چلی تھیں امی جان' اور اگر بات سٹینڈرڈ کی ہی ہے تو ابھی کچھ دیر قبل ہی ان کا اسٹینڈرڈ واضع کیا ہے میں نے۔''

''اتنا ضرور ہے کہ حسنہ آنٹی کی خاصے ویل آف لوگوں سے صاحب سلامت ہے یا پھر وہ

اسٹنڈرڈ دیکھ کر ہی دوستیاں پالتی ہیں۔'' سحر کا لہجہ سچا کھرا اور بے داغ تھا۔ دادی جان کے اندر چھینٹے سے پڑنے لگے اس آگ پر جو زرش کے لہجے کی تلخی کے بموجب بھڑکنے لگی تھی۔ سحر عادت کے برخلاف اس کی کھنچائی کرنے لگی مگر انھوں نے ٹوکا نہیں۔

''بیچاری حسنہ آنٹی پھر رشتہ داری نبھاتے ہوئے کیوں اسٹنڈرڈ نظر انداز کر گئیں۔''

''یہ ان کا اپنا مسئلہ ہے زرش آپا۔ ممکن ہے۔ انھیں پرانے عہد کی پاسداری گھسیٹ لائی یا نازش آپا کا نصیب' یہ تو طے ہے کہ ہمارے بزرگوں کی نیتوں میں کھوٹ نہ تھا۔'' زرش کھسیانی ہی ہو کر رہ گئی وگرنہ عام حالات میں وہ اتنی آسانی سے ہار نہ مانا کرتی تھی مگر سحر کا کہا ایک ایک لفظ راست تھا۔ سارم کی آمد پر اس کا مزید موڈ آف ہوا اور سارم کے لیے اس کے ایسے کڑے تیور کبھی اجنبی نہ رہے تھے۔ اس لیے وہ دادی جان کی دعائیں لے کر موڑھے پر براجمان ہوا تو ایک گہری نظر اس کے سپرد کی' اس میں کچھ شک نہ تھا کہ اس کی شخصیت پہلے سے کہیں زیادہ نکھر چلی تھی۔ جاب کے بعد وہ باقاعدگی سے پارلرز کے چکر لگانے لگی تھی۔ اگرچہ اپنی ذات سے لاپرواہ تو کبھی نہ رہی تھی۔ فشل' مساج' ہیئر کٹنگ' تھریڈنگ وغیرہ کے شخصیت میں ایک ماڈ سا لک آ گیا تھا۔ چہرہ ماہتاب کی مانند دمکنے لگا تھا۔

''ہو گئے فارمز فل اپ؟'' سارم کو اس کی خاموشی کے قفل توڑنے کا بہانہ درکار ہوا کرتا تھا جبکہ جواباً وہ اسی بے نیازی کے ہمراہ اٹھی اور اندرونی کمرے سے فارم لا کر اس کے سامنے رکھ دیے۔

''اہم دستاویزات کی نقول ہمراہ ہیں' مجھے تو آفس سے چھٹی ملنا مشکل ہے۔ آپ کوشش کر لینا اگر میرے بغیر فارم سب مٹ کر لیے جائیں تو بہتر ہے ورنہ.....'' اس نے مزید بے نیازی کے مظاہرے کی خاطر کندھے اچکائے تھے۔

''ورنہ..... فکر نہ کرنا..... یونیورسٹی کے رستوں سے آشنا ہوں میں۔''

''خیر رستے تو اب میرے لیے بھی کوئی اجنبی نہیں رہے' کرنا پڑے گا پھر کچھ نہ کچھ پھر صبا اکرام اللہ تو یقیناً واقف ہی ہے یونیورسٹی کے رستوں سے۔'' زرش نے سارم کی نظروں میں ڈولتے آس اور امید کے جلتے بجھتے دیوں کی چنداں پروا نہ کی' جو اس کا ساتھ پانے کی حسرت اور امید میں لو دینے لگے تھے۔ سارم نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ زرش نے تخت پر پڑے پرس سے پانچ پانچ سو کے چند کرارے نوٹ نکال کر اسے تھمانے چاہے تھے۔ سارم لب بھینچ کر رہ گیا۔ ایسے ہی اجنبیت کے خاطر خواہ مظاہروں پر وہ انھیں کئی کوسوں فاصلے پر کھڑی نظر آئی۔ ملاپ ایک ناقابل تسخیر عمل دکھائی دینے لگتا انھیں۔ امی کے تقاضے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ وہ بہر طور سحرش کے رشتے کے لیے ان کی دہلیز گھس ڈالنے پر تلی بیٹھی تھیں۔ سارم بحث کر کر کے تو ہارنے لگے تھے اب تو مزاحمتیں بھی دم توڑنے لگی تھیں۔ مگر وہ کس بوتے پر زرش کا نام لیے جاتے۔ اس کی محبت ایک سراب بنتی جا رہی تھی اور اگرچہ وہ اس گھر کے کسی فرد سے کسی بھی کام کی مد میں روبے تھامنے کے وہ کبھی روادار نہ رہے تھے۔ مگر زرش کے کڑے تیوروں کے سبب انھیں اس ناپسندیدہ عمل کا ارتکاب بھی کرنا ہی پڑا مبادا کوئی تلخی ہی ہو جائے۔ زرش نے ایک آسودہ سی سانس لی تھی۔

''اگرچہ ابھی لاسٹ ڈیٹ دور ہے لیٹ فیس بھی درج نہیں لیکن احتیاطاً تقریباً دوگنی رقم ہے'

گذشتہ اسناد کی نقول بھی فارم پر لگا دی ہیں اور اپنی تصاویر بھی چسپاں کر رکھی ہیں۔ صرف فارم سب مٹ کروانا ہے۔'' وہ اپنے تئیں تمام معاملات ان کے حوالے کر کے بات ختم کر کے اٹھ گئی۔ تو وہ پلٹ کر دادی جان سے نازش کے احوال پوچھنے لگے۔ معظم سے ان کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ سو اس کا احوال تفصیلاً دریافت کیا البتہ ان کی مشاق نظروں نے معظم کے ذکر پر سحرش کو نروس سا ہوتے دیکھ کر بہت کچھ بھانپ لیا تھا اور نہ جانے کیوں اپنے اندر کملاتے شکوک کو کمک پا کر خاصا آسودہ خیال کیا اور زیر لب مسکرا دیئے۔

☆☆☆

''غضب خدا کا صبح ہوئی نہیں کہ بیگ کندھے پر لٹکا کر تم چلتی بنیں۔ ذرا مجھ غریب کا خیال نہیں کیونکر سنبھال پاؤنگی میں تمھارے اس آدھے فٹ کے فتنے کو' موئے نے ریں ریں کر کے کان کھا لیے میرے۔ ادھر یہ خدمت گزاریاں دیکھ کر بہویں منہ کو آتی ہیں۔ پوتے پوتیوں کو کو بھی نہ نصیب ہوئے ایسے چاؤ چونچلے' خیر ان کا بھی کہنا بجا ہے۔ میری بوڑھی جان میں اب اتنا دم نہیں ہے' کیا پوتے کیا نواسے' مگر تم گئی تھیں کہاں؟''

''اماں منے کا فیڈر سیریلیک سب تیار کر کے گی تھی اور احتیاطاً ذرا سا نیند کا شربت بھی چٹا گی تھی' تب بھی تمھیں قرار نہیں۔'' وہ قصداً ان کا سوال نظر انداز کر کے کندھے سے بیگ اتار کر تھکے تھکے انداز میں چارپائی پر ڈھے گئی۔

''اے بی بی ماں ہوں تمھاری سوال کرنے کا حق رکھتی ہوں' کنبے میں رہتی ہو تو کنبے میں رہنے کے طور طریقے بھی سیکھو۔ تمھاری بھاوجوں کی مجال ہے جو یوں مجھے سوتے کو چھوڑ کر بچے میرے متھے مار کر سیر سپاٹوں کو نکل کھڑی ہوں۔ تمھاری تو آنکھیں ہی آسمان سے جا لگی ہیں۔'' وہ دونوں ہی شاہ عالم کی موجودگی فراموش کر گئی تھیں جو ساتھ والے کمرے میں ٹی وی کے سامنے بیٹھا چینل سرچ کرتا ہوا ان کی گفتگو کا ایک ایک لفظ بغور سن رہا تھا۔

''بتایا تو تھا پرانی نوکری دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کروں گی' وہ نہیں ملی تو ملک بھر میں نوکریاں ختم نہیں ہوگئی ہیں۔'' ماہین نے سختی سے کہا اور بدمزگی سے سینڈلز اتار کر ادھر ادھر پھینکے جبکہ اماں کو اس کی نوکری کا سنتے ہی پتنگے لگ گئے تھے۔

''اے بی بی ہوش کے ناخن لو' تم صبح سے لے کر شام تک دفتروں کے دھکے کھاتی پھرو گی تو اس شیطان کے چیلے کو کون بھگتے گا۔''

''اس کی تم پروا نہ کرو کسی کے بھی منہ پر ہزار پانچ سو ماروں گی اور بچہ بخش دوں گی اسے۔''

''اے تو تمھیں غیر کے منہ پر پیسہ مارنا منظور ہے مگر ماں کو دیتے جان نکلتی ہے' عقل کی اندھی اور گانٹھ کی پوری تو بس میں نے تم ہی کو پایا ہے۔''

''جب مجھے پیسے دینے ہی ہیں تو میں احسان کا ٹوکرا اپنے سر کیوں لادوں' اپنوں سے غیر بہتر رہیں گے کم از کم احسان کر کے طعنے تو نہ دیں گے۔'' ماہین کا جتانا اماں کو بلیوں اچھلنے پر مجبور کر گیا۔

''اے بی بی ماں ہوں تمھاری پیدا کیا ہے تمھیں میں نے اور یہ احسان تو تم مر کر بھی نہیں اتار سکتی۔ تمھیں پڑی کیا ہے ٹکے ٹکے کی نوکریوں کے پیچھے خجل خوار ہونے کی۔ شاہ عالم کو سمجھاؤ سیدھے سیدھے اپنا حق وصول کرے۔'' اماں کی بدنصیبی ان کی پڑھائی گئی پٹیوں میں سب سے کارآمد پٹی اب تک لاحاصل رہی تھی۔

''ہاں عدالت میں کھڑی ہو جاؤں مکان اور اثاثے سے اپنا حصہ نکلوانے کے لیے' اور بس یہی کمی رہ گئی تھی سسرالیوں کے حلق پر انگوٹھا رکھنے کی۔''

''سب سمجھتی ہوں یہ فرخندہ ڈائن کی بھرائی ہے ساری' وہی شوہر پرستی سسرالیوں کی قدر و قیمت کی پٹیاں پڑھایا کرتی ہے تجھے' خود تو جیسے بڑی اہل ہے' نامرادنی۔''

''تو کچھ غلط نہیں سمجھاتی بے چاری' میکے کی دہلیز پر آ کر بیٹھنے والی ہر بیٹی کو گزارے کا درس دیا جاتا ہے تمھاری طرح آگ نہیں لگائی جاتی بھڑکاوے کی۔'' وہ ماں سے متنفر ہو چلی تھی۔

''یا میرے خدا میرے بخت میں یہ دن بھی دیکھنا لکھا تھا میری بیٹی مجھے بی جمالو کہہ رہی ہے۔ اے تو کس نے صلاح دی تھی میکے کی دہلیز پر بیٹھنے کی اور بھلا کس کے کاندھے پر آ کر بیٹھی تھی احسان فراموش۔''

''میں سب جانتی ہوں یہ اسی فرخندہ ڈائن کی کارستانی ہے پہلے تعویذ گنڈوں سے میرا بچہ قابو کیا' اب تجھ پر وار کر رہی ہے۔ خدا غارت کرے اس بدبخت کو۔'' اماں کے بین جاری ہو گئے تو وہ بدمزگی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان کی چیخ چیخ سے بچہ جاگ کر بلک بلک کر رو رہا تھا۔ مگر پروا کسے تھی۔ اور جب بچے کا بلکنا شاہ عالم کی برداشت سے باہر ہونے لگا تو وہ دوسرے کمرے سے اٹھ آیا۔ ماہین کچن میں جا کر چائے بنانے لگی تھی۔ اماں کے سر پر پٹی بندھ چکی تھی اور لاتعلقی کے واضح اظہار کے لیے وہ دوسری چارپائی پر بیٹھے پیٹھ موڑے پڑی تھیں۔ شاہ عالم نے روتے بلکتے بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

☆☆☆

کبھی آپ کو کسی نے بتایا مس زرش کہ بندے کے ہوش گم کر دینے کی صلاحیت اور اہمیت رکھتا ہے آپ کا حسن۔'' وہ میز پر کہنیاں ٹکائے اپنی نگاہوں میں ڈھیروں ڈھیر فتنے سموئے اسے دیکھ رہے تھے اور اسے آج جانے کیوں الجھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ نگاہ بار بار رسٹ واچ کی جانب اٹھ رہی تھی انھوں نے بھانپ لیا اور مبہم سا مسکرائے۔

''یوں نہ کریں مس زرش اپنا آپ مجرم سا محسوس ہونے لگتا ہے ہمیں۔'' لہجے میں وہی سرسراہٹ و عامیانہ پن کی سی لہر' اسے صبا اکرام اللہ کی ہمتوں کو سلام کرنا پڑا۔

''سر کافی دیر ہو رہی ہے اب چلنا چاہیے گھر میں بھی پریشانی.....''

''ڈونٹ یو وری مس زرش میں ڈراپ کر دوں گا۔ خدارا ان لمحات کا طلسم نہ توڑیں جو آپ کی سنگت نے بخشا ہے۔'' اب وہ انھیں کیا بتاتی کہ اس سے قبل ان کے ڈراپ کرنے پر کیا اعتراضات اٹھے تھے۔

''سر پارٹی کب تک آئے گی؟'' پرل کانٹی نینٹل کا یخ بستہ ماحول' جگر جگر کرتی روشنیوں میں بھی اس کے ماتھے پر پریشانی کی شکنیں واضح تھیں وہ مزے سے کافی میں شکر گھول رہے تھے۔

''آپ کو کافی بنانی نہیں آتی؟'' انھوں نے کافی کا مگ اس کے سامنے رکھ کر صاف اسے موضوع سے ہٹانا چاہا تھا۔

''یس سر..... نو سر..... بٹ آئی ایم گیٹنگ ویٹ..... پارٹی۔''

''اوہ تو مس زرش یو آر اے کانفیڈنٹ اینڈ داودنگ وومن۔''

''نو سر آئی ایم ناٹ اے کانفیڈنٹ وومن' بہت سی زنجیروں میں جکڑا ہے میرا وجود' وقت کی پابند ہے میری ریپوٹیشن۔ اور سر مجھے اپنی ریپوٹیشن عزیز بھی بہت ہے۔''

''آزاد کر دیجیے ان زنجیروں پابندیوں کی قید سے خود کو مس رزش ایوری تھنگ از فیئر ان لو اینڈ وار۔'' (محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے) اور جانے کیوں اسے ان کی زبان سے محبت کا لفظ بڑا ہی بے ڈھنگا سا لگا۔ عمر عزیز کا یہ پر بہار دور اب قدرے رخصت پر تھا مگر ان کے مزاج کی جولانیاں عروج پر رہا کرتی' اپنا مفاد زیر نظر نہ ہوتا تو پرواکس کا فر کوتھی' مگر صبا اکرام اللہ کا پڑھایا گیا درس اثر انداز ہو چلا تھا اس پر' وہ جانتی تھی یہ اعزاز ہر کسی کو نہیں بخشا جاتا۔ آفس میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ مس نسرین جیسی کم صورت معمولی عہدے پر فائز اس کی خوش بختی پر رشک کرتی ہے۔ وہی مقام پانے کی تمنی ہے جو صبا اکرام اللہ کا بخت تھا۔ ایسے میں ایم ڈی کے چند نا قابل برداشت جملے سہہ جانا کٹھن سہی' سود مند ثابت ہوتا۔ دودھ دینے والی بکری کی چند لاتیں سہہ جانے میں کیا مضائقہ تھا بھلا۔ مگر آج صبا اکرام اللہ کی جگہ ان کی پی۔ اے کی حیثیت سے اس مہنگے ترین ہوٹل میں کسی پارٹی کو ویلکم کہنے کے لیے آنا خود اس کے لیے ناپسندیدہ سا رہا تھا۔ وہ بار بار پارٹی کے بارے میں دریافت کرتی محترم گول کر جاتے۔ گھڑی کی سوئیاں نو بجانے کو تھیں اور اس کی بے چینی عروج پر۔

''سر اب بہت مشکل ہے مزید انتظار..... آپ کی پارٹی.....''

''پارٹی..... بھئی کون سی پارٹی یہ تو فقط ایک بہانہ تھا آپ کی سنگت میں کچھ لمحات گزارنے کا۔''

''وہاٹ..... تو آپ نے جھوٹ بولا تھا؟'' وہ کھول ہی تو اٹھی۔ ساتھ ہی کرسی گھسیٹ کر کھڑی بھی ہو گئی۔

''مس زرش ابھی آپ کہہ کہا تو تھا ایوری تھنگ ای فیئر ان لو اینڈ وار..... اینی وے میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' اگرچہ اس وقت ان کی صورت بھی زہر لگ رہی تھی مگر یہ بھی ایک مجبوری ٹھہری۔ وہ جانتی تھی الفت بانو اور دادی جان ہول ہول کر آدھی جان گلا چکی ہوں گی۔ رستے بھر وہ میٹھی میٹھی باتیں کر کے اس کا موڈ بحال کرنے کے لیے کوشاں رہے لیکن وہ مزید کھولتی رہی۔

☆☆☆

''ہئے..... ہئے پھر کیا ہوا معظم بچے جلدی بتا۔'' دادی جان کی بے قراری عروج پر پہنچ رہی تھی جبکہ سحر کچن کے دروازے کی اوٹ سے مسلسل اسے مکے دکھا رہی تھی۔

''ہونا کیا تھا دادی جان ایک بار ان چڑیل محترمہ کو لفٹ کیا دے دی اپنی کار میں انھیں تو چسکہ لگ گیا۔ ہر روز میرے راستے میں ایستادہ بھری دوپہر میں میری کار کا رستہ روک لیا کرتیں اور مستزاد یہ کہ سو جان سے فدا۔''

''تم نے ڈھنگ سے دیکھا ہوتا پچھلی پیری تو نہ تھی۔''

''پیر کیسے دیکھتا پیروں میں تو کالج شوز ہوا کرتے ہیں۔'' سحر نے خطرناک تیوروں کے ہمراہ بیلن اٹھا لیا مگر وہ مسکرا رہا تھا۔

''ہائیں چڑیل کے پیروں میں کالج کے جوتے۔'' اب تو الفت بانو بھی چونکیں۔

''دلہن یہ موٹی ڈائنیں چڑیلیں مختلف بھیس بدل کر سامنے آتی ہیں۔ معظم بچے تم ٹھہرنا میں ظہر سے فارغ ہو لوں پھر تمھارا آیتوں سے حصار باندھتی ہوں۔'' وہ سچ مچ پریشان ہو کر وضو کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''دادی جان آپ ظہر تو کیا عصر سے بھی فارغ ہو لیں تو آج میں ٹلنے والا نہیں۔'' وہ تو وضو کے لیے چلی گئی تھیں۔ لہٰذا معظم نے بطور خاص اسے سنایا تھا۔ الفت بانو کو جانے کون سا کام یاد آیا وہ اندرونی کمرے کی جانب بڑھیں تو وہ فی الفور اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ جواب دادی جان کے تخت پر فراغت سے نیم دراز تھا۔ دونوں ہاتھ سہولت سے سر کے نیچے ٹکائے مبہم سا مسکرا رہا تھا۔

''دنیا کا کوئی کام تمھارے لیے بنا ہے کہ نہیں' یا تو کالج کے رستے میں پلکیں بچھائے نظر آتے ہو یا پھر گھر پر ڈیرا ڈالے اول فول بکا کرتے ہو۔'' اس کے تیور جارحانہ سے تھے۔

''اہوہ..... تم نے سنا نہیں عشق نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔''

''اب تم فوراً سے پیشتر چلتے پھرتے نظر آؤ ورنہ اچھا نہ ہوگا سمجھے۔''

''اب ہم آئے ہیں تو آپ کو لیے بغیر جانے والے نہیں یہ اچھی طرح سے سن لیجیے محترمہ۔''

''میرے باپ کی توبہ جو آج کے بعد تمھاری اس منحوس بے ہنگم بائیک پر بیٹھوں۔''

''تو آپ ہمارے دل میں قیام فرمایئے سر آنکھوں پر بیٹھیں محترمہ بائیک کا نام کس نے لیا؟''

''ایک تو ہر بات کا گھڑا گھڑایا جواب موجود ہوتا ہے آپ کے پاس' مگر سن رکھئے میں نے دادی جان سے شکایت لگا دی ہے اور وہ اب کبھی بھولے سے بھی آپ کے ہمراہ مجھے جانے کی اجازت نہ دیں گی۔''

''دادی جان کی مگر آپ چھوڑ دیں انھیں تو پل بھر میں پٹانے کے پچاس طریقے میری جیب میں موجود ہیں۔''

''بڑوں کا اس انداز میں تذکرہ مناسب ہے کیا؟'' اخلاق احترام تو ختم تھا اس گھرانے پر اور معظم کو ان کی یہی وطیرے بھاتے تھے وہ پل بھر کو لاجواب سے ہو کر رہ گئے۔

''اگر یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہے خوش رہو اہل چمن ہم تو سفر کرتے ہیں۔'' وہ سچ مچ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ سیاہ ٹراؤزر لائننگ والی ٹی شرٹ میں اس کا دراز قد مزید نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ پیروں میں جوگرز کس کر اس کے سامنے کھڑا ہوا تو سحر کا وجود بونا سا لگ رہا تھا۔

''پوچھو گی نہیں پھر کب نازل ہوں گے جناب؟''

''جی نہیں مجھے معلوم ہے آپ کل پھر موجود ہوں گے۔'' اس نے بے اعتنائی کی انتہا کر ڈالی۔

''اور پھر یہ کل بھی مجھے کتنی دور معلوم ہوتی ہے تم کیا جانو۔'' اس کا لہجہ مبہم مگر لفظ سنجیدہ تھے وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

☆☆☆

ماہین نے جو کہا تھا کر دکھایا' منے کو فرخندہ سنبھالتی۔ اماں کو پتنگے لگ جاتے۔ وہ گھر بھر میں جلے پیر کی بلی کی مانند پھرا کرتیں۔ نوالہ ان کا' کمائی ان کی بیٹی کی اور حقدار ان کے دشمن وہ کلس کلس کر فرخندہ پر پل پڑتیں۔ فرخندہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالتی رہتیں۔ بچہ ان کی تو جان کو آیا رہتا تھا۔ فرخندہ کے کمرے میں مزے سے سویا رہتا۔ یا پھر کھیلتا رہتا۔

اماں نے جس بھلکو پن بے نیازی اور لاپروائی سے اپنے بچے پالے تھے وہی ہنر وہ آج کے بچے پر آزمایا کرتیں۔ زیادہ جان کو آتا تو نیند کا شربت چٹا ڈالتیں وہ گھنٹوں گہری نیند سویا کرتا۔ مگر فرخندہ کے طور طریقے مختلف تھے۔ وقت پر فیڈ' سیریلیک اور اب تو وہ واکر میں مزے سے ادھر ادھر گھومتا شاید ماہین بھی مطمئن تھی۔ مگر اماں کا اطمینان رخصت ہو چلا تھا۔ انھوں نے چاہا تھا پیسوں کی کمی کا رونا رو رو کر ماہین کا ناطقہ بند کر دیں گی۔ اس کا بچہ پال کر احسانات کا بار اس کے سر رکھیں گی۔ وہ اس احسان کا بوجھ کم کرنے کو کما کما کر ان کی مٹھی گرم کرتی رہیں گی۔ مگر الٹی ہوئیں ساری تدبیریں' ان کے رویے کی بدصورتی نے ماہین کو ان سے بدظن کر دیا تھا اور اب جب ماہین کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں تھا۔ اماں کے منہ میں پانی بھرا چلا آ رہا تھا۔ انھوں نے آج شاہ عالم کا گھیراؤ کیا تھا۔

''دیکھ رہے ہو اپنی بیوی کے کرتوت' آنکھیں ماتھے پر رکھ چھوڑی ہیں۔'' انھوں نے ملامت آمیز نظروں سے انھیں یوں دیکھا تھا جیسے اصل قصوروار وہی تو ہوں۔ شاہ عالم سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔ اگرچہ دل شدت سے تمنائی تھا کہ ان پر بھی ان کے سابقہ رویے کی بدصورتی عیاں کر دیں۔ مگر غالباً یہی آداب محبت کے تقاضے ہوا کرتے ہیں۔ لب ہلتے ہیں مگر شکایات دم توڑ جاتی ہیں۔

''میں تو کہوں پیسے کی گرمی چڑھ گئی ہے اس بدبخت کے دماغ کو' احسان فراموش نہ ہو تو۔''

''بھول گئی کہ دن رات ایک کر کے مجھ بوڑھی جان نے اس کی خدمت گزاریاں کیں۔''

اماں نے ہزار ہا کوششوں کے بعد پلکیں جھپک جھپک کر اپنی آنکھیں نم کر ہی ڈالیں۔ بعد ازاں ململ کے دوپٹے کے پلو سے رگڑ رگڑ کر انھیں سرخ بھی کر ڈالا۔

''میں پوچھوں کیا خطا ہو گئی مجھ بدنصیب سے۔ اسے اپنا تن پیٹ کاٹ کر کھلایا' بھگتا اور اس کا یہ انعام۔'' شاہ عالم بدستور سر نیہواڑے بیٹھے رہے۔

''خوب جانتی ہے بیٹوں کی دست نگر اور بہوؤں کی محتاج ہوں میں' اندھی نہیں ہے سب کچھ نظر آتا ہے۔ آج چار پیسے کمانے کھڑی ہو گئی تو وہ ڈائن بھاوج سگی بن گئی اس کی۔ خون چوس جائے گی وہ فرخندہ ڈائن اس کا۔ اے ایسی نند کے بچے کے لیے ممتا پھوٹی پڑ رہی تھی تو اس سے پہلے کیوں نہ سنبھالا۔ اب چار پیسے نظر آئے تو حصہ وصول کرنے کے بہانے بچہ دبوچ لیا۔'' اماں در پردہ اپنی فطرت کی پرت کھول رہی تھیں۔ شاہ عالم خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

''اے میاں خیر سے لاکھوں کے والی وارث ہو۔ کیا ضرورت ہے یوں مصیبتیں اٹھانے کی' تمھاری بیوی ٹکے ٹکے کی ملازمتوں کے پیچھے جل خوار ہوتی پھرے' بچہ غیروں کے رحم و کرم پر پلے بڑھے' سالوں ہڈیاں گھسے گی ماہین' بالوں میں دھوپ بھر آئے گی تب کہیں جا کر سر چھپانے کا ٹھکانہ میسر آئے گا۔ چند ہزار کی نوکریوں سے تو پیٹ کا ایندھن بھی بھرنا مشکل ہوا کرتا ہے۔ مگر ابھی

ہری ہری سوجھ رہی ہے۔ دو چار روز گزر جائیں تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ وہ تو کم عقل ہے مگر تم تو ہوش کے ناخن لو۔ کیا ضرورت ہے اتنی عیش پینے کی۔ اے سیدھے سیدھے دعویٰ کر دو گھر میں اپنے حصے کا' اصل حقدار والی وارث تم ہو۔ بڑی بی چراغ سحری ہیں' تینوں لڑکیوں کی شادی کے بعد تم ہی تو مالک قرار پاؤ گے۔'' شاہ عالم کے دل کو ان کی بات ٹھاہ کر کے لگی۔ مگر وہ کسی اور نہج پر سوچ رہا تھا۔

''نہ نہ کرتے کرتے بھی ہزار خرچ بڑھ گئے ہیں تمھاری آمد کے بعد' دو آدمیوں کا خرچ بھی کم نہیں ہوا کرتا۔ خیر سے چار روٹیاں زیادہ پکتی ہیں تو چولہا بھی جلتا ہے' گیس بھی خرچ ہوتی ہے۔'' کتنے سیدھے سبھاؤ انھوں نے چار روٹیوں کی اہمیت جتائی تھی جبکہ ہر ماہ لگا بندھا خرچ ماہین ان کو دیا کرتی تھی۔ شاہ عالم کے دل کو ٹھیس سی لگی اور ہر ماہ ہزار یا پانچ سو کے عوض وہ اپنے گھر میں کس دھڑلے سے رہا کرتے تھے۔ وہ ہزار پانچ سو بھیک کی مانند دادی جان کے سامنے ڈالا کرتے تھے جنھیں تھامنا ان کی مجبوری اور وہ سمجھتے رہے کہ حق ادا ہو گیا۔ ان دادی جان کا جنھوں نے اپنے حصے کے نوالے ان کے منہ میں ڈالے تھے۔ سرما کی سرد ترین راتوں میں وہ یوں اسے دبوچ کر سلایا کرتیں کہ ٹھنڈی ہوا بھی نہ چھو کر گزرتی۔ اور کتنی ٹھیک ٹھاک آشنائی ہوئی تھی ان کی دو روٹیوں کی قدر و قیمت سے۔ سچ ہے دور کے ڈھول سہانے۔ اسامہ کسمایا تھا۔ ماہین کے لوٹنے کا وقت تھا جبکہ فرخندہ کچن میں مصروف تھیں۔ اسامہ نے اسٹارٹ لیا ہی تھا کہ اماں اکتا گئیں۔ پہلے ہائے اوی کرتی لیٹ گئی۔ پھر کروٹ بدل گئیں۔

''لو جی شروع ہو گئیں اس فتنے کی راگنیاں۔ یہ بھی ایک علت ہی ہے۔'' ان کے لہجے میں تل برابر رغبت نہ تھی' کس لاپرواہی اور بے زاری سے اماں نے ان کے جگر گوشے کو علت قرار دیا تھا۔ ان کے چشم تصور میں دادی جان کا چہرہ ابھرا تھا۔ جو ان کی اولاد کو دیکھنے کی آس میں پل پل گنا کرتی تھیں۔ وہ اسامہ کو اٹھا کر گھر سے باہر نکل آئے۔

☆☆☆

صبا اکرام اللہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

''دماغ تو درست ہے تمھارا' گھاس تو نہیں چر گئی ہو۔''

''بس مجھے غصہ آ گیا تھا۔ تاخیر ہی اتنی ہو گئی تھی۔''

''اور تم ایم۔ ڈی صاحب پر الٹ پڑیں' یہ سوچے بغیر کہ تمھاری کامیابی کی کنجی انہی کے ہاتھ ہے۔''

''انھوں نے غلط بیانی بھی تو کی تھی۔''

''گولی مارو ان کی بیان بازیوں کو' اپنا فائدہ سوچو' صرف اور صرف اپنے مفاد مدنظر رکھو' وہ مس نسرین کو نہ لے جائیں اٹھا کر اس کی پلٹ سے' سیخ پا ڈنر کروانے کے لیے۔ آگے پیچھے پھرتی ہے۔ جی حضوریاں کرتی ہے ان کی' تب بھی ایک نگاہ التفات سے محروم ہے۔ قسمت تمھارا در کھٹکھٹا رہی ہے تو تم پیٹھ موڑ کر بیٹھ جاؤ۔ مگر یاد رکھو قسمت بار بار دستک نہیں دیا کرتی۔ وقت کو مسئلہ بنا کر ریپوٹیشن کے رونے روتی رہو بیٹھ کر' مڈل کلاسیوں کی مڈل کلاس ہی سوچ۔'' صبا اکرام اللہ کی بات اس کے دل کو لگی۔ پی۔ اے کا عہدہ ایم۔ ڈی تھال میں سجا کر کھڑا تھا اور وہ کفران نعمت پر تلی تھی۔

''اور پھر پی۔اے بن جانے کے بعد تو زیادہ وقت دینا پڑے گا' پھر کیا جلدی جلدی کی رٹ لگاتی بھلی لگو گی۔ کان سے پکڑ کر نکالیں گے وہ تمھیں۔'' اپنے اس حسن بلاخیز کی قدر و قیمت جانو اور اسے کیش کرانا سیکھو۔ صرف اور صرف اپنے فوائد پر نظر رکھو اور دنیا کو مارو گولی۔ اگر تمھارے گھر والوں نے نوکری کی اجازت بخشی ہے تو سمجھوتہ بھی کرنا سیکھیں۔'' اب وہ اسے کیسے بتاتی کہ اس کی نوکری سے بھی تل برابر فائدہ نہ وصولا کبھی گھر والوں نے' سمجھوتہ تو وہ کر ہی چکے ہیں' محض اسی کی ضد کے بموجب۔''

''ایک تو اپنے ایم۔ڈی صاحب کی پرسنیلٹی اتنی پرکشش ہے سچ میں کامپلیکس کا شکار ہو جاتی ہوں ان کے ساتھ چلتے ہوئے۔''

''ہائیں.....؟'' یہ انکشاف نیا تھا کرخت آنکھوں میں ڈولتی سردسی چمک' چشم تصور میں ابھری۔ زرش جھرجھری لے کر رہ گئی۔ مگر صبا غلط کیا کہتی تھی' وہ ہے ہی بدذوق' اس نے طے کر لیا تھا اس بار ان کا مفصل اور ٹھیک ٹھاک جائزہ لے کر رہے گی۔ وہ تو ان خنی نگاہوں سے خائف ہو کر تادیر نگاہیں ہی نہ اٹھا پاتی۔ انٹرکام بجا' ایم۔ڈی نے صبا کو طلب کیا تھا۔ وہ سرخ لباس میں شعلہ جوالہ سی دہکتی اٹھلاتی بل کھاتی ڈائی شدہ بالوں پر ہاتھ پھیرتی دھڑ سے ان کے چیمبر میں گھس گئی۔

''ہیلو.....ہاؤ آر یو' کیسا چل رہا ہے مس صبا؟'' وہ چہک اٹھے تھے۔ اپنی پوزیشن کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے جانے کیا پوچھنا چاہتے تھے۔ صبا نے مسکرا کر انھیں وکٹری دکھائی اور سٹائل سے کرسی پر براجمان ہو گئی۔

''ویری گڈ۔'' وہ مطمئن سے اپنی چیئر پر آ ٹکے پیچھے جھولنے لگے۔

''مگر آپ اپنا وعدہ نہ بھولیے گا سر۔'' اس نے محتاط سے لفظوں میں انھیں کچھ جتایا تھا اور وہ بے نیازی کا خاطر خواہ مظاہرہ کرنے کے لیے سگار سلگانے لگے' صبا بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئی۔

☆☆☆

''ارے کچھ سنا ہے کہ نہیں؟ میں اکیلی ہی سر پھوڑ رہی ہوں کچھ تو منہ سے پھوٹ سارم بچے۔''

''امی آخر اتنی جلدی کیا ہے۔ کیوں ہتھیلی پر سرسوں جمانے کو تیار بیٹھی ہیں آپ۔''

''ارے تو بلاوجہ تاخیر کیا ہے کی' کوئی سبب' کوئی وجہ بھی تو ہو۔'' اور وجہ خاصی پاورفل تھی۔ مگر دشواری تو یہ تھی کہ دشوار بہت تھی' اتنا تو وہ بھانپ ہی چکے تھے کہ ان کی مرضی و منشاء کے بغیر امی قدم اٹھانے سے گریزاں ہیں۔

''امی مناسب وقت کا انتظار کر لیں۔''

''ارے تو کب آئے گا وہ مناسب وقت؟ سال دو سال دس سال یا پھر میرے مرنے کے بعد۔''

''خدا نہ کرے امی' اللہ آپ کو ہزاروں برس کی عمر دے۔'' وہ ان کے نزدیک بیٹھ کر ان کے شانے تھام گئے۔

''بس اب مجھے پٹا کر مزید مت ٹال' یا تو اپنی مرضی بتا' ورنہ میں چلی الفت بانو کا دامن

تھامنے۔'' وہ بری طرح اکتائی ہوئی تھیں۔

''آپ الفت بانو کا دامن تھامیے گا ضرور مگر اس وقت نہیں۔'' ان کے مبہم سے گریز میں ان کی اپنی خواہشات بھی پنہاں تھیں مگر وہ نہ سمجھ سکیں۔

''تو تاخیر کی وجہ کیا ہے آخر؟'' وہ جھلا اٹھیں اور وجہ تاخیر طشت از بام کرنے لائق ہوتی تو وہ پتے پتے بوٹے بوٹے پر رقم ڈالتے لہذا پینترا بدلنے ہی میں عافیت تھی۔

''امی سحر کی عمر تو دیکھیے ذرا جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے اسے کالج پہنچے ہوئے۔''

''تو میں کون سا کل ہی تیرے سر پر سہرا باندھ کر بارات ان کے دروازے پر کھڑی کرنے چلی ہوں۔ اور شادی کے لائق بچی ہے کوئی پنگھوڑے میں تو نہیں لیٹی ہے۔ یہی عمر ہوتی ہے شادی کی۔''

''اور اگر اسی وجہ کو جواز بنا کر آپ کا سوال رد کر دیا تو کوئی زور ہے ان پر۔''

''بالکل زور ہے' پہلا حق رشتے داروں کا ہوا کرتا ہے' تو جو دن رات گھسا رہتا ہے سو کام نمٹاتا ہے تو اسی رشتے داری کے حق پر لہذا میں بھی سوال کرنے کا حق رکھتی ہوں۔''

''خداوندا آپ کس طرح سمجھیں گی امی۔'' ان کا دل چاہا اپنے بال نوچ ڈالیں۔

''تو میرے بچے مجھے سمجھا اور وجہ بھی بتا۔ خیر نہ سہی تیری مرضی سحرش کے لیے تو دنیا لڑکیوں سے خالی تو نہیں ہو گئی ہے۔ ارے میرے چاند کے لیے ایک سے ایک لڑکی' اور سن رکھ تیری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہونے والا۔''

''تو بس پھر سن رکھیے فی الوقت یہ موضوع نہ چھیڑیے یہی میری مرضی و منشاء ہے۔''

''ارے تو تیرا بنے گا کیا۔ میں کیا پوتے پوتیاں کھلانے کا ارمان لیے ہی دنیا سے سدھار جاؤں۔'' انھوں نے دہائی دی تھی۔ مگر وہ سننے سے پہلے ہی رفو چکر ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''خالہ جانی۔'' اس نے نحیف سی آواز میں انھیں پکارا تھا جبکہ وہ لپک کر آئیں اور بیڈ کے سرہانے بیٹھ کر اس کا سر سہلانے لگیں۔ اس کے ایک ہاتھ میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔

''خالہ جانی مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' اور اگرچہ ان کے اپنے حواس خفا ہوئے جاتے تھے مگر چہرے پر سکون کا تاثر قائم رکھنا بھی ضروری تھا۔

''نہیں جانو اس میں بھلا ڈرنے والی کیا بات ہے۔ یہاں سے وہاں تک دیکھو' جنرل وارڈ میں کتنی عورتیں ہیں یہ سب تم سے مختلف تو نہیں۔''

''خالہ جانی ہم گھر کب چلیں گے؟'' اس نے نظروں میں آس بھر کر پوچھا تھا۔

''کیوں جانی یہاں کوئی تکلیف ہے کیا؟''

''خالہ جانی میرا دل گھبراتا ہے۔ ابکائیاں آتی رہتی ہیں۔ ہر جانب دواؤں کی بو ہے ادھر۔''

''سب ٹھیک ہو جائیگا جانو' دو چار روز کی بات اور ہے بس۔''

''اور اگر گھر پر جمی کا ٹیلی فون آیا تو؟ خالہ جانی میرا موبائل کہاں ہے؟''

''جمی کا فون آیا تو کوئی بھی بتا دے گا کہ میں تمھارے پاس ہوں' مگر میں نے تم سے کہا تھا کہ جمی کا نام بار بار نہ لینا اور تم نے وعدہ بھی کیا تھا بھول گئیں ناں۔'' انھوں نے قصداً اس کا سوال

گول کرنے کے لیے خفگی کا مظاہرہ کیا۔

''خالہ جانی اعظم..... اعظم مجھے یاد تو کرتا ہے ناں؟''

''کیوں نہیں میری جان' تم کوئی بھولنے والی شے ہو بھلا؟''

''جمی کا فون آیا تو اسے کون بتائے گا کہ میں ہسپتال میں ہوں؟''

'پھر جمی..... جمی یا جنید انصار کا نام نہیں لینا ہے سنا تم نے۔''

''اچھا تو پھر اعظم.....؟''

''اعظم بھی نہیں معظم..... تم معظم کو کیوں نہیں یاد کرتیں' کتنا خیال رکھتا ہے وہ تمھارا' اعظم تو ایکدم روڈ ہے ڈیئر اور پھر اب تو اس کی شادی ہو چکی ہے ناں۔''

''مجھے بالکل پسند نہیں اس کی بیوی اور خالہ جانی آپ تو کہہ رہی تھیں وہ جلد ہی چلی جائے گی۔''

''ماہا جانو..... لیو اٹ' سنا نہیں ڈاکٹر نے کیا کہا تھا برڈن نہیں لینا بلڈ پریشر گر جائے گا۔ اور یہ تو بالکل بھی نہیں کہنا کہ تمھاری شادی.....'' انھوں نے رٹا رٹایا سبق ایک بار پھر دوہرانے کی کوشش کی۔

''معلوم ہے خالہ جانی میں کنواری ہوں' مگر میٹرنٹی ہوم میں ہوں' اسی لیے اعظم بھی مجھ سے نفرت کرتا ہے مجھ سے۔'' اس کی ہیجانی کیفیت ایک بار پھر عود کر آنے لگی۔

''ماہا خالہ جانی تمھارے پاس تو ہیں اور تم سے کتنا پیار کرتی ہیں' تم خالہ جانی کے بارے میں سوچا کرو بس۔''

''اور معظم ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں معظم میرا خیال رکھتا ہے مگر وہ ہسپتال کیوں نہیں آیا؟''

''سی..... ہسپتال کا نام بھی معظم کے سامنے نہیں لینا۔ ماہا آخر میں تمھیں کس طرح سمجھاؤں؟'' وہ جھلا اٹھیں۔ وہ جب اول فول بکنے پر تل جاتی تو انھیں زچ کر ڈالتی۔ ایک ایک لمحہ انھیں بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ اس پر ڈاکٹر کی توجیہات' خدشات' ان کا بس نہ چلتا تھا' مگر وہ فوراً سے پیشتر اپنی مرضی و منشاء کے مطابق حالات کو ڈھال کر فی الفور اس صیغے کو پاک کرنا چاہتی تھیں۔

☆☆☆

''کیا ہو رہا ہے جناب؟'' وہ الماری کے سامنے کھڑی کپڑے درست کر کے رکھ رہی تھی جب اعظم نے عقب سے اس کا گھیراؤ کیا۔

''ارے آپ کب آئے؟'' اس نے مڑنا چاہا مگر اعظم کی گرفت مضبوط تھی۔

''سالوں ہو گئے جناب' مگر لگتا ہے اب تک بیکار کی جیتے رہے ہم' زندگی تو آپ ک آنے کے بعد شروع ہوئی ہے۔''

''بس شروع شاعر صاحب۔'' وہ مبہم سا مسکرائی۔

''بائی دی وے یہ گھر میں اتنا سناٹا سا کیوں ہے؟''

''ماما تو غالباً ہسپتال گئی ہیں اور معظم آپ جانتے ہی ہیں آدھی رات کو لوٹیں گے تو یونیورسٹی کا ہی نام لیں گے۔''

''تمھیں معلوم ہے کچھ ماہا کے بارے میں؟ آئی مین پرابلم کیا ہے اس کے ساتھ؟'' اس نے

جواباً لاعلمی کے واضح اظہار کی خاطر کندھے اچکا دیئے۔

''میرا خیال ہے ہمیں عیادت کو تو جانا ہی چاہیے۔ وہ اس گھر ایک ایک فرد کی مانند ہے۔''

''اگر تمھیں اس کی ایکٹیوٹیز کی بابت علم ہو تو عیادت بھی ایک شرمناک فعل محسوس ہوگا۔ ماہا ماما کی مجبوری ہے میری نہیں۔''

'ماما کی مجبوری.....؟ میرا خیال ہے وہ ماما سے خاصی محبت کرتی ہیں۔''

''محبت کرتی نہیں ہیں' محبت کرنے کی اداکاری میں ان کا ذاتی مفاد پوشیدہ ہے' خیر جانے دو چائے پلواؤ۔'' وہ بیڈ پر نیم دراز ہو کر سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر لیٹ گئے۔ نازش ان کے پیروں کے نزدیک بیٹھ کر جوتے اتارنے لگی تو وہ سرعت سے پیر سمیٹ کر اٹھ بیٹھے۔

''کیا شرارت ہے؟'' وہ تیز نظروں اور جارحانہ تیور سے پوچھنے لگے جبکہ وہ مبہم سا مسکرائی۔

''نہیں برکت ہے۔ مجھے آپ کی خدمت میں سکون ملتا ہے خوشی محسوس ہوتی ہے۔''

''تم بیوی ہو میری ملازمہ نہیں سنا تم نے' اور تمھاری جگہ میرے دل و جگر اور آنکھوں میں ہے۔ اب کبھی بھولے سے بھی میرے قدم نہ چھونا۔'' انھوں نے بازو سے پکڑ کر اسے اٹھایا اور اپنے نزدیک بٹھا لیا اور گہری گہری نظروں سے اسے تکنے لگے۔

''بھی تو کوئی فرمائش کر دیا کرو۔ کچھ تو کہا کرو' کوئی شکوہ شکایت یا لڑائی ہی سہی۔'' نازش کی نظریں متبسم ہوئیں مگر وہ خاموش ہی رہی۔

''تمھاری صورت میری ساری تھکن منٹوں میں رفع کر دیا کرتی ہے۔ سچ سرے سے فریش ہو جایا کرتا ہوں میں۔ اب فٹافٹ تیار ہو جاؤ آؤٹنگ کے لیے چلتے ہیں۔''

''مناسب نہیں ہے ان حالات میں' ماما کیا سوچیں گی؟'' وہ دھیرے سے بولی۔

''دوسروں کی فکروں میں جان گھلانے کا عارضہ کیوں ہے تمھیں؟ چلو خیر نہ سہی۔'' وہ دوبارہ پلٹ گئے بازو آنکھوں پر رکھ لیے۔

''خفا ہو گئے ہیں۔'' اس نے آہستہ سے اعظم کا کندھا ہلایا۔

''تو میں زندگی سے خفا ہو سکتا ہوں مگر تم سے نہیں۔'' وہ یونہی آنکھیں بند کیے کیے بولے۔

''آپ اتنی ہولناک باتیں کیوں کیا کرتے ہیں کبھی کبھی۔''

''پیار کی باتوں سے تم بھاگتی ہو۔ ہولناک باتوں سے دھل اٹھتی ہو' بندہ کہے تو کیا کہے۔ مجھے تو لگتا ہے میں نے مٹی کے مادھو سے شادی کر لی ہے یا پھر کوئی روبوٹ یس سر' یس سر کرنے والا' انکار کا لفظ تو تمھاری لغت میں درج ہی نہیں۔ دوسروں کو خوب خدمتوں کا عادی بنا ڈالو' بعد میں سر پر ہاتھ رکھ کر رونا' پچھتانا۔''

''خدمتوں کے سبب کوئی نہیں پچھتاتا' انسان کی قدر و قیمت بڑھتی ہے اسی وصف کی بدولت۔''

''کچھ لوگ ناقدر شناس بھی تو ہوا کرتے ہیں۔'' وہ آہستہ سے بولے۔ نازش جان گئی ان کا اشارہ کس جانب ہے۔

''تو کیا ہوا خدمتوں کا انعام ستائشی نہیں ہوا کرتا ہے۔ خدمت میں تو اپنی تسکین پنہاں ہوا کرتی ہے۔''

اسی لیے تو دادی جان ہر پل، ہر آن یاد کیا کرتی ہیں آپ کو، بھابی صاحبہ ان کی تمام ستائشیں، تشکین سمیٹ کر آپ یہاں بیٹھی ہیں۔ وہ بیچاری بے کل و بے قرار ہر دم آپ کا ورد کیا کرتی ہیں۔'' معظم نے کمرے میں داخل ہو کر اس کا جملہ اچکا تھا۔ مگر اسے پیغام پہنچانا بھی مقصود تھا۔ کیسی کٹھور ہیں آپ؟ دل نہیں ہمکتا نئے جانے کو، نئی نئی شادی ہے، لڑکیوں کا ایک قدم میکے اور اگلا سسرال میں ہوا کرتا ہے۔''

''تم ہو تو سہی پیغام رسانی کے فرض انجام دینے والے کبوتر، اور تمھارے ہی توسط سے سب کی خیریت بھی موصول ہو ہی جاتی ہے۔''

''اور آپ کی چاندسی صورت سے دیدار کی کمی کون بد بخت پوری کرے گا۔'' ہر توجیہہ کا ٹھوس جواب تو اس کی جیب میں رہا کرتا تھا۔

''بد بخت نہیں خوش بخت، اور وہ خوش بخت مابدولت ہیں۔ اگر فرمائش کریں تو ابھی سر کے بل لے کر جانے کو تیار ہوں میں۔'' اعظم حیات خوش دلی سے مسکرائے۔

''جی ہاں اور وہ اس لیے کہ آپ خوب جانتے ہیں، فرمائش کو حرام کے زمرے میں رکھا کرتی ہیں آپ کی بیگم صاحبہ۔''

''خیر جانے دیجیے کل صبح میں آفس جاتے ہوئے نازش کو ڈراپ کرتا جاؤں گا۔''

''آپ کیوں زحمت کرتے ہیں بھیا، اپنی امانت مجھے سونپ دیجیے سیر و چشم پہنچا آؤں گا منزل مقصود تک۔''

''تم ہمہ وقت وہاں جانے کو کیوں تیار رہا کرتے ہو، سسرال میری ہے۔ تمھارا طعام و قیام تو مجھ سے بھی زیادہ ادھر رہا کرتا ہے۔'' اعظم نے آہستہ سے اس کا کان کھینچا تو وہ چور سا بن گیا مگر اگلے ہی پل بات سنبھالی۔

''جانتا ہوں ناں مصروف بندے ہیں آپ، آپ کی کمی پوری کیا کرتا ہوں۔'' اس نے احمقانہ سی توجیہہ پیش کرتے ہوئے نازش کا دزدیدہ نظروں سے جائزہ لیا جو حسب عادت مسکرا رہی تھی۔

''نو تھینک یو ویری مچ، میرے فرائض مجھے ہی ادا کرنے دیا کرو۔''

''او کے تو پھر کل انھیں پہنچانے کا فریضہ آپ انجام دے لیجیے گا، جبکہ لوٹانے کے فرائض میں ادا کروں گا۔'' وہ ایک بار پھر مصر ہوا تو اعظم نے بھی مزید تکار مناسب نہ سمجھی۔

☆☆☆

دادی جان دیر تک نازش کو ساتھ لگائے بیٹھی رہیں۔ الفت بانو اسے دنوں بعد دیکھ کر نہال ہو اٹھی تھیں لہذا خوش دلی سے مسکرا رہی تھیں۔ اور تو اور سحرش نے بھی نازش کی آمد کی خوشی میں کالج سے چھٹی مار لی۔

''میری بچی کمزور ہو گئی ہے۔ رنگ کیسا زرد پڑ گیا ہے۔'' وہ اس کا چہرہ ہاتھ میں لے کر بطور خاص معائنہ کرنے لگیں۔

''بلوبیس کا کمال ہے دادی جان۔'' سحرش نے ٹکڑا لگایا۔

''ہائیں وہ موا کیا ہوتا ہے؟'' وہ چشمہ درست کر کے پھر سے اسے تکنے لگیں۔

''دادی جان پیلے رنگ کا پاؤڈر' جو زرش آپا بھی لگائی ہیں اسفنج نچوڑ کر۔''
''اچھا..... اچھا۔'' انھیں فی الفور سمجھ میں آ گیا مثال ہی اتنی جاندار تھی۔
''اے خدا نظر بد سے بچائے نئی نویلی دلہن ہے میری بچی۔ سولہ سنگھار کرتی ہی بھلی لگتی ہیں دلہنا اور بیٹی کپڑے ایسے سادے سے کیوں پہن رکھے ہیں؟'' لان کا تھری پیس خوش رنگ سوٹ بھی انھیں نہ بھایا۔
''دادی جان گرمی ہی اتنی ہے۔ دل گھبراتا ہے ریشمی کپڑوں میں۔''
''اے لو خدا کی مار' موئی گرمی کیا کاٹ کھانے کو دوڑ رہی ہے۔ دن ہی کتنے گزرے ہیں تمھاری شادی کو' بھلے وقتوں میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سالوں دلہن بن کر رہتی تھیں عورتیں' دو دو تین بچے گود میں آ جاتے تھے مگر جھومر ٹیکہ نہ اترتا ہے' موئی آج کی لڑکیوں میں نزاکت بھی بہت ہے۔'' نازش کو دادی جان سے ایسے ہی اعتراض کی توقع تھی سو وہ اعتظام بھی کر آئی تھیں۔
''دادی جان خوب بھاری کامدار جوڑا رکھ کر لائی ہوں' وہی دھنک کے نفیس کام والا زرد جوڑا شام میں ضرور پہن لوں گی بس اب خوش۔''
''اے تو سارا دن گزار شام کو کیا' دیواروں کو دکھاؤ گی؟ اچھا اعظم بچہ آئے گا مگر یہ گیا کہاں گھر میں کیوں نہ آیا باہر سے تمھیں رستہ دکھا کر چلتا بنا۔''
''دادی جان آفس جانا تھا انھیں تاخیر ہو رہی تھی شام کو شاید آ جائیں۔''
''شاید کیوں؟ یقیناً کیوں نہ آئیں گے آپا کیا رہنے کے لیے آئی ہیں؟''
''نہیں چند اٹھہرنا کہاں ممکن ہے گھر۔''
''ہاہ..... جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں شادی کو گھر کو سوار کر لیا آپا نے سر پر۔''
''سحر چلو تم کچن میں جاؤ' بات سے بات نکالتی ہو۔ اعتراض پر اعتراض کرتی ہو' برتن سمیٹو ناشتے کے' شنو آئی ہوگی۔''
''یہ شنو کیا مخلوق ہے؟'' نازش نے استفہامیہ نظروں سے انھیں دیکھا۔
''ملازمہ رکھی ہے گھر کے کام کاج کے لیے' بی بی اب تمھارے جیسے عیش ہر کوئی تو ہمیں کروانے سے رہا۔ چارپائی تلے قدم نہ رکھنے دیتی تھیں تم ہمیں۔ ایک نے آفس سنبھال رکھا ہے دوسری نے کالج۔ تمھاری ماں ہوں یا میں اب ہماری ہڈیوں میں اتنا دم کہاں؟''
''مگر دادی جان بجٹ فیل نہ ہو جائے گا۔ بھلا ملازمہ کی تنخواہ کیسے دی جائے گی؟''
''وہ ہیں تو سہی زرش بی بی' انہی کی بھرپور شہہ اور حمایت پر قدم رکھا ہے ملازمہ نے گھر پر' وہی خرچ بھی اٹھائیں گی۔'' دادی جان کا منہ کڑوا ہوا جاتا تھا' ملازمہ کے تذکرے پر۔
''زرش کب لوٹتی ہے آفس سے..... دادی جان؟''
''چھوٹی آپا کے لوٹنے کا کوئی وقت مقرر تھوڑی ہے آپا۔ ایک روز تو رات کے نو بجے گئے تھے۔''
''پھر فضول بولیں تم۔ دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔ بچی دفتر کھنگالتی ہے سو کام ہوتے ہیں یونہی تھوڑی کوئی مٹھی بھر کر پیسے پکڑا دیتا ہے۔ بس فضول منہ بھر کر بولنا۔ اپنے کام سے کام رکھا کرو سمجھے۔'' الفت بانو نے دوبارہ اسے پھٹکارا تھا۔ وہ برا سا منہ بنا کر کچن میں گھس گئی۔

☆☆☆

شام میں اچھی خاصی رونق ہو گئی۔ دادی جان نے اعظم کے آنے کی امید میں رات کے کھانے پر خاصا اہتمام کروا رکھا تھا۔ سحرش نے زرش کے دفتر فون کھڑکا کر اسے نازش کی آمد کی نوید دی تھی۔ لہذا وہ وقت پر لوٹ آئی تھی۔ کچھ وقت گزرا سارم بھی آ گیا۔ بعدازاں معظم بھی۔ دادی جان نہال ہی تو ہو اٹھیں۔ البتہ اعظم کے نہ آنے سے بجھ سی گئیں۔
''لگتا ہے تھا جس کا انتظار وہ شاہکار نہیں آیا۔'' معظم نے بطور خاص نازش کو دیکھا تھا۔
''نہیں بلکہ تھا جس کا انتظار وہی شاہکار آیا ہے۔'' سارم کی نظروں نے سحر کے لبوں کی دھیمی مسکراہٹ اور نظروں کی غیر معمولی جگمگاہٹ کو فٹ سے تاڑ لیا۔ وہ غڑاپ سے کچن میں گھسی تھی اور اس کے ہر اٹھتے قدم کے ساتھ سفر کرتی معظم کی نظروں سے سارم کی ڈھیروں ڈھیر ادراک بخش دیئے وہ شانت سے ہو گئے۔
''تو یہ کارروائی چل رہی ہے چپکے چپکے۔'' اس نے معظم کا کان پکڑ لیا۔ نازش دادی جان کا باندان کرید رہی تھی۔ دادی جان ہونقوں کی مانند انھیں ہی دیکھ رہی تھیں۔ معظم نے چپکے سے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

بڑا مزہ ہو کہ محشر میں ہم کریں شکوہ
وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کے لیے

سارم نے مزید مزہ لیا۔
''پٹواؤ گے کیا یار؟'' معظم اتنا خوفزدہ تھا نہیں جتنا پوز کر رہا تھا۔
''عشق میں تو مجنوں میاں لیلیٰ کے کتے سے بھی گلے ملے تھے۔'' اسے شوخی سوجھ رہی تھی۔
''اس کے لیے تو میں بھی تیار ہوں' مگر سمجھا کرو معاملہ ریپوٹیشن کا ہے۔''
''یہ تو دل لگانے سے پہلے سوچنا تھا ناں۔''
''ہائے یہ کم بخت دل ہی تو بس میں نہیں۔ جب قابو سے باہر ہوتا ہے تو سب سے پہلے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کر لیا کرتا ہے۔'' اور اس معاملے کو سارم سے بڑھ کر کون سمجھ سکتا تھا۔
''فارم سب مٹ ہو گئے؟'' زرش تنتناتی ہوئی آئی تھی اور جانے کیوں اسے یوں منہ پھوڑ کر تو دی پوائنٹ بات کرنا اچھا نہ لگا۔ لہذا خاموشی سے رسید نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔
''یونیورسٹی کا کام تھا تو مجھ سے کہنا تھا' چٹکیوں میں کروا دیتا۔''
''یہی تو مسئلہ ہے ان کا' غیروں سے کہتی اور غیروں سے سنا کرتی ہیں یہ' کاش کہ کچھ آپ ہی سے کہہ سن لیا ہوتا۔'' سحرش چائے کے کپ سجائے ٹرے اٹھائے چلی آ رہی تھی۔
''ہائی دی وے یہ آپ نے غیروں میں شمار کس کا کیا؟'' سارم نے کڑی نظروں سے اسے دیکھا۔
''میرے دل کے بہلانے کو تو اتنا ہی کافی ہے کہ اپنوں کے صیغے میں میرا استعمال ہوا ہے۔'' معظم کی باچھیں پھیل گئیں۔
''دنیا میں بہلاوے نہ ہوتے تو خوش فہم بھلا کیسے جیتے۔'' سحر کو ایک نیا تفکر لاحق ہوا۔
''بہلاوے نہ ہوتے بہلاوے عطا کرنے والے بھی نہ ہوتے' اب سوچیے تو ذرا پھر ہم کیسے

جیتے۔'' معظم اس بار سب کی موجودگی نظر انداز کر گیا۔ سحر سٹپٹا کر مڑ گئی۔

☆☆☆

''بہت بڑا رسک تھا یہ..... آپ کی ہمتوں اور حوصلوں کی داد دینی پڑتی ہے۔ یائی دی وے آپ کے بیٹے کو خبر ہے اس معاملے کی بیگم آغا؟'' ڈاکٹر شازیہ آج ان کی کھنچائی پر تلی تھی۔

''نہیں..... جی..... وہ..... ہاں..... دراصل اسی کے ایماء پر تو یہ قدم اٹھانا پڑا۔''

''کمال ہے..... پہلا بچہ..... اور یہ نقصان..... اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو آپ کی بہو کی ذہنی حالت بھی مجھے کچھ درست معلوم نہیں ہوتی۔'' انھوں نے جواباً خاموشی ہی میں عافیت جانی۔

''اینی وے دو چار روز مزید انھیں اسپشل ٹریٹمنٹ کی ضرورت رہے گی' یونو ویک نیس تو پہلے بھی زیادہ ہی تھی۔''

''جب تک آپ چاہیں ڈاکٹر۔'' وہ اب اپنے آپ کو خاصا ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر کے میز پر رکھا انٹرکام بجا تھا اور وہ ایکسکیوز کر کے اٹھ گئی۔ انھوں نے ایک گہری سانس لے کر سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ ایسا ایک بار نہیں بارہا ہوا تھا جب ان کی خواہشات سرکشی پر تل گئیں۔ وہ ہمیشہ ہی سے پیسے کو اپنا دین و ایمان سمجھا کرتی تھیں۔ رضوان حیات سے شادی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ انھیں اپنے بے پناہ حسن کا بھرپور ادراک تھا اور اسی حسن کو ہتھیار بنا کر انھوں نے رضوان حیات کے گلے میں زنجیر ڈالی تھی۔ وگرنہ کیا تھیں وہ ایک معمولی اسٹیوگرافر۔ اگر آج وہیں رہتی تو کسی عام سے گھر میں عام سی ذہنیت والے مرد کے ہمراہ چار چھ بچے پیدا کر کے ان کی پرورش کر کے اپنا آپ مار رہی ہوتیں۔ اپنی زندگی ان کے روشن مستقبل کے لیے داؤ پر لگائے بیٹھی ہوتیں۔

انھیں شکست کا سامنا بہت کم کرنا پڑا اور جب بھی کرنا پڑا انھوں نے اس شکست کو پچھاڑ کر کامیابی کا دامن تھام لیا۔ رضوان حیات کے والدین کے حلق میں انگلیاں ڈال کر اپنا حصہ بٹورا۔ کیا ہوا جو رشتوں سے دوری کا خسارہ بھگتنا پڑا۔ رشتوں' جذباتیت' محبت جیسے بے مول جذبوں کو وہ خاطر میں کب لایا کوتی تھیں۔ وہ آج ان سالوں سے کوسوں دور کھڑی ایک بار پھر اپنے آپ سے برسرپیکار تھیں مگر ماہا کی صورت میں ایک اور شکست آج بھی ان کے سامنے کھڑی تھی۔ ان کی جیتی جاگتی شکست' جسے ہر آن جیت میں بدلنے کی سعی میں تھک کر رہ گئیں مگر ناامید نہ ہو پاتیں۔ آج بھی ان کی امیدوں کا سورج پوری آب و تاب کے ساتھ روشن تھا۔ ماہا کی صورت میں۔

وہ تھکے تھکے قدموں سے ڈاکٹر کے روم سے اٹھ کر جنرل وارڈ کے سامنے بنے پرائیویٹ روم کے ایک بند دروازے کو کھول کر اندر داخل ہو گئیں۔ جہاں ماہا مسکن دواؤں کے زیر اثر دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ڈرپ انجکٹ تھی۔ جبکہ چہرہ دھلے لٹھے کی مانند سفید تر تھا۔ ان کا دل چاہا پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ ماہا کی حالت سے زیادہ اپنی شکست کا احساس سوا تر ہو چلا تھا۔

باقی آئندہ

☆☆☆

آؤ دیا جلائیں

فوزیہ غزل

بیگم حمدانی ان دنوں خاصی مصروف تھیں۔ ہر روز وہ کہیں نہ کہیں مدعو ہوتیں۔ یہ فنکشن اور ڈنر پارٹیز تو اگرچہ پہلے بھی ہوتی تھیں لیکن اب ان کی اہمیت یوں بڑھ گئی تھی کہ مسز حمدانی کا اکلوتا منظور نظر چند دنوں بعد لندن سے آئی ٹی۔آر میں ماسٹرز کر کے وطن واپس آ رہا تھا۔ اس کے حسن ذہانت' قابلیت کے ساتھ کروڑوں کی جائیداد کے اکلوتا وارث ہونے کی تمام رپورٹس شہر کے سوشل سرکل میں آؤٹ ہو چکی تھیں۔ اب شہر کے ہر بڑے گھر کی یہ خواہش تھی کہ وہ بیگم حمدانی کو ان کے بیٹے کی آمد سے قبل ہی اپنے اخلاق و محبت کے مظاہروں سے رام کر لیں۔

(ظاہر ہے بھئی ان لوگوں کو اپنی بیٹیوں کا مستقبل بہت روشن نظر آ رہا تھا) اور جب بیٹے کے لیے بہو کا انتخاب ہو تو مسز حمدانی کی پہلی نظر ان کی صاحبزادی پر ہی ٹھہرے۔ لوگ اسی سلسلے میں بڑھ چڑھ کر انھیں اپنے اپنے ہاں مدعو کر رہے تھے اور مسز حمدانی ان پارٹیز کا درپردہ مقصد سمجھتے ہوئے بظاہر انجان بنی رنگ برنگے کھانوں اور لوگوں کے مطلبی رویوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

انتظار کے لمحات ختم ہوئے اور بیگم حمدانی کا اکلوتا بیٹا اسد حمدانی ہفتہ کی شام کو رات دس بجے کی فلائٹ سے پاکستان پہنچ چکا تھا۔ مسٹر ایزد حمدانی اور بیگم زرمینہ حمدانی کی خوشی و سرشاری دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ اپنے وسیع ڈرائنگ روم میں بیٹھے مصروف گفتگو تھے۔ جبکہ اردگرد سجے مختلف ممالک سے خریدے گئے انواع و اقسام کے قیمتی نوادرات اور ڈیکوریشن پیسز مکینوں کی خوش ذوقی و امارت کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ کامیاب مستقبل کی چمک سے دمکتا اسد حمدانی کا روشن چہرہ ماں باپ کو بنی توانائیاں بخش رہا تھا۔

''امی آپ نے مہرو پھپھو کی فیملی کو میرے آنے کے بارے میں نہیں بتایا؟'' اسد کو اچانک یاد آیا۔

''ارے بیٹا مجھے یاد ہی نہیں رہا ویسے بھی اب سبھی ملنے جلنے والوں کو تمھارے آنے کی خوشی میں زبردست سی پارٹی دوں گی تو پھر مہر النساء کو ضرور بلاؤں گی۔''

''لیکن ماما وہ میری اکلوتی پھپھو ہیں اس موقع پر تو انھیں ضرور بلانا چاہیے تھا کیوں پاپا؟'' اس نے رائے چاہی تو وہ طنزیہ نظروں سے اپنی بیگم کو دیکھنے لگے جو اسی دوران اٹھ کر کئی بار فون کالز ریسیو کر چکی تھیں۔ جو ان کے سرکل سے تعلق رکھنے والی خواتین اسد حمدانی کی آمد پر مبارک اور انویٹیشن کے سلسلے میں کر رہی تھیں اور وہ مسکرا کر مبارکیں وصول کرتے ہوئے دعوتوں سے معذرت کر رہی تھیں کہ ابھی وہ ایک ماہ اپنے بیٹے کے ساتھ وقت گزارنا چاہتی تھیں بھرپور خوشیوں سے لبریز۔ گویا کہ ابھی اس موقف پر عمل پیرا تھیں کہ ''بڑھنے دو آتش شوق کچھ اور۔''

مسٹر اینڈ مسز ممتاز اور مسٹر اینڈ مسز انوار یہ وہ دو فیملیز تھیں جو اسد حمدانی کا پرپوزل حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے حریصانہ کشمکش میں مبتلا تھیں۔ اتفاق سے دونوں کی بیٹیاں کلاس فیلو تھیں شکل و صورت کے حوالے سے بھی ٹھیک ٹھاک تھیں۔ کچھ خوشحالی کی چمک تھی جو انھیں لاکھوں میں ایک بنا کر پیش کر رہی تھی۔ صاحبزادیوں کے ساتھ ساتھ مائیں بھی اب جان توڑ کوششوں میں مصروف تھیں کہ بس اسد حمدانی کی نظر انتخاب کا مرکز صرف ان کی بیٹی ٹھہرے۔

اسد کو آئے کافی دن ہو چکے تھے اور دوستوں راہ و رسم رکھنے والے سبھی عزیز و احباب سے وہ روز ملتا رہتا۔ اس کی دعوت کے سلسلے میں مسٹر ممتاز اور ان کی مسز صفیہ ممتاز اپنی تیز و طرار بیٹی ساشا کے ہمراہ حمدانی ہاؤس پہنچے۔ ان کی آمد

سے چند لمحے قبل ہی اسد اپنے پھپھوزاد وسیم کے ہمراہ نکلا تھا۔ سو وہ آ کر خاصے مایوس تو ہوئے مگر ان لوگوں کو انوائٹ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ واپسی پر ابھی وہ کچھ دور آئے تھے کہ ان کی کار کے پاس سے بلیک کرولا زن سے گزری۔ شمسہ انوار کو اپنی فیملی سمیت بیٹھے دیکھ کر مسز صفیہ ممتاز کے ماتھے پر کئی ناگوار بل پڑ گئے۔

''کیسی دشمن ہے یہ شمسہ تو میری مگر منہ کی کھائے گی۔ بھلا میری ساشا کے سامنے اس کی کسی بیٹی کی دال گل سکتی ہے۔'' ان کے چہرے پر بڑی حاسدانہ سی چمک تھی۔

اب اسے شمسہ بیگم کی خوش قسمتی ہی کہہ سکتے ہیں کہ ان کے آنے کے آدھ گھنٹہ بعد ہی اسد حمدانی آ گئے اور سیدھے ڈرائنگ روم کی طرف ہی آئے تھے۔ سو براہ راست ملاقات نے ان کو خوشی کو دیا۔

''اسد حمدانی تو اپنی تعریفوں سے بڑھ کر ہے کیسا بانکا سجیلا جوان ہے کیا بھرپور مردانہ شخصیت ہے۔'' مسز انوار کی بڑی بیٹی شہلا نے بے باکی سے اسے تاڑتے ہوئے چھوٹی بہن سدرہ سے سرگوشی کی جو خود بھی اسد حمدانی کو بڑے متاثرانہ انداز سے دیکھ رہی تھی۔ اسے اسد حمدانی اپنا فیورٹ ہیرو شاہ رخ نظر آ رہا تھا جسے دیکھتے ہی اسے وہ فلم بھی یاد آ گئی۔ جس میں شاہ رخ خان اسٹیٹس سے تعلیم حاصل کر کے آتا ہے تو ایک سچویشن میں اس کی ملاقات فلم کی ہیروئن سے ہوتی ہے اور وہ پہلی نظر میں دل ہار دیتا ہے۔ وہ اسی سچویشن کے مطابق خود کو مزید خوابوں کے ہنڈولے میں جھولنا چاہتی تھی کہ شمسہ بیگم نے اسے سامنے متوجہ کیا جہاں مسز حمدانی انھیں اپنے بیٹے سے متعارف کروا رہی تھیں۔

انوار صاحب اور ایزد حمدانی تو بزنس سے متعلق گفتگو میں مگن تھے اور بیگم شمسہ زرمینہ حمدانی کو اپنی لچھے دار گفتگو میں گھیرے ہوئے تھیں جبکہ اسد ان کی بیٹیوں سے تعلیمی و سماجی رجحانات سے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ شہلا بہت کھل کر اور ماڈ انداز میں محو گفتگو تھی۔ سدرہ بس یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اب اسے اچھا خاصا افسوس ہو رہا تھا کہ وہ پہلے کبھی مسز حمدانی کے گھر کیوں نہیں آئی ورنہ اب تک ان سے اچھی خاصی میل جول بڑھانے میں کامیاب ہو چکی ہوتی۔ جواب اسد حمدانی کو قریب لانے کا ذریعہ بنتی۔

''خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا میں تھوڑی سی کوشش سے اس زبردست بندے کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہوں۔'' اسے اپنے حسن پر خاصا بھروسا تھا سو وہ سوچ کر ہلکی پھلکی ہو گئی۔ اور ادھر متوجہ ہو گئی کہ بیگم رزمینہ اور اس کی والدہ زیورات کے نئے ڈیزائن کے متعلق گفتگو کر رہی تھی۔

جبکہ دوسری طرف مسز صفیہ اور ساشا جلے پیر کی بلی کی طرح مسلسل بل کھا رہی تھیں۔ انھیں مسز حمدانی کے گھر سے آئے دو گھنٹے سے اوپر ہو گئے اور وہاں سے آنے کے بعد وہ کوئی دسویں مرتبہ شمسہ بیگم کے گھر فون کھڑکا چکی تھیں جہاں سے یہی جواب مل رہا تھا کہ وہ لوگ ابھی حمدانی ہاؤس سے واپس نہیں آئے۔

''اتنی دیر چپک کے بیٹھتی ہیں ڈھیٹوں کی طرح ساری فیملی ایک جیسی ہے ہم ڈیڑھ گھنٹہ بمشکل بیٹھے تھے اور یہ تین گھنٹے سے وہیں ہیں۔'' صفیہ بیگم بڑبڑانے لگیں۔ ساشا کی حالت بھی ان سے مختلف نہ تھی۔ وہ بھی اپنے کمرے میں بار بار موبائل سے شہلا سے کونیکٹ کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور ناکام ہونے پر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

واپسی پر شہلا بہت زیادہ خوش نظر آ رہی تھی اسے پورا یقین تھا کہ اس اسے پلس پوائنٹ دے چکا ہے۔ پرے چار گھنٹے بعد گھر پہنچ کر اس نے سی ایل آئی چیک کی تو ساشا کے گھر کا نمبر دیکھ کر ایک کمینی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر گئی اور

اس نے ان کے گھر کا نمبر ملایا۔

''کہاں تھیں تم؟ میں کب سے تمھیں کال کرنے کی کوشش کر رہی ہوں مگر چار گھنٹے سے تمھارا موبائل آف ہے۔'' ساشا نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''آج کچھ قریبی عزیزوں سے میل ملاقات کا موڈ بن گیا تھا سو خاصا ٹائم لگا۔''

''ارے مسز حمدانی اس کم بخت کے عزیزوں میں کب سے شامل ہو گئیں۔'' اس نے دل میں کہا۔

''آخر ایسے کون سے عزیز تھے کہ جن سے ملاقات نے موبائل چیک کرنے کی اجازت نہ دی۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

''میرے کزن ہیں یار لندن سے آئے ہیں۔ ان سے ہی ملنے گئے تھے۔ پرسوں دعوت ہے ان کی ہمارے گھر۔''

''کرتے کیا ہیں؟'' ساشا نے کریدا۔

''کچھ نہ کریں تو بھی زندگی آرام سے گزر سکتی ہے کہ آخر موصوف اکلوتے وارث ہیں کروڑوں کی جائیداد کے۔'' وہ چمک کو بولی۔

''ہم لوگ مسز حمدانی کے گھر گئے تھے وہاں سے ہماری گاڑی کے نکلنے کے چند لمحوں بعد تم لوگوں کی کار اندر داخل ہوئی تھی جبکہ تم کہہ رہی ہو کہ تم اپنے کزن کے ہاں گئی تھیں۔ ساشا سے صبر نہ ہوا تو خود ہی بھانڈا پھوڑ دیا۔

''ہاں تو مسز حمدانی میری امی کی ڈوپٹہ بدل بہن ہیں تو پھر اسد میرے کزن نہ ہوئے۔'' انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہو اسد میرے بجن نہ ہوئے۔

''اللہ کرے خاک پڑے تمھارے منہ پر اور پھٹکار برسے تمھارے چہرے پر۔'' اس نے پھنکارتے ہوئے موبائل کو گھورا جیسے شہلا اس میں نظر آ رہی ہو۔

ادھر اسد اپنے والدین کے ساتھ متعلقہ فیملیز کے علاوہ دیگر لوگوں کی دعوتیں بھی اٹینڈ کر چکا تھا۔ زرینہ حمدانی اسے خالص کاروباری نقطۂ نظر کے حوالے سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ایسی بہو منتخب کرنا چاہتی تھیں جو اسد کی طرح اکلوتی ہونے کے ساتھ ماڈ اور بے انتہا بینک بیلنس کی مالک ہو۔ جسے اپنے خاندان میں شامل کرنے سے ان کا اسٹیٹس سمبل مزید ہائی ہو جائے۔ ایزد حمدانی کی سوچ یکسر مختلف تھی وہ اس روز روز کے ڈرامے سے خاصے عاجز آ چکے تھے اور زرینہ کو سخت الفاظ میں ٹوک چکے تھے کہ کوئی لڑکی جلدی سے منتخب کر لو تاکہ یہ ہر روز دعوتوں کے سلسلے میں جو ٹائم ضائع ہوتا ہے اس کی بچت ہو سکے۔'' وہ یہ بھی کہہ چکے تھے۔

''ذرا اپنے سے کم لیول لوگوں سے بھی ملو مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں زیادہ سلیقہ شعار اور پرخلوص ہوتی ہیں۔'' زرینہ حمدانی نے ان کا مشورہ سختی سے رد کر دیا۔ اور صاف الفاظ میں باور کرایا دیا تھا۔

''ہمیں اپنے لیول سے کم اور نچلے خاندان سے لڑکی نہیں دیکھنی ہے۔ میرے اتنے کوالیفائیڈ اور خوبرو بیٹے کے لیے کیا ایسی معمولی لڑکیاں رہ گئی ہیں۔ ہرگز نہیں ایزد حمدانی تم دیکھنا میں ایسی لڑکی کو بہو بناؤں گی جس کا حسن' دولت اور خاندانی بلندی ممتاز کر دے گی ہمیں اپنے سرکل میں۔'' وہ غرور و نخوت سے گردن اکڑا کر بولیں۔

ایزد حمدانی کی اکلوتی بہن مہر النساء اپنے بیٹے کے ہمراہ چلی آئیں۔ انھیں خصوصی دعوت دینے۔ ان کی بڑی بیٹی نمیرہ کا ایک رشتہ آیا ہوا تھا اور وہ لوگ چند دنوں تک جواب چاہتے تھے۔ اسی لیے وہ بھائی بھاوج کو دعوت دینے آئی تھیں کہ وہ لوگ اچھی طرح دیکھ کر رائے دیں تاکہ وہ بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو سکیں۔ انھوں نے فوراً حامی بھر لی تھی۔

مہر النساء کی چار بیٹیاں اور بیٹا ایک ہی تھا۔ ان کے شوہر ایک دن آفس سے گھر آتے ہوئے روڈ ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو چکے تھے۔ شوہر کے انتقال کے وقت بچے چھوٹے تھے اور مہر النساء قانونی معاملات سے لاعلم۔ ایزد حمدانی ان دنوں کاروباری سیمینارز کے سلسلے میں کوریا گئے ہوئے تھے۔ ان کی واپسی تک مہر النساء کے سسرال والے تمام کاروبار پر قابض ہو گئے۔

ایزد حمدانی کو بہن اور اس کے بچوں پر ہونے والی ناانصافی پر سخت طیش آیا اور وہ یہ معاملے عدالت میں لے گئے۔ تاہم وہ لوگ اتنی چالاکی سے سب کچھ کر چکے تھے کہ وہ لوگ حق پر ہوتے ہوئے بھی مقدمہ ہار گئے۔ اس کے بعد ایزد حمدانی نے بہت چاہا مہر النساء ان کے پاس رہے مگر وہ انکار کر کے اپنی ایم۔اے کی ڈگری کام میں لاتے ہوئے ایک اچھے سکول میں ملازمت کرنے لگیں۔ بھائی نے ان کے حصے میں آنے والی رقم سے انھیں اچھے علاقے میں خوبصورت سا گھر لے دیا۔ بچوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت کے ساتھ تعلیم و اچھا ماحول فراہم کرتے کرتے ان کی زندگی بڑے کٹھن حالات سے گزری۔

اب تو وسیم ایک پرائیویٹ فرم میں بطور انجینئر اپنے کیریئر کا آغاز کر چکا تھا۔ اسے انھوں نے اپنی کولیگ کی بیٹی سے انگیج کر دیا تھا۔ نمیرہ ایم۔اے کر کے فارغ تھی اور عاصمہ بی ایس سی کر رہی تھی۔ انعم ایف۔اے اور زارا میٹرک میں تھی۔

ایزد حمدانی اور زرینہ بیگم اکثر مہر النساء کے گھر آتے رہتے تھے اور زرینہ انھیں موسم کے لحاظ سے کپڑے وغیرہ لے کر دیتیں۔ ان کا انداز اس قدر محبت بھرا اور پرخلوص ہوتا کہ مہر النساء انکار کرنے کے باوجود ان کی محبتوں کی پذیرائی پر مجبور ہو جاتیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ زرینہ بیگم کو اپنی نند کی جوان خوبصورت اور سگھڑ لڑکیاں کبھی نظر نہ آئیں یا دھیان اس طرف گیا بھی ہوگا تو انھوں نے ظاہر نہیں کیا۔

صبح کے دس بجے رہے تھے جب حمدانی فیملی کی سیاہ مرسڈیز مہر النساء کے دروازے پر رکی اور زرینہ بیگم اترتے ہی حیرت کا شکار ہو گئیں۔ اس مرتبہ وہ تقریباً دو ماہ بعد آئی تھیں اور اس عرصے میں مہر النساء کے گھر میں خاصی تبدیلیاں نظر آ رہی تھیں۔ دروازوں کھڑکیوں پر نئے پینٹ کے ساتھ قیمتی کپڑے کے پردے لٹک رہے تھے اور صحن میں نئی نکور موٹر بائیک کھڑی تھی جو شاید وسیم نے لی تھی۔ نمیرہ' عاصمہ' انعم اور زارا صحن میں کپڑے پھیلائے بیٹھی تھیں انھیں دیکھتے ہی لپک کر آ گئیں۔

''شکر ہے ممانی آپ آئیں تو۔'' عاصمہ نے ان سے گلے مل کر شکوہ آمیز انداز میں کہا۔

''ہاں میں تو آ گئی تم لوگوں سے تو کبھی اتنا بھی نہ ہوا کہ کالج سے آتے جاتے ہی چکر لگا لیں۔'' زرینہ بیگم جیسی بھی تھی لیکن وہ اپنی نند اور اس کے بچوں سے واقعی انسیت رکھتی تھیں کبھی تو عاصمہ کو ساتھ لپٹاتے ہوئے شکوہ کے جواب میں شکوہ کیا۔

''ممانی اسٹڈیز اتنی ٹف ہوتی ہے کہ ٹائم نکالنا مشکل ہوتا ہے۔'' عاصمہ نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا اور نمیرہ کے ساتھ خاطر تواضع کرنے کو کچن کا رخ کیا۔

اسد چونکہ پہلے بھی کئی بار وسیم یا اپنے والد کے ساتھ چکر لگا چکا تھا اور ویسے بھی بچپن سے وہ اپنے کزنز اور پھپھو سے بہت اٹیچ رہا تھا۔ سو بڑے ریلیکس انداز سے مہر النساء کی گود میں سر رکھے ان سے باتیں کر رہا تھا۔ انعم' زارا اور وسیم نے آ کر دلچسپ باتوں سے ماحول بہت خوشگوار بنا دیا تھا۔

''زرینہ تم بتاؤ پھر کیا بنا' اسد کے لیے جو لڑکیاں دیکھی جارہی تھیں۔'' مہرالنساء نے بھابی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس مہرو دیکھ رہی ہوں لڑکیاں تو بہت ہیں اور ہمارے ملنے جلنے والے سبھی لوگ اچھے ہیں۔ مجھے تو کئی لڑکیاں اچھی لگی ہیں آخری فیصلہ پھر بھی اسد کو کرنا ہے جہاں یہ اشارہ کردے گا وہیں کر دوں گی آخر سب لڑکیاں ہمارے اسٹینڈرز کی ہیں۔''

اسی وقت آسمانی رنگ کا شیفون کا سوٹ پہنے عاصمہ چائے کے ساتھ دیگر لوازمات سجائے ٹرالی لے کر آ گئی۔ اور اسد کی پرشوق نگاہیں اس کے صبیح چہرے پر ٹھہر گئیں۔ بالوں کی لٹ کو کانوں کے پیچھے بار بار اڑستی چاندنی میں نہائی یہ لڑکی جانے کب اسد حمدانی کے دل کے در وا کر گئی تھی اور وہ جب بھی آتا بے خود سا اسے تکتا اور سوچتا۔

''امی کیا آپ کو اپنی نند کی یہ ہونہار اور ذہین لڑکیاں نظر نہیں آئیں۔ کیا ان میں ایک بھی رد کیے جانے کے قابل ہے اگر صرف دولت کو نکال دیا جائے تو خوبصورتی' تعلیم اور سلیقے ہر لحاظ سے مکمل ہیں۔ سب سے بڑھ کر جان لٹا دینے کی حد تک محبت کرنے والی اور پرخلوص۔''

دھیرے دھیرے ہنستی محتاط انداز سے بولتی مشرقی عاصمہ اس کی نظروں کے حصار میں قید تھی۔

''ایسی شریک زندگی کی تو آرزو ہے میری۔ میں پاپا سے ضرور اس سلسلے میں بات کروں گا۔'' اس نے دل میں مصمم ارادہ کرلیا۔

نمیرہ کے رشتے کے لیے آنے والے لوگ ایز حمدانی صاحب کے شناسا تھے اور لڑکا بھی ان کا دیکھا ہوا تھا۔ وہ بینک میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تھا۔ ان کی تصدیق و تسلی پر مہرالنساء نے ہاں کر دی۔ لڑکے کی دو بہنیں تھیں جو کہ میرڈ تھیں۔ دو بھائی بڑے وہ بھی شادی شدہ۔ دونوں کی بیویاں ساتھ آئیں تھیں۔ نہایت سلجھی ہوئی اور ہنس مکھ سی۔ مہرالنساء بات پکی کرنے کے بعد بہت پرسکون ہوگئیں۔ ایک بیٹی کا سہی مگر کچھ تو بھار سر کا تھا۔

واپسی پر راستے میں ایز حمدانی بہت چپ چپ رہے۔ ان کی آنکھیں اور چہرہ گہری سوچ کا غماز تھا۔ گھر آ کر بھی ان کا انداز ویسا ہی تھا۔

اگلے دن ناشتے کی ٹیبل پر انھوں نے گم صم بیٹھے ہوئے اسد کو بغور دیکھا۔ جس دن سے اسد نے اپنے دل کی بات بتائی تھی وہ اپنی بیگم کے معمولات و رویے کو جانچتے رہتے تھے اور اسد چونکہ والدہ کی اونچی عادات و خیالات سے بخوبی واقف تھا اس لیے اس کے خیال میں اسے کچھ نہ کچھ پھڈا پڑنے والا امکان تھا۔

''ہم کو بھی اب کوئی لڑکی فائنل کر لینی چاہیے اسد کے لیے۔'' زرینہ بیگم نے خود ہی بات چھیڑ دی۔

''ہوں..... کون سی لڑکی؟'' حمدانی صاحب نے چونک کر پوچھا۔

''قریشی صاحب کی بیٹی شبنم میرے دل کو بہت لگی ہے۔ ایک تو اکلوتی اور پھر قریشی صاحب کے کئی ملکوں میں پھیلے بزنس کی مالک۔ اربوں میں اس کا بینک بیلنس ہے۔'' وہ مکمل کاروباری انداز میں بولیں۔

''وہ چلتا پھرتا اشتہار جو لڑکی کم ماڈل گرل زیادہ نظر آتی ہے۔'' حمدانی صاحب نے فوراً نکتہ چینی کی۔

''آج کل سب لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں اور پھر ساشا اور شہلا بھی ہیں۔ ہمیں خاندانی حسب و نسب کے علاوہ دولت و مقام بھی تو دیکھنا چاہیے اور میں نے تو فیصلہ کرلیا ہے بس شبنم ہر لحاظ سے ٹھیک ہے۔''

''امی پلیز کبھی تو اس مادہ پرستی کے خول سے باہر نکل آیا کریں۔ مجھے بالکل بھی پسند نہیں

ہیں یہ ڈسکو طرز کی لڑکیاں جو آپ مجھے دکھاتی رہی ہیں۔ یہ صرف دیکھنے میں اچھی لگتی ہیں گھر بسانے میں یہ ون پرسنٹ بھی انٹرسٹڈ نہیں ہوتیں۔ ویسے بھی میری سوچ ذرا مختلف ہے مجھے تعلیم یافتہ، سلجھی ہوئی، ٹھہرے مزاج کی گھریلو لڑکیاں پسند ہیں جو شوہر کو بھی سکون دیں اور گھر کے ماحول کو بھی اپنے سلیقے سے مثالی بنا دیں۔ شہلا، ساشا، یا شبنم جیسی کسی پارہ صفت لڑکی سے شادی کر کے مجھ ذہنی مریض نہیں بننا۔'' اسد نے بڑے اچھے طریقے سے اپنے خیالات واضح کیے جن کو سن کر زرینہ بیگم کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''اتنی تقریر کی ہے تو یقیناً صاحبزادے نے کچھ سوچ رکھا ہوگا۔ کہیں یہ مہرالنساء کی بیٹیوں سے تو متاثر نہیں ہوگیا روز روز چکر یونہی تو نہیں لگتے اگر ایسا ہے تو صاحبزادے کے ہوش ٹھکانے لگانے پڑیں گے۔'' وہ تفکر سے سوچ رہی تھیں مگر اپنے اندر اٹھتے خدشات کو دباتے ہوئے بظاہر لاپرواہی سے پوچھا۔

''آج کل اتنی خوبیوں والی لڑکی کہاں ملے گی۔ اس طرح کی سگھڑ لڑکیاں اب نہیں ہوتیں مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ تم کئی سال لندن جیسے ماڈرن و ترقی یافتہ معاشرے میں گزار کر بھی خالص کنزرویٹو فیلنگز رکھتے ہو۔''

''ماما آپ کی شاید قریب کی نظر کمزور ہے لیکن یہ میری زندگی کا معاملہ ہے اور آئی ایم سوری کہ میں اپنے متعلق اتنی ہٹ دھرمی سے فیصلہ کرنے کا اختیار کسی کو نہیں دے سکتا۔ میں پاپا کو اپنی پسند سے آگاہ کر چکا ہوں۔ مجھے دولت نہیں ایک سمجھدار پرخلوص ہمسفر چاہیے۔ آئی تھنک کہ باقی تفصیل آپ کو پاپا بتا دیں گے۔''

وہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تو زرینہ بیگم نے تیز و تند نظر اس کی پشت پر ڈال کر اپنے شوہر سے کہا۔

''آپ نے سنیں اپنے بیٹے کی باتیں کتنا چینج آ گیا ہے اس میں اور دیکھو کیسے غریبانہ خیالات پائے ہوئے ہیں۔ آپ سن لیں کہ میں اس کی پسند کو تب ہی قبول کرنے کا سوچوں گی اگر لڑکی ہمارے اسٹینڈرڈ کے مطابق ہوئی۔''

''زرینہ بیگم میں اسد کی باتیں سن بھی چکا ہوں اور سمجھ بھی چکا ہوں بہتر ہے کہ تم بھی صرف سنو اور سمجھو بھی۔ حیرت ہے کہ تم ماں ہو کر بھی بیٹے کی ناپسند اور پسند سے واقفیت نہیں رکھتیں۔ اس کے رجحان کو نہیں جانتیں۔ لیکن اسد کو کھرے کھوٹے کی پہچان ہے۔''

''اچھا میں بھی تو سنوں اس پہچان کا زاویہ کس پر ٹھہرا ہے۔'' زرینہ بیگم نے طنز سے پوچھا تھا۔

''پہلے غور سے میری بات سنو۔ مہرالنساء کی بیٹیاں ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔ ماشاءاللہ سلیقے اور قرینے سے بہرہ ور ہیں ہر کام میں اپنی مثال آپ ہیں۔ تم نے ان کے متعلق کیوں نہیں سوچا کیا اس کی ایک بھی بیٹی ایسی ہے جسے رد کرنے کو جی چاہے۔ سچ پوچھو تو آج میرا دل بہت دکھا ہے۔ اگر ہم بروقت مہرالنساء سے بات کر لیتے تو نمیرہ اور اسد کی جوڑی بہت اچھی لگتی۔''

''کیا اسد نمیرہ کو پسند کرتا ہے؟'' وہ چونکیں۔

''اگر کرتا ہو تو تم کیا کہو گی۔'' وہ سنبھل کر بولے۔

''ہم ہائی سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمیں بہو ایک ہی لانی ہے وہ بھی بینک بیلنس رکھنے والی نہ ہو تو ناک کٹ جائے گی ہماری۔'' زرینہ بیگم نے قائل ہونا کم ہی سیکھا تھا۔

''اور اپنی بھتیجیوں کو دیکھیں کیسا اکیلا اور صاحب جائیداد دیکھ کے اسد کو پھانسا ہے۔''

''پہلے اپنی اوقات تو دیکھ لیں جھونپڑی میں پل کر محلوں کے خواب دیکھ رہی ہیں۔'' ان کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

اب صحیح معنوں میں ایز دحمدانی کا پارہ ہائی

ہوا تھا اور وہ تڑخ کر بولے تھے۔

''بینک بیلنس، دولت جائیداد آخر کیا کرنی ہے تمہیں؟ قبر میں لے کر جاؤ گی یہ چیزیں۔ زرینہ بیگم اولاد ایسی چیز ہے جس پر انسان کو بھی کمپرومائز نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے اپنے جیون ساتھی کا خاکہ تراشا ہوگا۔ ہمارا بیٹا بہت سلجھے اور نفیس مزاج کا ہے بے شک وہ لاکھ فرماں بردار سہی لیکن اگر یہ خواہش اس کے لیے زندگی جیسی اہمیت رکھتی ہو اور تم اپنی منوا کر اسے زندگی سے محروم کر کے جی سکو گی۔ ایک جیتے جاگتے وجود کو قبر میں اتار کر، محرومیوں اور ادھوری تمناؤں کے لاشے کو اٹھا کر جینا موت کے مترادف ہی ہے۔ وہ عاصمہ کو چاہتا ہے اور بڑے مان کے ساتھ اس نے اس چاہت کا اظہار کیا ہے۔ جبکہ تم اس کی خواہش کو نظرانداز کر کے دولت و جایداد کی ہوس میں اندھی ہو رہی ہو۔''

زرینہ بیگم یک ٹک اپنے شوہر کو دیکھے جا رہی تھیں۔ اپنے والد کی تیز آواز سن کر اسد بھی اپنے کمرے سے نکل رہا تھا۔

''زرینہ بیگم یاد کرو کہ مجھ سے شادی سے قبل تم کیا تھیں۔ کتنا بینک بیلنس تھا تمھارے پاس۔ کتنی جائیداد کی مالک تھیں تم؟ یتیم خانہ سے بیاہ کر لائی تھیں تمھیں میری والدہ۔ اور آج میرے توسط سے دولت کے سنگھاسن پر بیٹھ کر تم میری بھانجیوں صرف اس بنا پر مسترد کر رہی ہو کہ وہ کسی دولت و جائیداد کی مالک نہیں۔ جبکہ میں بھی اپنے گھرانے کا اکلوتا بیٹا تھا میرے حوالے سے بھی ماں بہن کے ارمان و خواب تھے مگر ان کے پیش نظر خوف خدا بھی تھا اور زرینہ بیگم سوچو کہ تم تھیں اور اب کیا ہو۔ تمھارے خیالات کہاں سے کہاں پرواز کر گئے ہیں۔ بہت افسوس ہو رہا ہے مجھے زرینہ شدید افسوس ہے تمھاری ذہنیت پر۔''

آئینہ لیے ایز دحمدانی ان کا جو روپ سامنے لائے تھے وہ بہت بدنما تھا۔ وہ وحشت زدہ چہرے سے دروازے کے بیچ کھڑے اپنے خوبرو بیٹے کو دیکھ کر پتھرا گئیں۔ اسد انھیں عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ دکھ، حیرت، افسوس، ندامت، آخر کیا نہیں تھا اس کے چہرے پر۔

''میری ماں بہت سادہ دل اور نیک فطرت تھیں۔ انھیں کیا پتہ تھا کہ جس بے نام و نشان لڑکی کو عزت و حرمت کا تاج پہنا رہی ہیں وہ ایک دن انہی کی نواسیوں کو طعنے دے گی۔''

زرینہ بیگم دل کو پکڑے بیٹھیں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے شوہر کے تلخ و کڑوے سچ کو سن کر شکستہ زدہ ہو گئی تھیں۔ ایز دحمدانی باہر نکل چکے تھے۔ مگر ان کا بھرا کتا لہجہ اب تک گونجتا محسوس ہو رہا تھا۔ اسد دونوں ہاتھوں سے سر تھامے اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھا تھا۔

''بہت اونچے سنگھاسن پر بٹھا رکھا تھا آپ کو ماما اور بہت بری طرح سے بکھرا ہوں آج۔'' کتنا ٹوٹا بکھرا لہجہ تھا وہ تڑپ اٹھیں کہہ کر اسد رکا نہیں ان کے اٹھے بازو بے جان ہو کر پہلو میں گرے آنکھوں میں برسات اتر آئی۔ ان کا ذہن اٹھائیس سال پیچھے چلا گیا تھا۔

زرینہ لاہور کے ایک یتیم خانے میں پلی بڑی تھی۔ یہیں پر اس نے بی۔اے کی ڈگری حاصل کر لی۔ یہاں رہنے والی لڑکیاں رشتوں کا انتظار نہیں کرتی تھیں کہ رشتے گھروں میں آتے ہیں۔ یتیم خانوں میں نہیں پھر بھی یتیم خانے کی منتظر اعلیٰ نادرہ بیگم دیکھ بھال کر اکثر لڑکیوں کے گھر بسا چکی تھیں اور ان کی خواہش تھی کہ زرینہ کا بھی رشتہ مل جائے مگر زرینہ حقیقت سے واقف تھی اور وہ چاہتی تھی کہ یوں بیٹھ کر رشتوں کا انتظار کرنے کے بجائے وہ کہیں جاب کر کے اپنے مستقبل کو محفوظ کر لے۔ یتیم خانے میں خواتین کے عالمی دن کے حوالے سے سیمینار کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس میں دوسرے یتیم خانوں کے ساتھ ساتھ اخباری نمایندوں، معززین شہر کو دعوت دی گئی تھی۔ اس تقریب کو منعقد کرانے

میں مہمان خصوصی بیگم عشرت پیش پیش تھیں جو کہ ایک این۔ جی۔او چلا رہی تھیں۔ اور اعلیٰ حکومتی عہدے پر فائز تھیں۔ دوران تقریر انھوں نے یتیم خانوں اور پناہ گاہوں میں پلنے اور رہنے والی بے سہارا لڑکیوں کے حوالے سے بات کرتے ہوئے بڑے پرزور انداز میں کہنا شروع کیا۔

''اگر ہم لوگ تھوڑا تھوڑا آگے بڑھ کر ان بے سہارا لڑکیوں کو سہارا دیں اور انھیں عزت' تحفظ' چھت فراہم کریں' اپنے گھروں میں ایک معتبر مقام و حیثیت دیں جو ایک خاندانی اور حسب ونسب والی بہو کو ملتا ہے تو یہ لڑکیاں ہماری قومی ترقی اور معاشی استقامت کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کریں۔'' تالیاں بج رہی تھیں زرمینہ بے اختیار کھڑی ہوگئی۔

''میں مہمان خصوصی عشرت نفیس صاحبہ سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں۔''

اس کی خواہش پر اسے ڈائس تک نے کی اجازت دی گئی تھی۔

''بیگم صاحبہ ابھی آپ نے ایک بات کہی تھی بے سہارا لڑکیوں کے مستقبل کے حوالے سے بہت اچھی سوچ اور قابل تعریف بات ہے میں نے ابھی چند دن پہلے ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ آپ اپنے بیٹے کے لیے لڑکی دیکھ رہی ہیں تو بقول آپ کے ہی لڑکیاں تو یہاں بھی ہیں بلکہ یہاں کی لڑکیاں زیادہ سلیقہ شعار اور محنتی ہیں تو اس نیک کام کی ابتداء آپ ہی کیوں نہیں کرتیں؟ ادھر سے ایک لڑکی پسند کرلیں اپنے بیٹے کے لیے۔ اس سے آپ کی بات کی سچائی بھی ثابت ہو جائے گی اور اس اقدام سے دوسرے لوگوں کو بھی آگے بڑھ کر ان بے سہارا لڑکیوں کو سہارا دینے کا خیال آئے گا۔ بارش کا پہلا قطرہ کسی کو تو بننا ہے آپ ہی یہ بن جائیں۔''

اس کی بات پر بہت زور وشور سے تالیاں بجیں۔ حاضرین کو یہ جرأت مند لڑکی پسند آئی جبکہ عشرت نفیس صاحبہ کے چہرے پر غیظ وغضب کے آثار نمودار ہوگئے۔ انھوں نے بمشکل خود پر قابو پا کر یتیم خان کی منتظم اعلیٰ نادرہ قدسیہ صاحبہ سے بات کی کہ اس بدتمیز لڑکی کو فوراً ان کے سامنے سے ہٹایا جائے۔

''تقریر تو صرف تقریر ہوتی ہے بھلا اس پر کون احمق عمل کرتا ہے۔'' بعد میں زرمینہ کو نادرہ صاحبہ نے اچھی خاصی ڈانٹ پلا دی۔ البتہ زرمینہ کی ساتھی لڑکیاں اس کے اقدام کو کافی سراہ رہی تھیں۔ اور اسے لوگوں سے بھی اس جرأت پر داد ملی تھی۔

عشرت نفیس نے تو وہاں سے کوئی لڑکی پسند نہ کی مگر زرمینہ کی جرأت وحق گوئی ان کے ساتھ آئی ان کی دوست خالدہ خاتون کو بہت پسند آئی۔ اور انھوں نے اپنے اکلوتے صاحبزادے ایزد حمدانی کے لیے اسے پسند کرلیا۔ امریکہ سے تعلیم یافتہ ڈیسنٹ اور امیر و دولتمند شخص سے منسوب ہونے پر یتیم خانے کی تمام لڑکیاں زرمینہ کی قسمت پر رشک کررہی تھیں۔

خالدہ خاتون تو اس شادی کے بعد جلد ہی انتقال کرگئیں اور زرمینہ ان کی ہائی سوسائٹی کے طور طریقے سیکھ کر بہت جلد اپر کلاس میں رچ بس گئی۔ گزرتے وقت نے جہاں اسے ماڈرن تہذیب کا دلدادہ بنایا وہیں وہ یہ بھول گئیں کہ ان کی اصل حقیقت کیا تھی۔ وہ اب دھڑلے سے خالصتاً بیگمات والے خیالات کا اظہار کرتی وہی خیالات جو عشرت نفیس کے تھے ان کے بھی ہوگئے تھے۔ آج اتنے طویل عرصے بعد ایزد حمدانی نے آئینہ سامنے رکھا تو وہ پانی پانی ہورہی تھیں۔ انھوں نے کتنے غرور سے عاصمہ کا نام لینے پر ایزد حمدانی سے کہا تھا۔

''مہر النساء کتنا جہیز دے سکتی ہے کیا ہے اس کے پاس۔'' اور جواب میں چھپے ہوئے سچ کو عریاں کردیا گیا۔ انھیں ذلت کا کڑوا گھونٹ پینا پڑ گیا۔

''واقعی وہ کیا تھیں اور کیا ہیں۔''

انسان جانے اپنی عبدیت کی حدود کو کیوں پار کر جاتا ہے۔ جانے اپنا مقام یاد رکھنے اور خدا کا شکر ادا کرنے کی بجائے غرور ومستی کی دلدل میں کیوں دھنستا ہے۔'' ندامت کے آنسو ان کے دل کی کثافت دھو رہے تھے۔

دوپہر سے شام' شام سے رات گزرتے اب اذان سحر ہورہی تھی۔ زرمینہ بیگم تب سے اب تک ایک ہی پوزیشن میں بیٹھیں روئے جارہی تھیں۔

''حی علی الفلاح.....حی علی الفلاح۔''

''اللہ تو روز بار بار کہتا ہے کہ نجات پانے کے لیے آؤ۔ فلاح پانے کے لیے آؤ۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا ابھی ایک در کھلا ہے اس واحد ہستی کا جو ہمیشہ سے مہربان ہے اپنے بندوں پر جو توبہ قبول کرنے والا ہے۔ بے حد وحساب رحیم وغفور ہے۔''

زرمینہ بیگم نے سوچا اور باوضو ہوکر پاک و برتر پروردگار کے حضور جھک گئی۔ جب چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں آنے لگیں تو ایزد حمدانی نے اندر آکر ان کے قریب بیٹھ کر شانوں سے پکڑ کر انھیں اوپر اٹھایا۔

''اٹھو زرمینہ معافی کا در کبھی بند نہیں ہوا۔ اللہ تم پر اب بھی مہربان ہے۔ یہ اجلی سحر یہ روشن وقت تمھاری اشک ریزی' یہ سب تمھاری بخشش کے گواہ ہیں۔ اٹھو دیکھو زندگی کتنی مہربان ہو جاتی ہے اگر انسان مہربان و ایثار کے وصف کو اپنا لے۔''

وہ تشکرانہ انداز میں انھیں دیکھتی اٹھ گئیں۔ اسی جگہ وہی لوگ ناشتے میں مشغول تھے فرق یہ تھا کہ آج دل کی کثافتیں دھل کر کدورتیں دور ہو چکی تھیں اور آواز وانداز خوشی واعتماد کی روشنی کے مظہر تھے۔

ملازم نے مسز صفیہ اور شمسہ بیگم کی آمد کا بتایا تو وہ لوگ ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔ خوش گپیوں میں مصروف زرمینہ حمدانی کو اچانک کچھ یاد آیا تو وہ موبائل اٹھا کر نمبر پش کرنے لگیں۔

''مہرو میں زرمینہ بول رہی ہوں تمھارے بھائی اور میں آج شام کو آئیں گے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔'' پھر ہنستے ہوئے بولیں۔

''دراصل ہم لوگ عاصمہ کے لیے آرہے ہیں اسد کا رشتہ لے کر۔'' وہ بہت میٹھے اور سکون آمیز لہجے میں بولیں۔ ادھر سے مہر النساء نے کچھ کہا تھا جس پر وہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔

مہمان خواتین انھیں ششدر سی دیکھ رہی تھیں۔ بمشکل بولیں۔

''آپ نے اسد کے لیے لڑکی پسند کرلی ہمیں بتایا تک نہیں؟''

وہ فوراً بات کاٹ کر بولیں۔

''بہت خوبصورت' تعلیم یافتہ اور خوش اطوار لڑکی ہے۔ میری نند مہر النساء کی بیٹی ہے عاصمہ اور جب خاندان میں اتنا اچھا رشتہ موجود ہو تو پھر باہر کیوں دیکھیں۔ ویسے بھی ہم لوگ اتنے گنہگار ہیں اپنے تکبر میں خدا کو بھی بھول جاتے ہیں۔ مہرو اسی عورت کی بیٹی ہے جس نے ایک دیا جلا کر میری زندگی روشن کردی اور آج میں بھی ایسا ہی ایک دیا جلا رہی ہوں تاکہ اور زندگیاں بھی روشن ہوسکیں۔ اگر ایسا ایک ایک دیا بھی ہم لوگ جلائیں تو ذہنوں اور گھروں کی ساری تاریکی مٹ جائے۔''

وہ عقیدت واحترام کے جذبے سے لبریز اپنی ساس کی تصویر کو دیکھ کر کہہ رہی تھیں۔ ایزد حمدانی اور اسد نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا۔ اسی پل اسد کے چہرے پر اعتماد' یقین' محبت کے چراغ لو دینے لگے۔ وہ اطمینان ومسرت سے آنکھیں بند کرکے دھیرے سے گنگنا اٹھا تھا۔

''زندگی بن گئے ہو تم ہر خوشی بن گئے ہو تم۔''

محبت' یقین' خوشی کہنے کو چار حرفی لفظ ہیں لیکن جس کو حاصل ہو جائیں وہ مالدار ہو جاتے ہیں بشرطیکہ جذبہ ایثار ومروت زندہ رہے۔

☆☆☆

تعویذ محبت

صائمہ محبوب

''جناب احسن جاوید صاحب اگر آپ آسمان کی بلندیوں سے زمین پر تشریف لے آئیں تو کچھ عرض کروں؟'' میں جو آج کل امتحانوں کی تیاری میں پوری طرح مگن تھا اور فائز کو بالکل بھی وقت نہیں دے پاتا تھا اس کے جلے کٹے انداز پر مسکرایا۔

''جناب فائز توقیر صاحب آپ کو بات کرنے سے پہلے اجازت لینے کی معقول عادت کب سے پڑ گئی؟ ہم نے تو آپ کو ہمیشہ بے دھڑک بولتے سنا ہے۔''

میں نے بھی اسی کا انداز اپنایا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی۔

''دراصل میں نے سوچا کہیں عالی جاں کی تنہائی میں مخل نہ ہو جاؤں اس لیے تھوڑی ہچکچاہٹ تھی۔'' وہ ہنوز روٹھے روٹھے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''آپ کو ہم تنہا کہاں سے نظر آ گئے؟ کہتے ہیں کتاب سے بہترین رفیق کوئی نہیں اور اس وقت ہم اپنے دوستوں کے ہجوم میں ہیں۔'' میں نے اس کی توجہ اپنے اردگرد بکھری کتابوں کی طرف کروائی۔

آج کل میں ایگزامز کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ چند دنوں میں میرا ایم۔اے کے امتحان شروع ہونے والے تھے۔ دراصل میں نے گریجویشن کے فوراً بعد ایک فیکٹری میں ملازمت کر لی تھی۔ اس وقت حالات ایسے تھے کہ مجھے رزلٹ کا انتظار بھی مشکل لگتا تھا۔ اس لیے جہاں جگہ ملی سر گھسا لیا۔ کچھ عرصہ پہلے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ اگر میں ایم۔اے کر لوں تو کسی دوسری جگہ جاب کے لیے اپلائی کر سکتا ہوں اور اگر جاب نہ بھی ملے تو بھی یہاں پر ہی تنخواہ میں اضافہ ہو جائے گا۔ مشورہ معقول تھا اس لیے پسند آیا اور میں نے اس پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

ایگزامز نے مجھے اتنا پابند کر دیا کہ فیکٹری سے آتے ہی میں پڑھائی میں مگن ہو جاتا جس کی وجہ سے فائز کو بالکل بھی وقت نہیں دے پاتا۔ کچھ دن تو وہ برداشت کرتا رہا پھر چڑ گیا اور اب میرے سر پر سوار تھا۔

''ہاں..... ہاں جب نئے دوست ملتے ہیں پرانے بھول جاتے ہیں۔'' وہ تلملا کر بولا تھا۔

''یار کم از کم مجھے یہ رکشوں، بسوں والے شعر مت سنایا کرو اور بولو کہ کیا کام ہے؟'' میں نے پین کا ڈھکن بند کر دیا اور کتاب اور نوٹس بھی سائیڈ پر رکھ دیئے۔ پھر مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا اس لیے کھل کر مسکرایا۔

''آج تمھاری دعوت ہے۔'' اس نے پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ مجھے اطلاع دی۔ جملہ ہی حیران کن تھا اس پر اس کا انداز سونے پر سہاگہ۔

''مجھے دعوت دینے والا حاتم طائی کہاں سے پیدا ہو گیا۔ ارے کہیں چچا جان.....'' میں چونکا اور میرے منہ سے سرسراتی چیخ نما آواز نکلی اور میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس نے جھلا کر میرے سر پر ایک چپت رسید کی۔

''احمق..... اتنا تو کوئی اپنی محبوبہ کو بھی یاد نہیں کرتا جتنا تو اپنے اس بدنیت اور غاصب چچا کو یاد کرتا ہے۔ مجھے مجھ پر بھروسہ نہیں ہے ورنہ دیکھتا کہ وہ کیسے تیرا حق غصب کرتا ہے۔ تو بھی منہ میں کنکھیاں رکھ کر آ گیا۔ بندہ یوں چپ چپاتے نہیں نکل آتا۔ کوئی چرکہ ہی لگا آتا کم از کم بیٹی ہی اٹھا لاتا اس کی۔''

''شٹ اپ۔'' میں نے تلملا کر اسے ٹوکا۔

وہ تھوڑی دیر کو خاموش ہو گیا۔ پھر کچھ دھیمے انداز میں بولا۔

''یار سمجھ نہیں آتا تو کس دنیا کی مخلوق ہے کوئی تیرے ساتھ کتنی ہی زیادتی کرے تجھ پر اثر

نہیں ہوتا۔ تیرے اس لالچی چچا نے تیرا مکان ہڑپ کرلیا تو چپ رہا۔ اپنی بیٹی سے تیری منگنی توڑ دی تو نے کچھ نہ کیا۔ مجھے تیرے ہی گھر سے نکال کر بے گھر کر دیا۔ سمجھ نہیں آتا آخر کس بات کا تجھ پر اثر ہوگا۔ یہاں اس بڈھے خبطی مالک مکان کی جھڑکیاں سنتا ہے جو سمجھتا ہے کمرہ تجھے کرائے پر نہیں خیرات میں دیا ہے۔ یہ نہ کرو وہ کرو۔ اتنے بجے گھر واپس آؤ اس وقت گھر سے نہ نکلو۔ کبھی کبھی تو مجھے وہ تمھاری بیوی لگتا ہے۔'' اس کے چڑچڑے انداز پر مجھے ہنسی آ گئی۔

''تم مجھ کسی دعوت کا بتانے آئے تھے شاید؟'' میں نے اس کا دھیان ہٹایا اور وہ یکدم مسکرانے لگا۔

''ہاں میں نے سوچا میرا یار اتنے دنوں سے بازاری کھانے کھا کھا کر اوب چکا ہوگا۔ اس کو بھی گھر کے کھانے کی چاہ ہوگی آ تجھے میٹھے ہاتھوں سے بنے نمکین کھانے کھلا لاؤں۔'' وہ بولا تو میں مسکرا دیا۔

''کیا اتنی محبت پر میں آداب بجا لاؤں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں بالکل نہیں یہ تو میرا فرض تھا۔'' کہہ کر وہ ہنس پڑا۔

پھر ارادہ نہ ہونے کے باوجود مجھے جانا پڑا۔ کیونکہ وہ فائز ہی کیا جو کسی کی مان لے۔ آخر مجھے زبردستی کھینچتا ہوا خالہ فرخندہ کے گھر لے گیا۔ میں ابھی اس افتاد پر سنبھلا بھی نہ تھا کہ اس نے بیل بجا دی۔ خالہ شاید وہیں دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھیں۔ فوراً دروازہ ہاٹو پاٹ کھل گیا۔

''میں صدقے میں واری اتنی دیر لگا دی۔ اب تو میں کامی کو بھیجنے والی تھی کہ ذرا پتا تو کر کہ کیوں نہیں آئے ابھی تک۔'' خالہ کی اتنی محبت پر میں حیران رہ گیا۔ میرے تو خالہ کے ساتھ کبھی اتنے قریبی تعلقات نہیں رہے تھے کہ وہ مجھ پر اتنی محبت لٹاتیں۔ زیادہ سے زیادہ دو تین مرتبہ ملاقات ہوئی تھی۔

''خالہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ..... آپ بلائیں ہم نہ آئیں ایسے تو حالات نہیں۔'' فائز میرے پیچھے سے نکل کر خالہ کے کندھے پر لٹکا اور گنگنایا۔ اس کی بے تکلفی بھی مجھے حیران کر رہی تھی۔ میری نظر اس پر پڑی تو اس نے خالہ سے نظر بچا کر مجھے آنکھ ماری اور خالہ کے ساتھ بیٹھک نما ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ میں بھی ان کے پیچھے چلا آیا۔ وہ خالہ کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر نہایت مودب ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے اس دعوت شیراز کا مقصد ابھی تک سمجھ نہیں آیا تھا۔

''ارے بیٹا فائز کا تو روز کا آنا ہے کئی مرتبہ تمھارے متعلق پوچھا اس سے پھر سوچا اکیلا بچہ گھبراتا ہوگا چلو دعوت ہی دے ڈالوں اس بہانے آ جائے گا۔'' انھوں نے نہایت شفقت سے کہا۔

''بڑی عزت افزائی ہے خالہ آپ کی۔ میں مشکور ہوں۔ میں تو آ ہی نہیں رہا تھا یہ فائز ہی زبردستی لے آیا کہہ رہا تھا خالہ یاد کرتی ہیں اب میں.....'' میں اپنی جھینپ مٹانے کو کہہ رہا تھا کہ فائز نے میری بات کاٹ دی۔

''روز آیا کروں گا۔'' میں نے اسے گھورا جبکہ خالہ خوش ہو گئیں۔

''کیوں نہیں بیٹا تمھارا اپنا گھر ہے۔ مجھے تو بڑی خوشی ہوگی۔ رخشندہ اور تابندہ بھی تم لوگوں کو بہت یاد کرتی ہیں۔''

''کیوں.....؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ فائز کی کہنی میری پسلی میں لگی اور میں سی کر کے رہ گیا۔

فائز اب بھرپور انداز میں مسکرا رہا تھا اور خالہ کی باتوں پر تائیدی انداز میں سر ہلا رہا تھا۔ کافی دیر تک وہ میرے والدین جنت مکانی کی خوبیاں بیان کرتی رہیں۔ جن سے ان کی کبھی ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ پھر میرے چچا کی برائیاں

کرنے لگیں جنھوں نے یتیم بھتیجے کی لاکھوں کی جائیداد ہڑپ کر لی اور اس بے چارے کو سڑکوں پر رلا دیا۔ اگرچہ یہ بات درست تھی لیکن وہ جس انداز میں جائیداد کا ذکر کر رہی تھیں ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک مکان نہیں کئی مربعوں کے بارے میں کہہ رہی ہوں۔ میں نے الجھی نگاہوں سے فائز کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

پھر فوراً ہی کھانے کا شور مچ گیا۔ شور واقعی شور تھا خالہ تو خالہ ہم بھی بوکھلا گئے۔ خالہ اپنا بھاری بھرکم وجود سنبھالتی ہوئی باہر نکلیں۔ پھر ایک موٹی سی لڑکی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ لیکن سستی سے قالین پر پڑے فٹ میٹ سے الجھ کر گر پڑی۔ برتن ایک چھناکے سے زمین پر آ رہے اور شاید سارے ہی ٹوٹ گئے۔ لیکن نہیں شاید چچ بچ گئے تھے جو کہ سٹیل کے تھے۔ اس نے اچھل کر جلدی سے کھڑا ہونا چاہا لیکن بے تحاشا وزن کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ لیکن بہرحال وہ جیسے تیسے اٹھ کھڑی ہوئی گھٹنے کی چوٹ نظرانداز کر کے کپڑوں پر سے نادیدہ گرد جھاڑی اور شرمائی ہوئی میرے قریب آئی اور اپنی پاٹ دار آواز میں بولی۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔'' فائز نے فرشی سلام جھاڑا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ بولے۔ چونکہ میں اس ہنر سے بے بہرہ اس لیے کچھ سمجھ نہ آیا۔ اچھا ہوا خالہ کمرے سے باہر تھیں ورنہ شاید وہ لفافہ دیکھ کر مفہوم سمجھ جاتیں۔ میں نے فائز کے پہلو میں چٹکی لگائی۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھا تو ایک طائرانہ نظر آنے والی مہ جبین پر ڈالی۔ گولڈن ڈائی کٹے ہوئے بالوں کا ہالہ فاؤنڈیشن تھپے چہرے کو مزید خوفناک بنا رہا تھا۔ سفید تہہ بھی اندر چھپے کالے رنگ کو یقینی طور پر چھپا نہیں سکی تھی۔ ایک مصنوعی پلک پلکوں کی سائیڈ سے اکھڑ چکی تھی۔ اگر وہ مزید آنکھیں پٹپٹانے کا عمل جاری رکھتی تو ممکن تھا کہ وہ رخسار کو بوسہ دینے کو نیچے لڑھک آتی۔ چہرہ میک اپ سے رنگین تھا۔ مصنوعی جیولری سے سجی زیورات کی دکان لگ رہی تھی۔ دوپٹہ چھرا نچ کی ہیل سے الجھ کر اب کونے سے اکھڑا ایک کندھے پر پڑا۔ شاید قسمت کو رو رہا تھا۔

خالہ فرخندہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

''خیریت تو ہوئی بیٹا چوٹ تو نہیں لگی؟''

خالہ کی حسرت ناک نگاہیں برتنوں پر تھیں۔ انھوں نے بمشکل ہاتھوں کو لڑکی کو دھموکہ جڑنے سے روکا تھا اور چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجا کر بولیں۔ حالانکہ دل تو خون کے آنسو رو رہا تھا۔

''نہیں اماں میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' لڑکی نے ہر ممکن کوشش کی کہ چہرے پر تکلیف آثار نہ آ پائیں۔

''تم وہ فرنی کا ڈونگا تو نہیں اٹھا لائیں؟'' معاً خالہ نے پوچھا۔ لڑکی جواباً بولی۔

''نہیں اماں وہ تو فریج میں رکھا ہے۔'' وہ بات اگرچہ خالہ سے کر رہی تھی لیکن میرے چہرے کا طواف کرتی اس کی نگاہیں مجھے ڈسٹرب کر رہی تھیں۔

''اور وہ پانی کی بوتل؟'' انھوں نے پھر پوچھا۔

''وہ اماں سب سے اوپر کونے میں رکھی ہے۔'' اس نے نجانے کیوں دوپٹہ دانتوں میں دبا لیا اور تھوڑا اٹھلا کر بولی۔ باہر ایک رنگین آنچل لہرایا۔

خالہ نے اپنی پاٹ دار آواز میں اسے پکارا۔

''اے چھوٹی تو بھی آ جا..... کوئی غیر تھوڑی ہے فائز ہے اور ساتھ میں احسن۔'' چھوٹی شاید اسی انتظار میں تھی فوراً اندر داخل ہوئی۔ آتے ہی

ایک بھرپور مسکراہٹ میری طرف اچھالی۔ میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ زرد اور آتشی گلابی بڑے بڑے پھولوں کے پرنٹ کے سوٹ نے اسے شعلہ جوالہ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

''مما میرا نام تابی ہے پلیز چھوٹی نہ کہا کریں۔'' چھوٹی نے ایک ادائے ناز سے کہا۔ خالہ اثبات میں سر ہلانے لگیں۔ وہ ایک مرتبہ پھر مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ میں نے سٹپٹا کر نظریں جھکا لیں جبکہ فائز بلاتکلف بتیس دانتوں کی نمائش کر رہا تھا۔

''مسرتی سے کہو کہ آ کر برتن سیٹ لے۔'' خالہ نے ہدایات دیں۔ خدا خدا کر کے کھانا لگا۔ لیکن یہ کیا کبھی بڑی والی بوتل سے گلاس بھر کر مجھے پکڑا دیتی مجھے شرما شرمی میں پینا پڑتا پھر چھوٹی والی آخر کار چند نوالے اور ایک بوتل پانی پی کر میں اچھا خاصہ فل ہوگیا۔

''جا رخشی جا کر احسن بیٹا کے لیے فریج سے فرنی لے کر آ۔'' اور جب فرنی آئی تو وہ بھی پانی کی طرح حلق تک مجھے ٹھونسا دی گئی۔ فائز آرام سے بیٹھا میری درگت بنتے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

یہ دعوت میری زندگی کی بدترین دعوت ثابت ہوئی تھی۔ گھر آ کر میں نے اسے کان سے پکڑا۔

''یہ کس قسم کی دعوت تھی کچھ کھانے نہیں دیا' پانی پلا پلا کر اندر ٹینکی بنا دی۔''

''ٹھیک سمجھے برادر واقعی تمھارے اعزاز میں دعوت اسی لیے دی گئی تھی کہ پانی اور فرنی کھلائی جا سکے۔'' وہ اپنے مخصوص پراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیوں.....؟'' میں نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

''دراصل۔'' وہ جھجکا لیکن مجھے سختی سے اپنی جانب دیکھتے پایا تو بتایا۔

''جب خالہ کو پتا چلا کہ تو لاکھوں کی جائیداد کا اکلوتا وارث ہے اور تیرا چچا جائیداد ہڑپ کرنے کے چکر میں ہے اس لیے انھوں نے تجھے گھر سے نکال دیا ہے اور تو نے چچا پر دھوکہ سے جائیداد ہتھیانے کا مقدمہ کر دیا ہے۔ کیس عدالت میں زیر سماعت ہے اور جلد ہی فیصلہ ہونے والا ہے۔''

''کون سا مقدمہ.....؟ میں نے تو کوئی مقدمہ نہیں کیا اور جائیداد..... او خدایا! کس ڈھٹائی سے تم اس چھ مرلہ مکان کو جائیداد کہہ رہے ہو۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''یار تیرا یہ دوست کس کام کا جو تیرے لیے اتنا سا جھوٹ نہ بول سکے۔ میں نے خالہ کو ایسا شیشے میں اتارا ہے کہ انھیں تیرے لکھ پتی ہونے پر کوئی شبہ نہیں چونکہ میں خالہ کا مشیر خاص ہوں اس لیے میں نے خالہ کو بتایا ہے کہ چچا کے اس دھوکے کے بعد تمھارا اعتبار دنیا پر سے اٹھ گیا ہے۔ تم صرف اس لڑکی سے شادی کرو گے جسے تمھاری دولت میں کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اب خالہ مقدمے کا فیصلہ ہونے سے پہلے ہی تمھیں اپنی کسی ایک بیٹی کے لیے ریزرو کر لینا چاہتی ہیں۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے تمھاری دعوت کی ہے کہ دم کیا ہوا پانی اور میٹھے میں تعویذ ملا کر تمھیں کھلایا جا سکے۔'' اس نے بتایا تو میری آنکھیں بھی پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''واٹ.....؟ خبیث تم مجھے اب بتا رہے ہو جب وہ چیزیں میں نے کھا لی ہیں۔ اب اگر کچھ ہوگیا تو..... میں صبا کو کیا منہ دکھاؤں گا؟'' مجھے اپنے پیٹ میں تعویذ گڑبڑ کرتے محسوس ہوئے۔

''کچھ نہیں ہوتا یار۔'' اس نے اطمینان سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا جو میں نے جھٹک دیا۔

''دراصل یہ تعویذ انھوں نے بابا مست بنگالی سے حاصل کیے ہیں جس نے ستر سال بنگال کے جنگلات میں یہ علوم سیکھنے میں گزارے ہیں۔ جو اصل میں گڑھی شاہو کا رہنے والا ہے۔ اس نے تو کبھی بنگال بھی اپنے خواب میں بھی نہیں دیکھا۔ اس کی اپنی عمر بیالیس سال ہے لیکن ریاضت ستر سال کی ہے۔'' وہ دھیرے سے ہنسا لیکن میرے تیور ہنوز بگڑے رہے۔

''لیکن پھر بھی کوئی بات تو ہوگی اس میں جو.....''

''قسم لے لے سچ کہہ رہا ہوں یاد ہے تھرڈ ایئر میں جب میری انگلش میں سپلی آ گئی تھی اور میں ابا کے ڈر سے گھر سے بھاگ گیا تھا۔ تو میں اسی کے ساتھ تو رہا تھا ایک ہفتہ۔ اس وقت مجھے علم ہوا کہ اس کے حالات خاصے خراب ہیں اس کی دکان بالکل ختم ہوگئی تھی۔ پھر میں نے ہی اسے مشورہ دیا جس میں وہ کامیاب ہوا۔''

''کیا.....؟''

''ہاں اور تو اور دو عدد چیلے بھی میں نے ہی اسے ڈھونڈ کر دیئے تھے۔ پیر بغیر چیلوں کے سجتا نہیں ہے۔ بے چارے لاوارث اور بے روزگار تھے میں نے کام پر لگا دیا۔ بڑی دعائیں دیتے ہیں مجھے۔ خالہ کو بھی میں نے ہی بابا مست بنگالی کا بتا دیا تھا۔ اس کی مشہوری بھی میں نے ہی کرائی تھی۔ اب تو ماشاء اللہ کاروبار خاصہ ترقی پا چکا ہے۔ اخباروں میں بھی اشتہار آتے ہیں۔ ''تعویذ ہاتھ میں محبوب پیچھے پیچھے' دشمن کے ارادے خاک' اور میرے عمل کا توڑ کرنے والے کو پانچ لاکھ کا انعام'' وغیرہ لوگ سمجھتے ہیں کچھ تو ہوگا اس لیے کھنچے چلے آتے ہیں۔ اس کا کام چل جاتا ہے اور میرا بھی۔'' آخری الفاظ دھیرے سے ادا کیے۔

''تمھارا کس خوشی میں؟'' میرے کان کھڑے ہوئے۔

''یار بڑا ایماندار انسان ہے ابھی تک میرا احسان بھلا نہیں پایا۔ کمشن خود ہی بھجوا دیتا ہے۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا۔

''تمھارا کیا خیال ہے یہ جو میں نے درجن بھر گرل فرینڈز پال رکھی ہیں تو ان کو ہوٹلنگ کرانے اور گفٹس دینے کے لیے ابا مجھے پیسے دیتے ہیں۔''

''یا خدایا کتنے شیطان مرے تھے جب تم پیدا ہوئے تھے۔'' میں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر کراہا۔

''یار تجھے میری قدر ہی نہیں ہے ایک بار حکم دے کر تو دیکھ کیسے تیرا چچا خود تجھ سے معافی مانگنے آتا ہے۔ اگر نہ آیا تو نام بدل کر گدھا رکھ دینا۔ گھر تو گھر داماد بنانے کی آفر بھی اسی کی طرف سے ہوگی۔ لیکن وہ کیا کہتے ہیں گھر کی مرغی دال برابر۔ تجھے قدر نہیں میرے ٹیلنٹ کی جبکہ بابا مست بنگالی گرو مانتا ہے مجھے۔'' وہ اداسی سے بولا تو مجھے ہنسی آ گئی۔

''تجھے میری قدر کی کیا ضرورت ہے بہت سے لوگ ہیں تیری قدر کرنے والے۔'' میں نے خالہ فرخندہ کی بڑی والی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ تڑپ اٹھا۔

''خدا کا خوف کرو۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''میں خدا کا خوف کروں اور تم نہ کرو۔ شرم نہیں آتی تمھیں ان کو بے وقوف بناتے ہوئے۔ اچھی طرح جانتے ہو کہ میں صبا میں انٹرسٹڈ ہوں۔ پھر بھی تم نے یہ گھٹیا حرکت کی۔'' میں پھر غصے میں آ گیا۔

''یار تیرے ساتھ کیا مسئلہ ہے کبھی گرم ہوتا ہے کبھی ٹھنڈا۔ ابھی ہنس رہے تھے ابھی پھر پٹڑی سے اتر آئے۔ کتنی مرتبہ اقرار کرواؤ گے کہ وہ تعویذ بالکل بے کار ہیں۔ اس سے تم تابی یا رخشی کے قدموں میں نہیں پہنچ جاؤ گے۔ اچھا ایسا کرتا ہوں تیری فرقان سے ملاقات کروا دیتا ہوں وہ

خود تجھے بتا دے گا۔'' وہ میرے گلے لگ کر مجھے منانے لگا' مجھے ماننے ہی بنی۔

''حسن صاحب میں معذرت خواہ ہوں دراصل مجھے معلوم نہ تھا کہ فائز صاحب نے آپ سے مذاق کیا ہے اور خالہ فرخندہ آپ کے لیے تعویذ لے کر جاتی تھیں۔'' اگلے ہی دن وہ فرقان کو لے کر آ گیا۔

اسے دیکھ کر مجھے حیرت نہیں ہوئی اس کا حلیہ ویسا ہی تھا جیسا اس پیشے سے متعلق کسی شخص کا ہو سکتا تھا۔ الجھے ہوئے کندھوں تک لمبے بال جو جانے کب سے صابن اور پانی کو ترس رہے تھے۔ کھچڑی داڑھی' سیاہ رنگت جس پر سبز رنگ کا لمبا سا جبہ پہن رکھا تھا۔ گلے میں موٹے موٹے موتیوں کی چار پانچ مالائیں۔ ہاتھوں کی دسوں انگلیوں میں مختلف پتھر جڑی انگوٹھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ اس کا حلیہ ایسا تھا کہ اگر کوئی کمزور دل کا شخص رات کو دیکھ لے تو ڈر جائے۔ خاصی بارعب شخصیت تھی اس کی۔ لیکن جب بولا تو انداز شخصیت سے بالکل جدا تھا۔ وہ معذرت خواہانہ انداز میں صفائی پیش کر رہا تھا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے آپ کا تو پیشہ ہی یہ ہے۔ غصہ تو مجھے فائز پر ہے۔ اس نے جانتے بوجھتے مجھے کیوں اس حماقت میں انوالو کیا۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میری زندگی میں ان لغویات کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے پھر بھی۔'' اس کی معذرت پر میں تھوڑا جھینپ گیا تھا لیکن میرا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

''یار سوری نا..... اب تو مان جا۔ قسم لے لے تیری عزت پر ذرا بھی حرف نہیں آئے گا۔'' فائز نے پیچھے سے آ کر میری گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ خاصا محبوبانہ انداز تھا' مجھے ہنسی آ گئی۔ میرے چہرے پر ذرا نرمی کے آثار دیکھے تو وہ پھیل گیا۔

''یار تھوڑے دنوں کی تو بات ہے پھر میں تمھیں خود اس کھیل سے نکال دوں گا۔ پلیز اور خالہ فرخندہ اس بات سے کتنی خوش ہوں گی تجھے پتا ہی نہیں ہے۔ کسی کا دل خوش کرنا کتنے ثواب کا کام ہے۔ یہ تجھ سے بہتر کون جانتا ہوگا۔'' وہ لاڈ سے کہہ رہا تھا۔

فرقان بھی اصرار کرنے لگا۔

''دراصل اگر آپ بیچ میں ہی چلے گئے تو میری ریپوٹیشن خراب ہو جائے گی۔'' اور مجھے حامی بھرتے ہی بنی۔

''ایسا ہے احسن صاحب۔'' فرقان کچھ جھجکتے ہوئے بولا۔

''کل آپ کو خالہ کے گھر جانا ہوگا اگر کچھ مٹھائی یا پھول لے جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ دراصل میں نے خالہ سے کہا ہے کہ میں ان کے لیے تین دن کا چلہ کاٹ رہا ہوں۔ جس سے احسن صاحب خود ہی خالہ اور ان کے خاندان کے ساتھ تعلقات بنانے کے خواہاں ہو جائیں گے۔ کل چلے کا آخری دن ہے تو پلیز.....'' وہ التجائیہ انداز میں بولا۔

''کیا آپ اپنے ہر معمول کی اتنی ہی منتیں کرتے ہیں؟'' میں نے پوچھا تو وہ ہنس پڑا۔

''نہیں صاحب..... کون ہے جو بابا مست بنگالی کی بات سے انکار کرے۔ یہ تو فائز اور آپ کی عزت ہے میری نظروں میں جو میں خود اپنے قدموں پر چل کر آیا ہوں مدد مانگنے۔''

''چل بے..... اپنے قدموں پر چل کہ..... میں نے خود تجھے پردے والے تانگے سے اترتے دیکھا ہے۔'' فائز نے انٹری دی۔

''وہ تو اس لیے کہ مجھے کوئی دیکھ کر پہچان نہ لے۔''

''تو کیا میں امید رکھوں کہ میرا کام ہو جائے گا؟'' وہ جاتے جاتے بھی مجھے یقین دہانی کرانا نہیں بھولا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

آج پھر میں خالہ فرخندہ کے گھر پر تھا۔ اس مرتبہ میرے ساتھ فائز نہیں تھا۔ اگر میں نے فرقان سے وعدہ نہ کیا ہوتا تو کبھی نہ آتا لیکن مجبوری۔ جس وقت میں نے گھر کے اندر قدم رکھا خالہ مجھے منتظر ملیں۔ مجھے دیکھ کر فاتحانہ انداز میں مسکرائیں۔ شاید بابا مست بنگالی پر اعتقاد اور بھی گہرا ہو گیا ہوگا۔

''آؤ..... آؤ بیٹا میں تمھاری ہی راہ دیکھ رہی تھی۔'' وہ گرم جوشی سے بولیں۔

''کیوں خالہ کیا آپ کو میری آمد کی اطلاع تھی؟'' میں نے یونہی چھیڑنے کی غرض سے پوچھا۔ وہ لمحہ بھر کو سٹپٹا گئیں۔ پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولیں۔

''بس میرا دل کہہ رہا تھا کہ آج احسن بیٹا آئے گا اور دیکھ میرے دل نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔'' اور میں خالہ کی برجستہ گوئی کا قائل ہو گیا اور ان کے ساتھ بیٹھک میں چلا آیا۔ ہاتھ میں پکڑا مٹھائی کا ڈبہ میز پر رکھ دیا۔

''اس کی کیا ضرورت تھی؟'' خالہ نے تکلف برتا۔

''نجانے کیوں دو دنوں سے دل آپ سے ملنے کو چاہ رہا تھا۔ میں آنا نہیں چاہتا تھا روز روز آنا اچھا نہیں لگتا۔ لیکن آج رہا نہیں گیا۔ خالی ہاتھ آنا اچھا نہیں لگا اس لیے.....'' میں نے کہا تو خالہ نہال ہو گئیں۔

''اے بیٹا یہ کیا بولا تو یہ کوئی غیر کا گھر ہے کیا جو تو جھجک رہا تھا۔ یہ تو تیرا اپنا گھر ہے۔ میں نے کبھی تجھے کامی سے کم نہیں سمجھا اور تو بھی تو مجھے خالہ کہتا ہے اب اگر تیری سگی خالہ ہوتی تو کیا تو ایسا بولتا؟'' وہ بہت چاہ سے کہہ رہی تھیں۔

ایک لمحہ کو مجھے اپنے جھوٹ پر افسوس ہوا۔ بیٹیاں جوان ہو جائیں تو ماں باپ کتنے بے بس ہو جاتے ہیں۔ خالہ کی اس محبت کے دکھاوے کو میں کم از کم خود غرضی نہیں کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ اگر یہ خود غرضی ہے تو دنیا کا ہر شخص خود غرض ہوا۔ اپنی اولاد کی بہتری کے لیے کوشش تو ہر انسان کرتا ہے۔ اگر میری زندگی میں صبا نہ ہوتی تو میں ضرور خالہ کا بوجھ ہلکا کرنے کا سوچتا لیکن اب جبکہ میرا دل اس کے علاوہ کسی اور کی طرف مائل ہو ہی نہیں سکتا تو کیوں خوامخواہ کسی کی زندگی خراب کروں۔ خدا ان کی بیٹیوں کی قسمت اچھی کرے اور پھر وہی ہوا جو پچھلی مرتبہ ہوا تھا۔ بھڑکیلے لباس میں سجی سنوری خالہ کی دونوں بیٹیاں مجھے رجھانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھیں۔ ان کے درمیان میں خود کو چغد سا محسوس کر رہا تھا۔ کھانے پر خالہ نے مجھے زبردستی روک لیا۔ لیکن شکر ہے اس مرتبہ مجھے پانی اور میٹھے پر نہیں ٹرخایا۔ بلکہ بریانی سے میری تواضع کی گئی۔ جس نے بھی بنائی تھی ہاتھ میں ذائقہ بہت تھا۔ یا شاید اتنے عرصے بعد گھر کا کھانا کھانے پر مجھے محسوس ہوا۔

اور پھر کتنے ہی دن گزر گئے۔ میرے امتحان شروع ہوئے اور خیر خیریت سے ختم ہو گئے۔ مجھے امید تھی کہ اچھے گریڈ بنیں گے۔ فائز نے میرے ایگزام ختم ہونے پر باقاعدہ شکر ادا کیا۔

''بس بہت ہو گیا اب میں مزید اس کھیل کا حصہ نہیں بن سکتا۔ حد ہوتی ہے۔'' میں نے اس دن فائز کو جھڑک دیا۔ اس کی باتوں میں آ کر میں کئی مرتبہ خالہ کے گھر دعوت کھا چکا تھا۔ اب تو وہاں جاتے ہوئے مجھے احساس جرم ہونے لگتا۔ سارا وقت عجیب سی شرمندگی کا احساس رہتا۔

''ٹھیک ہے مت جانا..... میں آج ہی فرقان سے کہہ دوں گا۔'' اس نے خلاف توقع فوراً میری بات مان لی۔ میں نے مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا جو بیڈ پر چوکڑی لگائے بیٹھا تھا۔ گود میں کاجو بھری پلیٹ تھی۔ وہ بیک وقت پلیٹ اور میری طرف متوجہ تھا۔

''تھینک گاڈ..... اس خواہ مخواہ کی شرمندگی سے تو جان چھوٹی۔''

''احسن! اگر میں تجھے ایک خوشخبری سناؤں تو تو مجھے کیا دے گا؟'' تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ پرخیال انداز میں بولا۔

''سوری مجھے تیری ان فضول خبروں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' میں نے صاف جواب دیا اور دبا دبا کر کپڑے استری کرنے لگا۔

''نہیں یار واقعی خوشخبری ہے تیرے لیے۔''

وہ ہنوز سنجیدہ تھا۔ میں نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ اتنا سنجیدہ تو وہ پہلے کبھی نہ ہوا۔

''یہ تو خبر پر ڈپینڈ کرتا ہے اگر وہ واقعی خوشخبری ہوئی تو جو مانگے گا دوں گا اور اگر نہ ہوئی تو پھر اپنا حشر دیکھنا۔'' میں نے دھمکی دی۔

''دراصل آج تمھارے چچا تم سے ملنے آنے والے ہیں۔'' اس نے دھماکہ کیا۔ ایک لمحہ کو میں سناٹے میں رہ گیا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں نے بے یقینی سے کہا۔

''کیوں نہیں ہو سکتا۔ جب وہ تمھیں گھر سے نکال سکتے ہیں تو کیا گھر واپس بلانے دوسرے لفظوں میں منانے نہیں آ سکتے۔ دراصل وہ اتنے برے نہیں ہیں بس ذرا لالچ میں آ گئے تھے لیکن اب سب سیٹ ہے۔'' اس نے چچا جان کی صفائی پیش کی تو میں مشکوک ہو گیا۔ ہمیشہ تو وہ چچا جان کی برائی ہی کرتا تھا پھر آج اتنی ہمدردی کیوں کر رہا ہے ان سے۔

''تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ ٹیڑھے ہیں یا نہیں۔ تم کیا ملے ہوان سے؟'' میں استری کا پلگ اتار کر کپڑے سمیٹ کر ایک سائیڈ پر رکھنے کے بعد اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور جواب طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''میں..... وہ مجھے کسی نے بتایا تھا..... نہیں دراصل..... ہاں وہ انھوں نے اطلاع دی تھی آنے کی کہ اس وقت گھر پر نہیں تھے۔'' وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔

''جب میں گھر پر نہیں تھا تو تم تک اطلاع کیسے پہنچی کیا باہر دھرنا مار کر بیٹھے تھے۔''

''یار اتنا شک کیوں کر رہے ہو؟ کچھ نہیں کیا میں نے۔ کمال ہے ساری دنیا کو اپنی انگلیوں پر نچاتا ہوں ابا اور تمھارے سامنے جانے کیوں کنفیوز ہو جاتا ہوں۔ اگر آ گئے تو تمھیں خود پتہ چلا جائے گا۔ اب جان چھوڑو میری۔'' وہ مصنوعی جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

اور پھر وہی ہوا جو اس نے کہا تھا۔ شام کو چچا، چچی اور صبا کے ساتھ آ گئے۔ ایک لمحہ کو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ میں سن دماغ لیے بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔ تین سال پہلے چچا نے مجھے گھر سے نکل جانے کو کہا تھا اس وقت بھی میری یہی کیفیت تھی اور آج بھی۔

''مجھے معاف کر دو بیٹے میں نے تمھارے ساتھ بہت ظلم کیا ہے۔ زیادتی کی میں بھول گیا تھا کہ یتیم کے ساتھ برا کرنے والے کے ساتھ اللہ بھلا نہیں کرتا۔ اس سے پہلے کہ میں معافی مانگنے کے قابل نہ رہوں تم مجھے معاف کر دو۔ خدا کے لیے مجھے مایوس نہ کرنا میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔'' انھوں نے اپنے ہاتھ میرے آگے جوڑ دیئے، میں تڑپ اٹھا۔

''چچا جان پلیز یہ آپ کیا کر رہے ہیں..... کیوں مجھے گنہگار کر رہے ہیں۔ خدا گواہ ہے کہ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود بھی میں نے کبھی آپ کا برا نہیں چاہا۔'' میں نے ان کے دونوں ہاتھ علیحدہ کیے۔

''میں جانتا ہوں کہ تم نیک ماں باپ کے نیک بیٹے ہو۔ میں ہی غلط تھا لالچ میں آ گیا تھا۔ اب مجھے مایوس نہ لوٹاؤ۔ میرے ساتھ گھر چلو۔'' ان کے الفاظ تھے کہ مژدہ حیات مجھے اپنے اندر ایک نئی امنگ اور توانائی دوڑتی محسوس ہوئی۔

''ہاں بیٹا تمھارے چچا ٹھیک کہتے ہیں۔ اب گھر چلو جو کہ تمھارا ہے تمھارا حق ہے۔ تمھاری سعادت مندی کے سامنے سب کچھ ہیچ ہے۔ تم نے جانتے ہوئے کہ تمھارے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے اپنا حق چھوڑ دیا اور جنھیں ہم اپنا سمجھتے تھے انھوں نے کیا کیا۔ ہمارے ساتھ شاید یہی خدا کی قدرت ہے دھوکہ دینے والے کے ساتھ دھوکہ ہوتا ہے۔'' اب کہ چچی بولیں۔ میں نے ان کی طرف دیکھا تو نظر ساتھ کھڑی صبا پر پڑی جو آنکھوں میں آنسو بھرے مسکرا رہی تھی۔

''ہاں تو اب بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟'' ساری رسموں سے گزر کر جب رات کے دو بجے میں کمرے میں داخل ہوا تو صبا پھولوں کی کٹھڑی بنی میری منتظر تھی۔ زرتار آنچل میں اس کا حسن شعاعیں بکھیر رہا تھا۔ اسے اس روپ میں دیکھنے کی چاہ جانے کب سے میرے دل میں تھی۔ لیکن اس وقت میرے ہر جذبے پر تجسس جاری تھا۔ میں نے چھوٹتے ہی پہلا سوال کیا تو وہ مصنوعی غصے سے مجھے گھورنے لگی۔

''شاید آپ کو یاد نہیں آپ دلہا ہیں اور اس وقت اپنی نئی نویلی دلہن سے مخاطب ہیں۔ اس وقت آپ کو مجھے رومانی کا تحفہ دینا چاہیے۔ میری تعریف، کچھ وعدے کرنے چاہوں لیکن یہ سوال و جواب کا سلسلہ..... کب عقل آئے گی تمھیں؟'' وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولی۔

''میرا تجسس کے مارے برا حال ہے۔ آتے ہی چچا جان نے شادی کی ڈیٹ فکس کر دی۔ پھر تیاریاں شروع اس دوران تم سے ملاقات ہی نہیں ہو پائی اور چچا، چچی سے اس لیے نہیں پوچھ سکا کہ کہیں وہ کچھ اور ہی نہ سمجھ لیں۔'' میں نے کہا۔

''احسن کیا تم جادو ٹونے پر یقین رکھتے ہو؟'' تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا تو مجھے بے اختیار فائز یاد آیا۔

آج صبح جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے خالہ فرخندہ کے متعلق پوچھا۔ دراصل یہاں آ کر اتنی مصروفیت رہی کہ اس طرف جانا ہی نہ ہو سکا اور ویسے بھی فائز کے علاوہ میرا وہاں تھا ہی کون اور وہ خود ہی ملنے چلا آتا۔ میری بات سن کر وہ ہنس پڑا۔

''تو بے فکر ہو کر نوشہ میاں بننے کی تیاری کر کیونکہ میں نے دریاؤں کا رخ موڑ ڈالا ہے۔ میں نے خالہ پر ثابت کر دیا ہے کہ فرقان ان کی چندے آفتاب چندے ماہتاب بیٹیوں کے قابل ہی نہیں ہے۔ وہ مقدمہ ہار چکا ہے اور اب اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ اب اس کو ساری زندگی پانچ ہزار کی نوکری پر گزارہ کرنا ہوگا۔ خدانخواستہ اور پھر خالہ کو افسوس ہوا کہ انھوں نے بابا مست بنگالی سے مقدمہ جیتنے کا تعویذ کیوں نہ لے لیا۔ بہرحال وہ اب مطمئن ہیں۔ تم ان کے دل سے نکل چکے ہو۔ ویسے بھی خدا گنجے کو ناخن دے ہی دیتا ہے۔ یہ مثال ادھر سیٹ ہے کہ نہیں معلوم نہیں لیکن آپا رشیدہ کا بھائی دوبئی سے چھٹیوں پر پاکستان آیا ہوا ہے اور آج کل خالہ اس کی دعوتیں کر رہی ہیں۔ فرقان کی موجیں میرے عیش۔'' اس نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ مجھے بتایا تو مجھے اپنے سر سے بوجھ سرکتا محسوس ہوا۔ میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔

''تم شاید یقین نہیں کرتے۔'' میری خاموشی سے اس نے نتیجہ اخذ کیا۔

''نہیں یقین تو کرتا ہوں لیکن زیادہ نہیں کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''دراصل کچھ عرصے سے ایسا ہونے لگا ہمارے گھر سے آڑھی ترچھی لائنوں والے کاغذ برآمد ہونے لگے۔ مجھے صفائی کے دوران کبھی کبھی یہ کاغذ ملتے۔ شروع شروع میں، میں نے زیادہ غور نہیں کیا۔ لیکن ایک دن یونہی خیال آیا

کہ آخر یہ کاغذ آتے کہاں سے ہیں۔ گھر میں امی' ابو اور میرے علاوہ تو کوئی نہیں ہوتا جو یہ کاغذ لائے ایک مرتبہ ایک کاغذ ملا جس پر یہ صاف الفاظ میں لکھا تھا کہ صبا کی شادی نعیم کے ساتھ اور عجیب وغریب لائنیں کھینچی ہوئی تھیں۔ نعیم کو تو تم جانتے ہو خالہ صفیہ کا بیٹا۔ اس کے علاوہ تو کوئی نعیم نہیں ہے نہ خاندان میں اور نہ ہی محلے میں۔ خیر میں نے وہ کاغذ امی کو دکھایا۔ وہ بھی گھبرا گئیں۔ دوسرے ہی دن ایک اور کاغذ نکلا جس پر لکھا تھا مکان اور دکانیں نعیم کے نام ہو جائیں اور ویسی ہی مخصوص لائنیں تھیں۔ لکھائی بھی لال رنگ کی تھی شاید خون سے لکھا ہوا تھا۔ میں نے امی سے کہا کہ وہ ابو سے بات کریں۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ خالہ صفیہ نعیم سے میری شادی کروا کر مکان اور دوکانیں حاصل کرا چاہتی ہیں۔ امی نے ابو کو بتایا تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔ بات ہی پریشانی کی تھی۔ انھوں نے خود کسی پیر صاحب سے مشورہ کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک دن وہ پیر صاحب کو گھر لے آئے۔ احسن تمھیں کیا بتاؤں کہ وہ پیر صاحب کتنے پہنچے ہوئے تھے۔ انھوں نے گھر میں داخل ہوتے ہی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنا شروع کیا۔ پھر مٹھی سے کچھ نکال کر پھینکا۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں ہو گیا۔ پھر وہ غصے سے ابو کو دیکھنے لگے۔

''جب خود پر پڑی ہے تو معلوم ہوا کہ تکلیف کیا ہوتی ہے؟'' وہ ابو سے مخاطب تھے۔

''پیر صاحب یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میں کچھ سمجھا نہیں۔'' ابو بولے۔

''دھوکہ' جھوٹ' فریب مجھے اس گھر سے ان چیزوں کی بو آ رہی ہے۔ اس گھر کا مالک کون ہے؟'' انھوں نے پوچھا۔

''میں ہوں اس گھر کا مالک۔'' ابو نے جواب دیا۔

''نہیں۔'' وہ چلائے۔

''تم اس گھر کے مالک نہیں ہو۔ اگر ہوتے تو گھر سے تمھاری خوشبو آتی۔'' انھوں نے کہا تو امی اور مجھ پر تو مارے خوف کے کپکپی طاری ہو گئی۔ ابو بھی گھبرا گئے۔ بار بار ماتھے پر آیا پسینہ صاف کرتے۔ اتنی صاف بات' اتنی سی دیر میں انھیں معلوم ہو گیا کہ اس گھر کے مالک کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔

''کسی یتیم کے ساتھ دھوکہ کرنے والے کو اللہ معاف نہیں کرتا۔ اب تم مجھ سے کسی بھی قسم کی امید نہ رکھنا۔ میں جانتا ہوں تمھارے گھر پر تعویذ کیے گئے ہیں۔ کالا جادو کروایا گیا ہے۔ لیکن اس کا علاج میں نہیں کروں گا۔ اب تم کسی بڑے سے بڑے عالم یا بزرگ کے پاس جاؤ تو تمھارا کام نہیں ہوگا۔ تمھاری حرام کی دولت تمھارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ تمھاری بیٹی خون تھوک تھوک کر مر جائے گی۔ تمھیں اللہ اس دنیا میں قیامت دکھا دے گا۔'' اور ابا پر تو رقت طاری ہو گئی۔ وہ پیر صاحب کے قدموں میں گر گئے۔

''خدا کے لیے پیر صاحب کچھ مشورہ دیجیے میں کیا کروں؟ میری ایک ہی تو اولاد ہے میں اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکوں گا۔'' وہ رونے لگے۔ پہلے تو پیر صاحب خوب اینٹھے رہے ہزار منتوں کے بعد مانے تو بولے۔

''اس گھر کے اصل مالک کو ڈھونڈو اس سے معافی مانگو۔ اس کا جو حق بنتا ہے اسے دے دو اور یاد رکھو اگر ذرا بھی آنا کانی کی تو تمھارے ساتھ وہ ہوگا جو تم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔ اگر تمھارے لیے دولت اولاد سے بڑھ کر ہے تو بے شک ہیر پھیر کر سکتے ہو۔'' وہ اپنی بارعب آواز میں بولے۔

''نہیں..... نہیں جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔''

''اور یہ جو نعیم نامی لڑکا ہے۔ اسے مت بتانا کہ تم اس کی اصلیت جان چکے ہو اور اس کے

لالچ سے باخبر ہو چکے ہو۔ اسے معاف کر دو اگر دل میں جگہ نہ پاؤ تو خود کو سوچو آخر تم نے بھی تو کسی کے ساتھ یہی کچھ کیا ہے۔'' ابو پیر صاحب کے ہر حکم پر دل وجان سے راضی تھے۔

''میں ابھی اس کے عمل کا توڑ کرتا ہوں۔''

''انھوں نے کہا اور اٹھے اوپر سٹور کی طرف چلے گئے۔ پھر لکڑی کے تخت کے پائے کے نیچے سے ہاتھ کی بنی ہوئی گڑیا برآمد کی۔ گڑیا کے جسم میں گیارہ سوئیاں چبھی ہوئی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان گیارہ سوئیوں کا مطلب ہے کہ گیارہ دن کے اندر اندر یا تو میری شادی نعیم کے ساتھ ہو جائے گی اور جائیداد نعیم کے نام ٹرانسفر ہو جائے گی اور یا پھر ان ہی گیارہ دنوں میں' میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھوں گی۔ کس کس قسم کے لوگ ہوتے ہیں اس دنیا میں۔ ایک بات بتاؤں ابو کا ارادہ میری شادی نعیم سے کروانے کا تھا لیکن اس کی اس حرکت کے بعد انھیں تمھاری سعادت مندی یاد آئی۔ انھیں معلوم ہو گیا کہ وہ ہیرا پھینک کر پتھر اٹھانے والے ہیں۔ اسی لیے دوڑے دوڑے تمھارے پاس گئے۔ شروع میں تو میں بہت ڈری لیکن اب نعیم کا شکریہ ادا کرنے کو دل چاہتا ہے۔ نہ وہ یہ حرکت کرتا نہ ہم ملتے۔'' آخری بات کہتے ہوئے وہ دھیمے سے مسکرائی۔ لیکن ان فسوں خیز لمحات میں نئی نویلی دلہن کی شرمیلی مسکان سے مجھے وہ بات پن کر رہی تھی جو پوری طرح کلیر نہ تھی۔

''بس اب آ گیا سکون۔'' وہ بولی۔

''تم نے ان پیر صاحب کو دیکھا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں..... جب وہ گھر آئے تھے تب دیکھا تھا۔ ویسے بھی امی کو خطرہ تھا کہ مجھ پر دوبارہ جادو کرانے کی کوشش نہ کی جائے کہیں۔ اس لیے پیر صاحب نے دم کر کے مجھ پر ہر قسم کے جادو ٹونے کی بندش کر دی ہے۔ اب اگر خالہ صفیہ نے اس قسم کی حرکت کی تو سر پیٹ کر رہ جائیں گے۔ پیر صاحب نے ایسا دم کیا ہے مجھ پر۔'' وہ تفاخر سے مسکرائی گویا ہر مصیبت سے ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی ہو۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور ان مخروطی انگلیوں کی نرماہٹ محسوس کرنے لگا۔

''احسن ہم پیر صاحب کے آستانے پر ان کا شکریہ ادا کرنے ضرور جائیں گے۔'' وہ ناز سے بولی۔

''ٹھیک ہے..... نام کیا ہے ان کا؟''

''بابا مست بنگالی' بہت پہنچے ہوئے ہیں۔ ستر سال بنگال کے جنگلات میں عبادات کی ہیں انھوں نے۔ آج تک پورے بنگال میں ان جیسا.....'' وہ کہہ رہی تھی اور میری آنکھوں کے سامنے گول گول دائرے بننے لگے۔ جن کے بیچ فائز کا چہرہ مسکرا رہا تھا اپنے مخصوص پراسرار انداز میں۔

''خبیث.....'' میں نے زیر لب اسے گالی دی۔

''بس اب بند کرو یہ پیرنامہ..... کیا آج ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے ہم پہلے دلہا دلہن ہیں جو.....''

''پلیز انھیں کچھ مت کہو آخر ان ہی وجہ سے تو ہمارا ملن ہوا ہے۔'' اس نے کہا میں قائل ہو گیا۔

''واقعی ٹھیک کہا تم نے۔ میں تمھاری خواہش ضرور پوری کروں گا۔ پیر صاحب کے آستانے پر تمھیں نہیں بلکہ پیر صاحب کو تمھارے آستانے میرا مطلب ہے گھر لے کر آؤں گا۔ صرف پیر صاحب کو نہیں ان کے گرو کو بھی۔'' میں نے کہا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیا۔

''بس اب صرف میری بات کرو۔ میری اور اپنی۔'' میں نے مخمور نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔ ☆☆

دل کی بستی سے

عینی رضا

خبر اچھی تھی اور خاصی حد تک خوشگوار بھی، مگر اس کے لیے ہرگز بھی نہیں۔ نبیلہ کے نزدیک اس کی ذہنی حالت مشکوک تھی۔ وگرنہ ایسی خبر پر تو ہنسی کے فوارے چھوٹ جاتے۔ شفق کی لالی گالوں پر بکھر بکھر جاتی اور کچھ ایسے ہی سین کی توقع وہ نیرا سے بھی کر بیٹھی تھی۔ تبھی تو اشتیاق میں وہ کانوں میں یہ خبر پڑتے ہی نیرا کے کمرے کی طرف دوڑی تھی۔

مگر افسوس صد افسوس اس ناقص العقل لڑکی سے۔ جس نے سارا موڈ غارت کر کے رکھ ڈالا۔ دانت دکھانا تو کجا وہ مسکرائی بھی نہ تھی۔ اوپر سے منہ لٹک کر گھٹنوں تک پہنچ گیا تھا۔ چہرے پر ایسی مظلومیت چھائی تھی کہ نبیلہ کو اپنے اوپر ظالم جادوگرنی کا گمان ہونے لگا جس نے معصوم شہزادی کو قید کر ڈالا ہو۔

اور عین ممکن تھا کہ وہ بھی نیرا کے غم میں پوری کی پوری شریک ہو جاتی اور ایسا دھواں دھار روتی کہ پشتے کے پشتے بہہ جاتے مگر بھلا ہو عمی کا جس نے عین کلائمکس پر کمرے میں اینٹری دی اور اس کی توجہ عمی کی جانب مبذول ہو گئی۔

''کچھ سنا تم نے لڑکیو۔''

لہجہ اشتیاق بھرا تھا اور چہرہ ذرا غور فرمایئے کی تصویر۔

''کیا.....؟''

نبیلہ بھی جان بوجھ کر تجسس کے دریا میں غوطہ زن ہو گئی۔ حالانکہ جانتی تھی کہ کون سی خبر اسے یہاں کھینچ لائی تھی۔

''وہ اپنے جلال بھائی ارے وہ منگنی پر رضامند ہو گئے ہیں۔''

''واقعی۔'' نبیلہ نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھاڑنے کی ناکام کوشش کی۔ مگر ناکامی افسوس اس کی چھوٹی آنکھیں ہمیشہ اس کی کوشش کو ناکام بنا دیتی تھیں۔

''جی جناب۔''

''مگر کس کے ساتھ۔'' نبیلہ نے کن اکھیوں سے بے نیازی کی مورت بنی نیرا کو دیکھا۔

''ظاہر ہے ایک لڑکی کے ساتھ۔'' عمی نے سارا مزہ کرکرا کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ نیرا کا نام سننا چاہتی تھی تاکہ اسے ستا سکے۔ مگر یہ عمی کا بچہ سب گڑبڑ کر دیا۔

''اچھا یہ تو بڑی غم ناک خبر سنائی تم نے کہ جلال بھائی کی منگنی ایک لڑکی کے ساتھ ہو رہی ہے۔'' نبیلہ کا لہجہ تاسف بھرا تھا۔ اور ایسا صرف عمی کو شرمندہ کرنے کے لیے تھا۔

''ہاں ہے تو ایسا ہی۔ مگر نبیلہ ایک بات تو بتاؤ یہ لڑکیاں آخر اتنی خوفناک کیوں ہوتی ہیں؟'' عمی نے معصومیت سے اسے دیکھا۔

''مجھے نہیں پتہ۔'' ڈھیٹ بندہ بجائے شرمندہ ہونے کے کیسے بول رہا تھا۔

''حیرت ہے کہ تمھیں نہیں معلوم حالانکہ دیکھنے میں تو تم بھی خاصی بھیانک ہو۔''

''کیا..... کیا۔'' عمی کی بات پر آستین ہی تو چڑھالی تھیں اس نے۔

''ارے میں ڈرنے والا نہیں حق بات کہنے میں ڈر کیسا۔ بے شک نیرا سے پوچھ لو۔ ابھی کل ہی تو میں خان صاحب کو ہسپتال پہنچا کر آیا ہوں۔ بے چاروں کی قسمت خراب تھی جو رات کو چھت پر چہل قدمی کے لیے تشریف لے گے۔ اب جو غلطی سے نظر ہمارے گھر کی طرف اٹھ گئی تو سیدھی تم پر پڑی۔ بس پھر کیا تھا مارے دہشت کے ہارٹ فیل ہو گیا ان کا۔ ہائے معصوم خان صاحب۔''

عمی تو نان اسٹاپ بولے چلا گیا۔ اور اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ کرسی پر پڑا کشن کھینچ کر اسے دے مارے۔

''اب کیا میرا ہاٹ فیل کرواؤ گی۔ کرنا ہی چاہتی ہو تو صرف مسکرا دو۔ سچی ابھی بے ہوش ہو جاؤں گا کیوں نیرا؟'' عمی نے نیرا کو بھی گھسیٹا۔

''مم..... مجھے کیا معلوم؟'' نیرا بوکھلائی۔
''چہ..... چہ مارے خوف کے تمھاری تو زبان ہی لڑکھڑانے لگی۔ ہائے ہائے خدا ایسی کزن کسی کو نہ دے۔'' عمی نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ تو نیرا کی ہنسی چھوٹ گئی۔
''کیوں ہنس رہی ہو تم؟'' وہ نیرا پر چڑھ دوڑی۔ آخر کھسیانی بلی کھمبا نوچے کی مثال بھی تو پوری کرنی تھی۔ اس عمی کے بچے کو زچ کرنا ایک مشکل مہم تھی اور مشکل پسند وہ تھی نہیں۔
''ہنسنا منع تو نہیں۔'' نیرا کے بجائے عمی کی طرف سے جواب آیا۔
''اور وہ ہنسے کیوں ناں۔ اس کی تو عمر ہی ہنسنے کھیلنے کی ہے۔ ارے جب تم جیسی بڈھی گھوڑی ہنس سکتی ہے تو پھر نیرا کیوں نہیں۔''
''کیا..... کیا میں بوڑھی ہوا اور تم..... تم کیا ہو بڈھے کھوسٹ۔'' وہ روہانسی تھی۔
''ارے جو مرضی کہو جتنا مرضی چاہو ہو تو مجھ سے بڑی ہی۔ اب اگر میں بڈھا ہوں تو تم بڑی اماں۔ ذرا منہ تو کھولو۔ شاباش کہیں نقلی بتیسی گر تو نہیں گئی۔'' عمی کا لہجہ اپنائیت بھرا تھا۔
''بکو نہیں۔'' ایک آدھ آنسو تو زبردستی ہی گالوں پر لڑھک آیا۔ یہ عمی کا بچہ ہمیشہ اس بات کو کیش کروالیتا تھا کہ وہ اس سے پورے ایک گھنٹہ بڑی ہے۔ خبیث نالائق۔
''کیوں تنگ کر رہے ہو عمی نبیلہ کو۔'' نیرا کب تک لاتعلق بنی رہتی اور پھر عمی کو بکواس اکیلے سہنا خاصے دل گردے کا کام تھا اور نبیلہ خاصی چھوٹے دل کی تھی۔
''کوئی ضرورت نہیں ہے ہمدردی کی۔''
اس سے پہلے کہ عمی کچھ کہتا نبیلہ نے غصے سے نیرا سے کہا۔
''بدتمیز لڑکی اتنی دیر سے تماشا دیکھ رہی تھی۔ بڑی جلدی خیال آیا تھا اسے مدد کا۔ اب بھی کیا ضرورت تھی۔ ذرا اور رو لینے دیتیں۔''

''ہا..... ہا..... ہا۔'' عمی بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔
''اور کرو ہمدردی ڈیئر نیرا اس جنگلی بلی سے۔''
''بس عمی بہت ہو گیا۔ اب چپ کر جاؤ۔''
نیرا کا انداز مصالحتی تھا اور مصالحت از حد ضروری تھی وگرنہ ان دونوں کی لڑائی سارا دن ہی جاری رہتی۔
''اچھا تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں کیونکہ اب تو تمھارا اور میرا رشتہ اور پکار ہو گیا ہے۔'' عمی کی شوخ بات بھی اسے مسکرانے پر مجبور نہ کر سکی۔ جانتی تھی وہ کس تعلق کی بات کر رہا ہے۔ اس کے اور جلال کے تعلق کی۔ مگر جانے کیوں اس خبر نے اسے خوش نہیں کیا تھا۔ وہ افسردہ تھی۔
''ارے اس طرح گم صم کیوں ہو گئیں۔ کیا مارے خوشی کے سکتہ ہو گیا۔'' عمی نے اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی انگلیاں نچائیں۔
''یا پھر شرما رہی ہو۔'' اس نے تائید چاہی۔ مگر وہ سر جھکائے خاموش تھی۔
''بھئی دیکھو یہ خاموشی انہیں چلے گی۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم نبیلہ کی محبت کا کچھ تو اثر دکھاؤ۔ سچی اگر یہ تمھاری جگہ ہوتی تو ایسی خبر سنتے ہی دھمال ڈالنا شروع کر دیتی۔ مگر افسوس بیچاری کو کوئی گھاس ہی نہیں ڈالتا۔''
ایسا کب ممکن تھا کہ وہ نبیلہ کو چھیڑے بغیر رہ جائے۔
''ہائے ہائے بیچاری۔'' وہ شرارت سے نبیلہ کو تک رہا تھا اور نیرا موضوع بدل جانے پر خوش۔
''نہیں کوئی گھاس ڈالتا تو نہ ڈالے۔ تمھیں کیا تکلیف ہو رہی ہے؟''
نبیلہ نے تڑخ کر کہا۔ یہ بھی ممکن نہ تھا کہ عمی اسے چھیڑے اور وہ جواب نہ دے۔
''تکلیف سی تکلیف۔ ارے میں تو دن رات

اس دکھ سے تڑپتا رہتا ہوں کہ کب میری اس کزن کا بیڑا پار ہوگا۔ سچ اب تو راہ چلتے لوگ بھی مجھ سے ہمدردی کرنے لگے ہیں۔'' ممی کی آواز پرسوز تھی۔

''ہائے..... ہائے اس ظالم دنیا نے یہ دن بھی دکھانا تھا۔ ابھی پرسوں ہی تو کلو سبزی والا ملا تھا کہہ رہا تھا کہ عمی بھائی مجھ سے آپ کا دکھ بالکل نہیں دیکھا جاتا۔ اگر آپ کہیں تو اپنے سالے کی منت سماجت کرلوں۔ مانے گا تو مشکل سے ہی مگر آپ کی خاطر ایسا بھی کر گزروں گا۔ کمبخت کا اسٹینڈر بھی تو خاصا اونچا ہوگیا ہے' جب سے حلوائی بنا ہے سمجھتا ہے ساری دنیا کو اپنی گھی کی کڑاہی میں ڈبو کر رکھ دے گا اور.....''

''اور..... تم نے ایک لفظ بھی مزید کہا تو تمھیں اور اس حلوائی کے بچے کو تیل میں ڈبو دوں گی۔'' نبیلہ اس ہمدردی پر جل بھن کر خاک ہوگئی۔

''قاتلہ کہلاؤ گی وہ بھی چھ ننھے ننھے بچوں کے ابا کی۔''

''کتنے بچے؟'' وہ چیخی۔

''ہیں تو پورے بارہ مگر کلو نے کہا تھا چھوہی بتانا۔ ورنہ سالے کی اصل عمر کا پتہ چل جائے گا۔ کیونکہ دیکھنے میں تو وہ ساٹھ ستر سے اوپر کا نہیں لگتا۔''

''کیا..... کیا ساٹھ ستر۔'' نبیلہ بے ہوش ہونے کو تھی غصے کے مارے۔

''شرم تو نہ آئی تمھیں اس کلو بینڈے سے یہ بکواس سنتے ہوئے بے شرم ڈھیٹ۔''

''دیکھا نیرا تم نے رشتے کی بات سنتے ہی اس نے ناچنا شروع کردیا ہے اور ایک تم ہو کہ۔''

''مگر.....'' وہ جملہ مکمل نہ کرسکا کیونکہ اس نے کمرے سے دوڑ لگا دی تھی اور نبیلہ اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

رات خاصی بھیگ چکی تھی۔ مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اور ایسا محض جلال کی وجہ سے تھا۔ بزرگوں نے جلال اور اس کی منگنی کا اعلان کردیا تھا اور اس خبر نے اسے کوئی خوشی نہ بخشی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ جلال میں کوئی کمی تھی۔ وہ کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل کہلایا جا سکتا تھا۔ خوبصورت وجیہہ شکل۔ اعلیٰ عہدے پر فائز کسی چیز کی کمی نہ تھی اس میں۔ مگر وہ خود کیا تھی۔ وہ کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہونا چاہتی تھی۔ وہ خاصی حقیقت پسند تھی' بھلا اس کا اور جلال کا کیا جوڑ اور وہ بھی خاندان میں درجن بھر سے زائد حسیناؤں کی موجودگی میں۔ یقیناً یہ فیصلہ خالصتاً بزرگوں کا تھا۔ جلال کی مرضی و منشا پوچھے بغیر اور ایسے بے جوڑ رشتے حقیقتاً دکھ دیتے ہیں۔ یہ بات خاصی سیدھی اور واضح تھی۔ مگر افسوس بھی اس بات کو۔ اس حقیقت کو نظرانداز کر گئے تھے وہ کڑھ رہی تھی۔

جانے جلال کے کیا ارمان رہے ہوں گے۔ اس نے کیسے کیسے خوشنما تصورات سے اپنی سوچوں کو مزین کیا ہوگا۔ اور وہ خود اس پر ایک ناخوشگوار بوجھ کی مانند مسلط تھی۔ وہ جانتے بوجھتے کسی کو ذہنی کوفت میں مبتلا نہ کرسکتی تھی۔

بے شک جلال اسے اچھا لگتا تھا۔ مگر یہ کوئی ضروری نہ تھا کہ وہ بھی جلال کو اچھی لگتی۔ وہ کروٹیں بدلتے بدلتے تھک گئی تھی مگر نیند' وہ آنکھوں میں نہ اتری تھی۔ نیرا بستر سے اتر کر کھڑکی کے پاس چلی آئی۔ باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ چاند اپنے پورے جوبن پر تھا اور ہر شے اس کی دودھیا روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔ اس نے اونچے لان میں جھانکا۔ لان میں کوئی موجود تھا۔ مگر کون؟ وہ تجسس تھی بھلا اتنی رات کو لان میں کون ہوسکتا تھا۔ وہ تھوڑا اور جھکی نظروں کے حصار میں جلال کا چہرہ تھا وہ ساکت تھی۔

یقیناً بزرگوں کا کیا فیصلہ اسے بے چین کیے ہوئے تھا۔ جبھی تو اتنی رات کو وہ لان میں بے قرار پھر رہا تھا۔ نیرا افسردہ تھی۔ اس کی وجہ سے ایک بندے کی پرسکون زندگی میں تلاطم برپا تھا اور ایسا دانستہ نہ تھا۔ اسے جلال پر یہ واضح کردینا چاہیے تھا کہ یہ فیصلہ محض بزرگوں کا ہے اور اس کی ہمدردیاں جلال کے ساتھ ہیں اور یہ بات بتانے کے لیے یہ موقع نہایت مناسب تھا وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی لان میں چلی آئی۔

''جلال۔'' اس نے دھیرے سے پکارا۔

''تم اور یہاں۔'' وہ اسے اپنے سامنے پا کر واضح طور پر چونکا تھا۔

''ہاں..... میں' مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' نیرا نے لب کچلا۔ کتنی آسانی سے وہ یہاں تک چلی آئی تھی۔ مگر اب محسوس ہوا کہ مدعا بیان کرنا کتنا مشکل ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں اسے دور کر رہی تھی۔ جسے اس نے لاشعوری طور پر چاہا تھا جو اس کی سوچوں میں شامل تھا۔ نیرا نے دیکھا وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''جلال وہ جو بات ہمارے بڑوں کے درمیان ہوئی اس میں میری کوئی مرضی نہیں۔ اگر تم چاہو تو انکار کرسکتے ہو اور.....'' اس کی سانس پھول گئی تھی۔ زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔ یوں جیسے وہ ایک لمبی مسافت طے کر کے آئی ہو مزید کچھ کہنا مشکل تھا۔ آنسو کسی بھی لمحے بے قابو ہوسکتے تھے۔ وہ بات ادھوری ہی چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی اور جلال محض اسے دیکھتا رہ گیا۔

صبح کی آمد ناخوشگواریت کو اپنی جلو میں لائی تھی اور یہ سب جلال کے انکار سے تھا۔ اس نے نیرا کو اپنانے سے انکار کر ڈالا تھا۔ ابا' اماں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ کسی طور پر راضی نہیں ہو رہا تھا اور اس سے پہلے کہ ان کے درمیان کوئی تلخی جنم لیتی وہ اٹھ کر مانی کے کمرے میں چلا آیا۔

''یار یہ کیا حرکتیں کرتے پھر رہے ہو تم۔''

مانی نے اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر پوچھا۔ بھائی کا انکار اسے پسند نہ آیا تھا۔ نیرا ایک اچھی لڑکی تھی۔

''کیسی حرکتیں؟'' جلال نے کرسی سنبھالی۔

''معصوم بننے کی کوشش مت کرو میں نیرا سے شادی سے انکار کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔''

''کیوں کیا بی۔ بی۔ سی جوائن کرلیا ہے۔'' جلال نے بات ٹالنے کی ناکام کوشش کی۔

''دیکھو بھائی اس وقت میں مذاق کے بالکل موڈ میں نہیں ہوں اور تم بھی کسی خوش فہمی میں مت رہنا کہ مجھ سے پیچھا چھڑا لو گے۔'' مانی خطرناک حد تک سنجیدہ تھا۔

''مجھے انکار کی وجہ بتاؤ کون ہے وہ؟''

''کون بھئی؟''

''جس کی وجہ سے انکار کررہے ہو؟''

''بخدا کوئی بھی نہیں۔'' جلال مانی کی غلط فہمی پر مسکرایا۔

''تو پھر انکار کیوں کیا؟'' مانی کو جلال کی بات پر خاصی حیرت ہوئی۔ اگر واقعی کسی حسینہ کا چکر نہ تھا تو پھر یہ انکار۔

''وجہ بتانا ضروری ہے کیا؟'' جلال کا لہجہ اکتاہٹ بھرا تھا۔

''ہاں۔''

''اگر نہ بتاؤں تو؟'' وہ اسے کیا بتاتا۔ نیرا اسے پسند تھی۔ مگر شاید وہ اسے پسند نہیں کرتی تھی۔ جبھی تو رات کو اس نے اپنی مرضی اس پر واضح کی تھی اور وہ اتنا خودغرض نہ تھا کہ محض اپنی پسند کی خاطر وہ نیرا کو ایک ایسے فعل پر مجبور کر دیتا۔ جس پر وہ قطعی رضامند نہ تھی۔

''تو میرے ہاتھوں خرچ ہو جاؤ گے۔'' مانی نے منہ بنایا۔

''اتنی ہمدردی ہے نیرا سے؟''

''ہاں ہے۔''

''اگر میں کہوں وہ بھی ایسا چاہتی ہے تو؟''

''بکواس ایک دم بکواس۔'' مانی نے مکا ہتھیلی پر جمایا۔

''تم اپنا قصور اس کے سر منڈھ رہے ہو۔''

''اعتبار کرو میرا سچ کہہ رہا ہوں اسی کی وجہ سے میں نے انکار کیا ہے۔ کیونکہ وہ ایسا نہیں چاہتی۔''

''مگر کیوں؟'' مانی کو اچنبھا تھا۔

''وجہ تو مجھے معلوم نہیں۔'' جلال نے سر جھکا لیا۔ چہرے پر نامعلوم سی اداسی پھیل گئی۔

''پسند کرتے ہو اسے۔'' مانی نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ یہ لفظ پسند اس دیوانگی کو واضح کرنے کے لیے ناکافی تھا جو اس کے دل میں نیرا کے لیے تھا۔

''ہاں۔'' اس نے جیسے اعتراف جرم کیا تھا۔

''تو پھر انکار کیوں کیا ہے بے وقوف۔'' مانی جھلایا۔

''بتایا تو ہے تمھیں کہ وہ ایسا نہیں چاہتی۔ اور زبردستی میں کوئی رشتہ جوڑنا نہیں چاہتا۔''

جلال کی آواز بوجھل تھی اور فضا مکدر منزل پاس ہوتے ہوئے بھی دور تھی وہ ساحل پر آ کر ڈوبا تھا۔

''میں وجہ معلوم کروں؟''

''کیا فائدہ۔'' جلال کے لبوں کو ایک تلخ مسکراہٹ چھو گئی۔

''نقصان بھی کوئی نہیں۔'' مانی فیصلہ کن لہجے میں کہتا باہر نکل گیا۔ جلال کا دکھ اس کے اندر تک اتر گیا تھا۔

''نیرا کچھ سنا تم نے؟'' نبیلہ خاصی بوکھلائی ہوئی تھی۔

''کیا.....؟''

''وہ جلال بھائی نے منگنی سے انکار کر دیا۔''

نبیلہ کی بات پر جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا تھا۔ حالانکہ وہ رات ہی سے کسی ایسی ہی خبر کی منتظر تھی۔ اس نے اپنے دل و دماغ کو پہلے ہی آمادہ کر لیا تھا۔ مگر اب اس خبر کو سنتے ہی دل نے ماتم شروع کر دیا تھا۔ وہ کب تھا اس کا۔ وہ اس کا کبھی بھی نہ رہا تھا۔ مگر یہ بات دل کو سمجھانا بے حد مشکل تھا۔

''تمھیں کوئی حیرت نہیں ہوئی؟'' نبیلہ اس کی بے حسی پر چلائی۔

وہ زبردستی مسکرائی۔ اس نے خود ہی تو جلال سے انکار کرنے کو کہا تھا اور جو اس نے چاہا ویسا ہی ہوا۔ کیا بجا تھا اس کے پاس کہنے سننے کو۔ وہ اس پگلی لڑکی کو کیونکر سمجھا پائے گی کہ اس نے اپنے ہاتھوں اپنی کشتی ڈبوئی ہے۔ اس نے اپنا چمن خود اجاڑا ہے۔

''نیرا کہیں تم نے تو کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی۔ جلال بھائی سے؟'' جمیلہ نے مشکوک نظروں سے اسے گھورا۔ وہ اس بات سے اچھی طرح باخبر تھی کہ نیرا نے منگنی کی خبر سن کر کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہ کیا تھا اور عین ممکن تھا کہ اس سر پھری لڑکی نے کوئی غلط حرکت ہی کر ڈالی ہو۔

''بولو کیا کہا تھا تم نے جلال بھائی سے؟'' اس کا انداز جارحانہ تھا۔

''خوہ..... وہ نبیلہ۔'' نیرا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ رات سے دل پر بوجھ لیے پھر رہی تھی۔ اسے کسی ہمدرد، کسی غمگسار کی ضرورت تھی۔ اور نبیلہ سامنے ہی موجود تھی۔

''بکو کیا کہا تم نے؟''

''وہ..... وہ میں نے کہا کہ جو بات ہماری بڑوں کے درمیان ہوئی اس میں میری مرضی نہیں۔'' وہ سسکی۔

''اور کیا کہا۔''

''اور کہا کہ اگر تم چاہو تو انکار کر سکتے ہو۔''

''اف خدایا۔'' نیرا کے کارنامے پر اس کا سر ہی تو گھوم گیا۔ ساری وجہ معلوم ہو گئی تھی انکار کی کی کیسی احمق لڑکی تھی۔

''مگر کیوں کیا تم نے ایسا کیا جلال بھائی اچھے نہیں۔''

''ہیں۔''

''کیا تمھیں پسند نہیں؟''

''ہیں۔''

''تو پھر بے وقوف لڑکی انکار کرنے کو کیوں کہا؟''

''نبیلہ کے نزدیک نیرا کے پاگل ہونے کے سارے ثبوت پکے تھے۔

''کیونکہ ..... کیونکہ میں جلال کو پسند نہیں۔'' آنسو ایک بار پھر بے قابو تھے۔

''تم سے کس نے کہا؟'' نیرا کی بات پر نبیلہ چونکی۔

''کیا خود جلال بھائی نے۔''

''نہیں۔''

''تو پھر کس نے کہا؟''

''میرا اپنا خیال ہے۔'' اس نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں رگڑیں اور نبیلہ اس کے خیال پر اپنا سر پیٹ کر رہ گئی۔ ایسا عمدہ اور اعلیٰ خیال اس کے سر میں گھسا کیسے حیرت نبیلہ کو اس بات پر بھی تھی۔

''یہ خیال تمھیں آیا کیسے کوئی وجہ تو ہو گی؟''

''ہاں وجہ ہے وہ اتنے ہینڈسم اتنے خوبصورت اور میں..... میں تو بالکل بھی اچھی نہیں اور پھر خاندان میں اور بھی تو اتنی پیاری پیاری لڑکیاں ہیں میرا اور جلال کا کیا جوڑ؟''

''ہاں واقعی مگر دل تو گدھی پر بھی آ جاتا ہے۔'' آخری جملہ اس نے خاصی ہلکی آواز میں کہا تھا۔ کیونکہ مانی نے اسے بتایا تھا کہ دل واقعی نیرا پر آ چکا ہے جلال بھائی کا۔

''کیا کہا؟'' نیرا اس کی بڑبڑاہٹ پر چونکی۔

''کچھ نہیں ..... کچھ نہیں تم اپنی بات جاری رکھو۔''

''دیکھو ناں اس گھر میں تم بھی موجود ہو اور خاصی خوبصورت ہو کیا معلوم جلال کا۔''

''خبردار جو ایک لفظ بھی مزید منہ سے نکالا ہو تو۔ قتل ہو جاؤ گی میرے ہاتوں۔ جلال بھائی صر میرے بھائی ہیں اور کچھ بھی نہیں۔'' نیرا کی بات پر نبیلہ کو پتنگے ہی تو لگ گئے تھے۔

''نہایت ہی فضول سوچیں میں تمھاری علاج کروانا پڑے گا تمھارے دماغ کا۔''

''سوری نبیلہ۔'' نبیلہ کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھ کر نیرا کو احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط بول گئی ہے۔ بلکہ اکثر اوقات وہ غلط بول جایا کرتی تھی۔

''اٹس آل رائیٹ مگر آیندہ دھیان رکھنا۔''

''اچھا بابا۔'' نیرا نے کان پکڑے تو نبیلہ ہنس دی۔

''پھر کیا خیال ہے تمھارا میرے خیال کے بارے میں؟''

''نہایت عمدہ۔'' نبیلہ کے الفاظ نیرا کو خوش کر گئے اور نبیلہ اسے معنی خیز انداز سے دیکھ کر رہ گئی۔

''اچھا تو یہ بات ہے۔'' جلال کھل کر مسکرایا۔

''میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا وجہ معلوم کر لو۔ فائدے میں رہو گے۔'' مانی نے کالر جھاڑے۔

''ہاں یار سچ کہا تھا تو نے مگر تجھے وجہ معلوم کرنے کا خیال کیوں آیا؟''

''وہ اس لیے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ نیرا کچھ کھسکی ہوئی ہے۔''

''اوئے، بدتمیزی نہیں۔'' جلال نے اسے

گھورا۔

''ہائے..... ہائے یہ تڑپ۔'' مانی نے چھیڑا تو جلال کھلکھلا کر ہنس دیا۔

''میری جگہ تو ہوتا تو تیرا بھی کچھ ایسا ہی حشر ہوتا۔''

''غلط فہمی جناب ہم تو ستم گر کو ایسا تڑپاتے کہ یاد رکھتا۔''

''ہاں جبھی چوبیس گھنٹے نبیلہ سے لڑتے رہتے ہو۔'' جلال نے مانی کو شرمندہ کرنا چاہا۔

''ارے اس میں ہی تو مزہ ہے۔'' مانی ڈھٹائی سے مسکرایا۔

''ہاں مزہ تو اس وقت آئے گا جب وہ انکار کرے گی۔''

''مجال ہے اس کی جو انکار کرے۔ آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے نہیں ہم۔''

''واقف ہوں تمھاری اس خوبی سے۔ پکے لسوڑے ہو۔'' جلال مسکرایا۔

''جو مرضی کہو پکایا کچا' فائدہ تو پہنچ گیا ناں تمھیں میری اس خوبی سے۔ وگرنہ رو رہے ہوتے سر پکڑ کر۔''

''یار صحراؤں اور جنگلوں کا تو رخ سنا تھا۔ یہ باغوں کا کیا منطق ہوئی؟''

''بالکل صحیح منطق ہے تم خود ہی انصاف کرو کہ جتنی تعداد میں لوگ ہمارے یہاں صحراؤں کا اور جنگلوں کا رخ کرتے ہیں اس کے حساب سے تو وہ اب تک بھر چکے ہوں گے۔ تو بھائی شور شرابے میں جانے کیا فائدہ۔''

''یار ایک بات اور ہو سکتی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''وہ یہ کہ تم پاگل خانے داخل ہو جاؤ۔''

''وہ کس خوشی میں۔'' جلال نے ایسے خوبصورت مشورے پر مانی کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

''وہ اس لیے بڑے بھائی کہ اس میں تمھارا ہی فائدہ ہے۔''

''کیسا فائدہ؟''

''دیکھو ناں جس طرح کی حرکتیں نیرا کرتی ہے' عین ممکن ہے کہ کوئی اسے پاگل خانے داخل کروا دے۔ تو بھائی ایڈوانس بکنگ کیوں نہ کروا لی جائے پاگل خانے میں تمھیں داخل کروا کر۔''

مانی کا لہجہ مخلصانہ تھا۔

''ورنہ اگر تم دونوں اکٹھے بند نہ ہوئے تو مشکل ہو جائے گی۔ ایک پاگل خانے میں اور دوسرا گھر میں۔ میں تو پاگل ہو جاؤں گا تم لوگوں کے ٹریجڈی گانے سن سن کر۔''

''اور اگر تم نے اپنی بکواس مزید جاری رکھی تو وہ پٹائی کروں گا کہ ساری عمر خود ہی ٹریجڈی گانے گاتے رہو گے۔''

''ہاں بھئی یہی صلہ تو ملنا تھا نیکی کا۔'' مانی نے منہ بنایا۔

''چلو کھسکو یہاں سے۔'' جلال نے اسے باہر کی سمت دھکیلا اور دروازہ بند کر دیا۔

''وہ نبیلہ کے ساتھ لان میں بیٹھی تھی۔ باہر کا موسم بے حد خوشگوار تھا۔ مگر اس کے اندر کا موسم۔ اس کے برعکس تھا۔ لاکھ وہ نارمل نظر آنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ مگر ایک نامعلوم سا اضطراب اس کی نگاہوں میں ٹھہر سا گیا تھا۔ اور یہ اضطراب' یہ بے چینی جلال کی وجہ سے تھی۔ وہ انکار کر کے بے حد مطمئن تھا۔ اور وہ انکار سن کر شکستہ خاطر اس نے گزرتے دنوں میں کبھی بھی جلال کو اتنا خوش نہ دیکھا تھا۔ جتنا وہ اب نظر آتا تھا۔ اور جلال کی یہ خوشی یہ مسرت اسے اندر تک توڑ پھوڑ گئی تھی۔

''ہیلو ڈیئر کزنز کیا ہو رہا ہے؟''

اس کے قریب ہی جلال کی آواز ابھری تو وہ چونک اٹھی۔ وہ نبیلہ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ رہا تھا۔ دل اس کو سامنے پا کر تڑپ اٹھا تھا۔ مگر یہ

تڑپ لاحاصل تھی۔ بھلا ساحل کی گیلی ریت سے بنے گھروندے بھی پائیدار ہوتے ہیں۔ ان کا مقدر تو لہروں میں بہہ جانا ہوتا ہے۔

''کچھ نہیں فارغ بیٹھے موسم انجوائے کر رہے ہیں۔ آپ اپنی سنایئے بڑے خوش نظر آتے ہیں آج کل۔'' نبیلہ مسکرائی۔

''میں خوش کب نہیں ہوتا۔'' جلال نے نیرا کے جھکے سر کو دیکھا۔ وہ خاصی مضطرب دکھائی دے رہی۔

''ہاں ہوتے تو ہمیشہ ہی ہیں مگر میں آج کل کا پوچھ رہی ہوں۔ ایسا کیا خزانہ ہاتھ لگ گیا آپ کے۔''

نیرا کو نبیلہ کی یہ کرید دکھ پہنچا رہی تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھ سکتی تھی جلال کے خوش ہونے کی وجہ۔ اس کی آنکھیں اور کان بند نہ تھے۔ وہ جلال کی مسکراہٹوں کو بے قابو ہوتے دیکھ سکتی تھی۔ وہ اسکی شوخ باتوں کو بھی سن سکتی تھی۔ اور ان مسکراہٹوں اور شوخیوں کا اس انکار سے گہرا تعلق بنتا تھا۔ جو اس کے لبوں سے مسکراہٹ چھین کر لے گیا تھا۔

''ہاں کہتی تو تم ٹھیک ہو واقعی مجھے خزانہ مل گیا ہے۔''

جلال کی زندگی سے بھرپور آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''کیسا خزانہ ہم لوگوں سے بھی پردہ داری کریں گے۔''

''ارے نہیں بھئی۔''

''تو پھر بتایئے ناں۔'' نبیلہ چہکی اور نیرا کے لیے مزید وہاں رکنا دشوار تھا۔ مگر افسوس عین اسی لمحے جلال نے کرسی کا رخ بدلا تھا۔ اب وہ اس کے مقابل تھا اور پیچھے دیوار اور اسے وہاں سے گزرنے کے لیے جلال کو مخاطب کرنا ناگزیر ٹھہرا تھا۔ اور مخاطب کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔

''بس یہ سمجھ لو کہ میری منزل مجھے مل گئی۔''

بے چینی سے پہلو بدلتے اس کی نظر بے اختیار جلال کی جانب اٹھ گئی۔ کتنی چمک تھی اس کی آنکھوں میں سب کچھ پا لینے کا خمار خوبصورت تصورات کی جگمگاہٹ۔

''کتنا تڑپا تھا میں اس کے لیے۔ سچ نبیلہ ایک گام پر تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ میرا مقدر ہی نہیں۔''

''تو پھر؟''

''پھر کیا سچے جذبے تو اپنا آپ منوا ہی لیتے ہیں۔'' وہ ہنسا۔ دل کھول کر ہنسا۔ نیرا کا دل چاہا اسے کہہ ڈالے کہ بسا اوقات سچے جذبوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ ان پر تقدیر غالب آ جاتی ہے اور جب ناکامی ہی مقدر ٹھہرے تو کیسے سچے جذبے اور کیسا کھرا پن۔ اس نے بھی تو محبت کی تھی۔ اپنے سچے جذبات کے ساتھ مگر کیا ملا اسے۔

''کون ہے وہ؟'' بے اختیار ہی نیرا کے منہ سے پھسلا اور وہ زبان دانتوں تلے دبا کر رہ گئی۔ مگر الفاظ منہ سے نکل چکے تھے۔ اور اب کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ جلال اس کی جانب متوجہ تھا۔

''اگر میں نام نہ بتانا چاہوں تو۔'' جلال اس کی بے چینی پر مسکرایا۔ کتنا چھپایا تھا اس نے اپنی چاہت کو مگر اس ایک لمحے نے اسے بے نقاب کر دیا تھا۔ جلال کا جی چاہا کہ وہ زور زور سے قہقہے لگائے۔

''تو نہ بتایئے۔''

نیرا نے لب کچلے۔ کیوں قابو نہ پا سکی تھی وہ خود پر نیرا نے دل ہی دل میں خود کو کوسا۔

''ارے واہ کیوں نہ بتائیں۔'' نبیلہ چہکی۔

''ہم تو معلوم کر کے رہیں گے اس مہ وش کا نام۔ چلیے جلدی سے بتایئے۔ کوئی ہے وہ کیا حدود اربعہ ہے؟''

''نا بھئی اتنی آسانی سے میں نام بتانے والا

نہیں۔ اور پھر جلدی بھی کس بات کی ہے' پرسوں میری اور اس کی منگنی ہو رہی ہے' خود ہی دیکھ لینا۔''

''کیا..... کیا منگنی؟'' نبیلہ چلائی۔ جبکہ نیرا ساکت تھی۔

''منگنی۔'' اس کے لب کپکپائے۔ چہرہ دھواں دھواں سا تھا۔ دل اس کی دوری کے فیصلے کو تو سہہ گیا تھا مگر اتنی جلدی جلال کی کسی اور سے وابستگی پر احتجاج پر آمادہ تھا۔ جلال' جلال دل کی ہر دھڑکن اس کا نام پکار رہی تھی۔

''ہاں جناب منگنی۔''

''مگر جلال بھائی اتنی جلدی یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' نبیلہ حیرت کے دریا میں ڈبکیاں لگا رہی تھی۔ بھلا یہ سب کچھ اتنی جلدی کیسے ممکن تھا۔ ابھی تو نیرا حقیقت حال سے آگاہ بھی نہیں تھی۔ کہیں کہیں کوئی اور لڑکی تو پسند نہیں کر لی۔ نبیلہ کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔

''کہیں آپ نے اس نیرا کو چھوڑ کر کوئی اور لڑکی تو تلاش نہیں کر لی؟''

نبیلہ کے جملے پر جلال نے بھنا کر اسے دیکھا۔ خاصا موٹا دماغ تھا اس نبیلہ کی بچی کا بھی۔ کتنا سمجھایا تھا کل مانی اور اس نے مل کر۔ کہ ابھی نیرا کو کچھ نہیں بتانا۔ تھوڑا ستانا ہے اس کو اس حماقت پر جو وہ دو زندگیاں تباہ کرتے چلی تھی۔ مگر ہی نبیلہ بدتمیز لڑکی مذاق کا بھی بھرم رکھنا نہ جانتی تھی۔

''نیرا کو چھوڑ کر کیا مطلب ہے۔ تم شاید بھول رہی ہو کہ میں نے اس سے منگنی سے انکار خاصے دن پہلے کر دیا تھا۔'' جلال نے بات سنبھالی۔

''اب ظاہر ہے پرسوں ہونے والی منگنی کسی اور ہی سے ہوگی۔''

جلال کے سخت جملے پر خود پر ضبط کرتی نیرا بے بس ہوگئی۔ اور آنسوؤں کا سیل رواں بہہ نکلا۔

''اور وہ جو کل مجھ سے کہا تھا کہ آپ نیرا کو پسند کرتے ہیں وہ جھوٹ تھا کیا؟'' نیرا کے آنسو دیکھ کر تو نبیلہ بھی روہانسی تھی۔

''ہاں ایکدم جھوٹ تھا۔''

حد سے زیادہ غصہ آ رہا تھا جلال کو اس الٹی کھوپڑی پر۔ سارے راز گل رہی تھی وہ تو شکر تھا کہ نیرا کا زور رونے پر زیادہ تھا۔ اور یوں بھی بقول مانی' نیرا کچھ ٹھسکی ہوئی ہے۔ اس لیے بھرم رہ گیا تھا۔

''اور مانی وہ بھی جھوٹ بول رہا تھا کیا؟'' دبی دبی سسکیاں منہ سے خارج ہوئیں۔

''ہاں..... ہاں وہ بھی۔''

''آہ..... آں۔'' جلال کے اعتراف پر باقاعدہ رونے کا پروگرام شروع تھا۔

''میں..... میں ہی تھی الو بنانے کو۔'' روتے روتے جملہ مکمل کیا گیا۔

''الو۔'' جلال نے دانت کچکچائے۔

''یہ غلط فہمی کیوں ہوگئی تمھیں خاصے عقلمند مشہور ہیں موصوف۔ کیوں نام بدنام کر رہی ہو ان کا۔''

''تو پھر کیا بنایا مجھے؟''

''پاگل۔'' اور شاید پاگل بن کا اعزاز ذہن ناتواں کو گراں گزرا تھا۔ تبھی تو وہ نیرا کے گلے لگ کر زور و شور سے ہچکیاں بھرنے لگی تھی۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد دونوں ایک ہی سر میں راگ الاپ رہی تھیں۔

''وہ تمھاری کچھ لگتی۔ اس کا تو دل چاہتا ہے گلا ہی دبا دوں۔'' جلال مانی پر برس رہا تھا۔

''ارے واہ ایسے کیسے گلا دبا دو گے۔ فالتو تو نہیں۔'' مانی کی آواز بھی خاصی بلند تھی۔

''آخر کوئی قصور بھی تو ہو۔''

''قصور..... قصور اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ موصوفہ کے پاس عقل نام کی کوئی شے ہی نہیں۔'' جلال کا غصہ کسی طور پر کم نہ ہو رہا تھا۔

''آخر ہوا کیا بتاتے کیوں نہیں۔'' جلال کے غصے پر مانی کا ماتھا ٹھنکا۔ ضرور دال میں کالا تھا۔ ورنہ نبیلہ تو جلال کو بھی عزیز تھی اور جواب میں جلال نے ساری روداد کہہ ڈالی۔

''واقعی سچ کہہ رہے ہو؟''

مانی کی صورت حال سے آگاہی کے بعد اچنبھا ہوا۔ اتنی کم عقل دکھائی تو نہ دیتی تھی نبیلہ مگر جلال نے جو بتایا وہ اس بات کی دلیل تھا کہ عقل واقعی نبیلہ کے دماغ میں موجود نہیں۔ سارا پلان بتایا تو تھا اسے۔ پھر بھی ایسی حماقت' واہ کیا کہنے ایسی موٹی عقل کے۔

''ایکدم سچ۔'' جلال پر جوش تھا۔

''تم وہاں موجود ہوتے تو یقیناً ایک ہاتھ جڑ دیتے۔ کیسی معصومیت سے پوچھ رہی تھی اور وہ جو کل مجھ سے کہا تھا کہ آپ نیرا کو پسند کرتے ہیں وہ جھوٹ تھا کیا؟''

جلال نے نبیلہ کی نقل اتاری۔

''کیا..... کیا ایسا کہا اس نے؟'' مانی مسکراہٹ پر قابو نہ پا سکا۔

''اب دانت کیا دکھا رہے ہو جانتے ہو کتنی مشکل سے ساری سچویشن سنبھالی تھی۔'' جلال جھلایا۔

''ہاں بڑے بھائی سمجھ سکتا ہوں تمھاری مشکل کو۔ مگر کیا کیا جائے۔ جب ہم دونوں کی قسمت میں ایسی دو کم عقل مستورات لکھی ہوئی ہیں۔''

''سچ کہتے ہو انکار بھی مشکل ہے۔ اس دل کمبخت کو بھی نیرا ہی پسند آئی تھی۔ اور تمھارے والے کو نبیلہ۔'' جلال بے بسی سے بولا۔

''ہاں یہ تو ہے مگر میں اپنے والی کو یہ سہولت ڈیل کر لوں گا۔ ذرا کرے تو ایسا شاہکار کارنامہ پھرے۔ دماغ درست کر دوں گا۔''

''ارے واہ تم کون ہوتے ہو دماغ درست کرنے والے؟'' نبیلہ جو نیرا کے ساتھ خاصی دیر سے مانی اور جلال کے بیچ ہونے والی گفتگو چھپ کر سن رہی تھی۔ خود پر قابو نہ رکھ پائی۔ اور پردہ اٹھا کر اندر چلی آئی۔ نیرا کا ہاتھ تھامے ہوئے لاکھ نیرا نے آواز نکالنے سے منع کیا تھا مگر یہ تو کبھی بھی ممکن نہیں رہا کہ وہ مانی کی بات کا پلٹ کر جواب نہ دے۔

''یار یہ تمھاری آواز ایکدم زنانہ کیسے ہوگئی۔'' مانی نے حیرت سے جلال کو دیکھا۔

''ابے گھامڑ میں تو بولا ہی کچھ نہیں۔''

''تو پھر یہ آواز کس نامعلوم و نادیدہ وجود کی ہے۔'' مانی نے سر کھجایا۔

''یار وہ بڑھا تو ہے ایسے وجود کے بارے میں جو بولتا ہے مگر دکھائی نہیں دیتا کیا کہتے ہیں اسے۔''

''میرا خیال ہے چڑیل۔'' جلال کو یاد آیا۔

''نہیں یار بدروح۔'' مانی کو یقین تھا۔

''بدتمیز میں ہوں۔'' نبیلہ ان کے قریب کر چلائی۔ مسئلہ ہی نہ حل ہو رہا تھا اور ان کا او الجھن اسے ہو رہی تھی

''کک..... کون؟'' دونوں بوکھلائے۔

''چچ..... چڑیل۔'' جلال ہکلایا۔

''نن..... نہیں بدروح۔'' مانی کانپا۔

''یار پہلے تو آواز آ رہی تھی اب تو سراپا نظ بھی آ رہی ہیں۔''

''ہاں مانی اور دیکھ تو بالکل نبیلہ جیسی ہے چڑیل۔'' جلال نے انکشاف کیا۔

''پتہ نہیں یار مجھے تو نبیلہ اس چڑیل جڑواں بہن لگتی ہے اور ذرا پیچھے دیکھ ایک اور

ہے۔"

"یعنی دو.....دو۔"

"مانی نالائق میں ہوں۔" نبیلہ نے اسے جھنجوڑا۔

"کون.....کون میں۔"

"میں چڑیل۔" نبیلہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ چڑیل بدروح کی گردان سن سن کر زبان نے پھسلنا ہی تو تھا سو پھسل گئی۔

"بھاگ جلال یہ تو اقرار کر رہی ہے۔" مانی بھاگا۔ مگر دو قدم آگے ہی جا سکا۔ کیونکہ پیچھے سے نبیلہ نے اس کی قمیض پکڑ رکھی تھی۔

"جلال میں تو گیا تو ہی کم از کم بھاگ لے۔" درد بھری پکار مانی کی تھی۔

"نہیں چھوٹے بھائی تو نے ہمیشہ مصیبت میں میری مدد کی ہے۔ میں تجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا مریں گے تو اکھٹے ہی۔"

"اونو۔" نبیلہ جھلائی۔

"آخر آپ میری بات سمجھ کیوں نہیں لیتے کہ میں۔"

"کہ تم چڑیل ہو۔ سچ اگر ہم دونوں اعتراف کر لیں تو چھوڑ دو گی۔" مانی کچھ سنبھلا۔

"اے کم گو چڑیل تم بھی ذرا سفارش کر دو۔" مانی نے ذرا پرے کھڑی نیرا کو پکارا۔

"مانی میں چڑیل نہیں نبیلہ ہوں۔" نبیلہ نے قدرے غصے سے کہا۔

"کیا تم نبیلہ ہو؟" مانی نے حیرت سے اسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔

"اگر تم نبیلہ ہو تو وہ کون ہے جو بچپن سے اس گھر میں رہ رہی ہے۔ تمھاری ہم شکل۔ اور یقین جانئے اصل نبیلہ جی یہ جو آپ کی ساتھی ہے ویسا ہی ایک پیس ہمارے گھر میں بھی ہے ویسے کیا نام ہے ان کا؟"

"نیرا۔" نبیلہ نے جل کر کہا۔

"کیا..... کیا نیرا اس نے بھی یہی نام رکھا ہوا ہے اپنا' کیوں جلال؟"

"ہاں مانی۔"

"اوہو جلال بھائی میں کوئی چڑیل نہیں ہوں نبیلہ ہوں نبیلہ۔ آپ کی پھوپھی زاد بہن۔" نبیلہ نے اپنا سر پیٹا۔

"سچ کہہ رہی ہو۔" جلال کو ابھی بھی شک تھا ان دونوں کی اصلیت کے بارے میں۔

"ہاں جلال بھائی ایکدم سچ۔" نبیلہ نے سچ پر زور دیا۔

"تو پھر وہ آواز کہاں سے آئی تھی؟"

"میں بولی تھی۔"

"مگر تم تو کمرے میں موجود نہیں تھیں۔" مانی نے پوچھا۔

"ہم دونوں پردے کے پیچھے تھے۔"

"کیوں.....؟"

"آپ کی باتیں سن رہے تھے۔"

"سب سن لیا کیا؟" جلال چلایا۔

"جی جناب اب آپ ہم لوگوں کو بے وقوف نہیں بنا سکتے کیوں نیرا؟" نبیلہ نے نیرا کو آگے کیا۔

"ہاں..... ہاں جی۔" نیرا لجائی۔ ساری باتیں اس نے اپنے کانوں سے سنی تھیں۔ اب کسی دلیل کی ضرورت تھی نہ ثبوت کی۔ جلال اس کا مقدر تھا۔ سچے جذبے اپنا آپ منوا چکے تھے۔

"مگر آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

"تم نے انکار کیوں کیا تھا۔ پہلے یہ بتا دو۔" وہ مسکرایا۔ تو نیرا ہنس دی۔ تھوڑی تھوڑی بے وقوفی دونوں نے ہی کی تھی۔ ایک نے انکار کے لیے کہہ کر اور دوسرے نے انکار کر کے۔ مگر شکر تھا کہ اس بے وقوفی کا انجام برا نہ تھا۔ اچھا اور خوشگوار مستقبل ان کا منتظر تھا۔

☆☆☆

فرزانہ سلیم

حاصلِ مطالعہ

القرآن

○ اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقے سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے اس غرض کے لیے پیش کرو کہ تمھیں دوسرے کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے۔ (سورۃ البقرہ)

○ یہ مال اور اولاد محض دنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرائش ہے۔ اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں اور انہی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ (سورۃ الکہف)

○ (اللہ کی ہدایت ہے کہ) یہ دین اسلام ہی میرا راستہ ہے جو سیدھا ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اللہ کے راستے سے جدا کر دیں گے۔ یہ ہے وہ ہدایت جو تمھارے رب نے تمھیں کی ہے تاکہ تم متقی (اور پرہیزگار) بن جاؤ۔ (سورۃ الانعام)

○ رہے وہ لوگ جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا ہے تو انھیں ہم بتدریج ایسے طریقے سے تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ انھیں خبر تک نہ ہوگی۔ میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں۔ میری چال کا کوئی توڑ نہیں ہے۔ (سورۃ الاعراف)

علینہ طارق' لاہور

حدیث نبویؐ

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"تم میں سے کسی کسی کے پاس شیطان آتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا؟ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا؟ یہاں تک کہ یہی سوال وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی دل میں ڈال دیتا ہے کہ جب ہر چیز کا کوئی نہ کوئی پیدا کرنے والا ہے پھر اللہ تعالیٰ کا پیدا کرنے والا کون ہے؟"

پس سوالات کا سلسلہ جب یہاں تک پہنچے تو چاہیے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگے اور رک جائے۔" (بخاری و مسلم)

معکنون شاہ' لاہور

تقویٰ

حضرت عمرؓ نے حضرت کعبؓ سے پوچھا۔

"تقویٰ کسے کہتے ہیں؟"

حضرت کعب نے حضرت عمرؓ سے کہا۔

"کیا آپ نے کبھی خاردار جھاڑیوں والے راستے سے سفر کیا ہے؟"

حضرت عمرؓ نے کہا۔ "ہاں۔"

حضرت کعبؓ نے پوچھا۔

"آپ جھاڑیوں میں سے کیسے گزرتے ہیں؟"

حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔

"میں اپنے کپڑے سمیٹ کر اور جسم بچا کر گزرتا ہوں کہ کوئی کانٹا مجھے لگ نہ جائے۔"

حضرت کعبؓ نے کہا۔

"یہی تقویٰ ہے یعنی یہ دنیا ایک خاردار جنگل ہے جس میں گناہوں کے کانٹے ہی کانٹے

ہیں۔ اس جنگل میں انسان کا اس طرح گزرنا کہ اس کا دامن گناہوں سے پاک رہے تقویٰ کہلاتا ہے۔"

فوزیہ غزل، رسالہ شیخوپورہ

شکر

حضور اکرمؐ نے فرمایا۔
میرے رب نے مجھے پیشکش کی کہ وہ میرے لیے مکہ کے پہاڑوں کو سونے کا بنا دیا جائے۔ تو میں نے عرض کیا۔
اے اللہ مجھے یہ پسند ہے کہ میں ایک دن پیٹ بھر کر کھاؤں تو دوسرے دن بھوکا رہوں تا کہ جب بھوکا رہوں تو تیری طرف داری کروں اور تجھے یاد کروں اور جب پیٹ بھروں تو تیرا شکر کروں اور تیری تعریف کروں۔

میاں منیر احمد انجم، فیصل آباد

میری گفتگوئے بے خودی

کچھ حاصل کرنے کے لیے مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے بشرطیکہ مطالعہ کرنا آتا ہو صرف کتاب کا مطالعہ نہیں انسانی چہروں، لہجوں، رویوں، سوچوں اور باتوں کا مطالعہ بھی ضروری ہے جو ہمیں حاصل کرنے کے اس عمل میں بہت کچھ کھو دینے کی اذیت سے محفوظ رکھتا ہے اور سب سے بڑھ کر اپنے نفس کا مطالعہ انسان کو زندگی کا ہر روپ دکھا دیتا ہے بس غیر جانبداری شرط ہے۔

سباس گل، رحیم یار خان

اقوال زریں

۱۔ اگر تم دوسروں کو زخم لگاؤ تو تمھارے زخم پر کون مرہم رکھے گا۔
۲۔ بندوں کے ساتھ سب سے بڑی برائی ان کے ساتھ جھوٹ بولنا ہے۔
۳۔ وہ شخص جو احسان کرنا نہیں جانتا وہ عام طور پر انصاف کرنا بھی نہیں جانتا۔
۴۔ جھگڑے اس لیے ختم نہیں ہوتے کہ ہم جھگڑے کو جھگڑے ہی کے ذریعے ختم کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

فرحین ملک، دہوریہ

گناہ کا حساب

پوچھے مے کشوں سے لطف شراب
عشق والوں سے عشق کا حساب
مت پوچھیے مجھ سے زود و زیاں کا سوال
میں نہ دے سکوں گی کچھ جواب
مجھے نہیں غرض لطافتوں سے زمانے کی
مجھ سے لیں ہر گناہ کا حساب

حنا ناز، پنڈ دادنخان

کچھ بات تھی تیرے لہجے میں

☆ جھنجلاہٹ کا سب سے موثر علاج ایک مخلص دوست ہوتا ہے جس پر چیخنے چلانے کے بعد آپ اس کی گود میں سر رکھ کر ڈھیر سارا رو سکیں۔
☆ محبتوں کی مروت میں کیا جانے والا ضبط بہت کڑوا ہوتا ہے۔
☆ ٹانگوں کی واضح لڑکھڑاہٹ بھی اگر کسی کو دکھائی نہ دے تو جی چاہتا ہے کہ وہیں گر جائیں۔ کیا فائدہ چلتے اور چلتے ہی چلے جانے کا۔
☆ کیا صدیوں کی مسافت کو ایک لمحے میں طے کیا جا سکتا ہے؟ جی ہاں اس وقت جب کسی کو آپ سے تم کہہ کر پکارا جائے۔
☆ جب فرصت آپ کو پریشان کرنے لگے تو ایسے میں خود سے ملاقات کی اپائنٹمنٹ لیجے۔ اس ملاقات سے آپ بہت کچھ حاصل کریں گے۔
☆ جب ہم کسی کی پروا کرنے لگیں جب کسی کا آنا جانا ہمارے لیے اہمیت اختیار کر لیتا ہے تو سمجھ لیجیے کہ آپ کو اس بندے سے محبت

ہے۔
☆ پاؤں گیلے کیے بغیر سمندر تو پار کیا جا سکتا ہے لیکن آنسو بہائے بغیر زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔

فریحہ امید چوہدری، گوجرانوالہ

مومن اللہ کا دوست

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کیسی مثال بیان کی۔ کلمہ طیبہ ایسا ہی ہے جیسے شجرہ طیبہ (اچھا درخت) اس کی جڑ گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ ہر وقت اپنے رب کے حکم سے اتنا پھل دیتا ہے یہ مثال اللہ لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے۔ تا کہ وہ سوچیں کہ کلمہ خبیثہ کی مثال شجرہ خبیثہ (برے درخت جیسی ہے) جو زمین کے اوپر سے اکھاڑ لیا جائے اور اس کے لیے کوئی ٹھہراؤ نہیں۔ اللہ ایمان والوں کو ایک قول ثابت کے ذریعے سے دنیا و آخرت میں عزت و استقامت عطا کرتا ہے اور ظالموں کو بھٹکا دیتا ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ (سورۃ ابراہیم)

اپنی شخصیت کی تعمیر کیجیے

بھول کر بھی
کامیابی کو دماغ میں اور
ناکامی کو دل میں جگہ نہ دیجیے
یاد رکھیے!
کامیابی دماغ میں جگہ پالے تو تکبر
اور ناکامی دل میں جگہ پالے تو مایوسی
بڑھ جاتی ہے
مثبت رویوں کے ساتھ
مثبت فکر کے ساتھ
اپنی شخصیت کی تعمیر کیجیے

ثمن حنا، کوٹ عبدالمالک

افسر

انسانی خدوخال کی مالک اکڑی ہوئی بے حس چیز کو افسر کہتے ہیں۔ ماتحتوں کے اے سی آر کے ہم مرتبہ وی سی آر بنانا اور اعلیٰ حکام کی خوشامد آفیسر کے بنیادی اصول ہیں۔ اس کے علاوہ فائلوں کو دبانا، جگانا سلانا یا مختصر سے دستخط کر کے ابدی نیند سلانا کسی بھی افسر کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ قوم کا یہ خود ساختہ خادم عمر عزیز کے ساٹھ سالہ سرکاری ٹیلی فون گاڑی اور گھر کے حصول میں باعزت ریٹائر ہو جاتا ہے۔ دوران ملازمت اسے کافی دورے پڑتے ہیں۔ مگر بعد از ملازمت صرف ایک ہی دورہ پڑتا ہے۔ جسے دل کا دورہ کہتے ہیں۔ یہ واحد دورہ ہوتا ہے جس کا کوئی ٹی اے، ڈی اے نہیں ہوتا۔ افسر لوگ عام انسانوں سے زیادہ فری نہیں ہوتے اس کو تجاہل افسرانہ کہتے ہیں۔

محمد ظفر اللہ ضیاء، کمالیہ

بے لوث نیکی

دور دراز سے آیا ہوا ایک تاجر مدینہ منورہ میں پریشان پھر رہا تھا۔ اس کا ایک کام اٹکا ہوا تھا۔ خلیفہ وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہو کر مدعا بیان کرے۔ وہ اجنبی تھا اور سفارش کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ کسی نے بتایا آل جعفرؓ کے پاس جاؤ، وہ سخی ابن سخی ہیں۔ غریبوں اور مسافروں کے ملجا و ماویٰ ہیں۔ چنانچہ وہ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ان کی سفارش کر دیں تا کہ اس کا کافی دنوں سے اٹکا ہوا کام ہو جائے۔
حضرت عبداللہؓ نے تمام روداد سنی اور اس بات کا یقین کر لینے کے بعد کہ اس سے کسی کی حق تلفی نہیں ہوئی۔ اس کی سفارش فر کر دی۔ اور اس کا کام ہو گیا۔

تاجر بہت خوش ہوا اور اس نے اپنی خوشی سے چالیس ہزار درہم آپؐ کی خدمت میں پیش کیے جس پر آپؐ نے یہ تاریخی فقرا کہا۔
''ہم آل ہاشم اپنی نیکی فروخت نہیں کرتے۔''

نازیہ عمر، پشاور

رشک

ایک محل کے بہت شاندار شمع دان نے ایک غریب مگر گھر کے بہت معمولی دیئے سے کہا۔
''مجھے تمھاری قسمت پر رشک آتا ہے۔''
دیا بولا۔
''کیوں میرا مذاق اڑاتے ہو۔ کہاں تم اور کہاں میں، مجھ میں اور تم میں اتنا فرق ہے جتنا آسمان کے ایک تارے اور زمین کے ذرے میں ہوتا ہے۔''
شمع دان بولا۔
''دوست تمھاری قدر و منزل مجھ سے بہت زیادہ ہے۔ میں روشنی پھیلاتا ہوں تو اس میں داد و عیش دی جاتی ہے اور تمھاری مدھم لو میں غریب کہنے کا بچہ اپنی نیند قربان کر کے دیر تک پڑھتا ہے۔''

مہناز فاطمہ خوشاب

خوشبو

نیویارک کی ایک تحقیقی جماعت کا کہنا ہے کہ اگر آپ اپنے ارادے کی کارکردگی میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو اپنے دفاتر بھینی بھینی خوشبو سے بھر دیجیے۔
اس جماعت نے تحقیق کے لیے ایک سو بیس افراد کا انتخاب کیا۔ انھیں دفتر میں لکھنے پڑھنے کے عام کام کاج انجام دینے تھے۔ آدھے لوگ ایسی جگہ پر رکھے گئے جہاں پر پھولوں کی ہلکی ہلکی خوشبو تھی۔ باقی لوگ عام جگہ پر بٹھائے گئے وہاں پر خوشبو نہیں تھی۔
خوشبو والے افراد کی کارکردگی دوسروں کے مقابلے میں پچیس فیصد رہی۔

شازیہ ثمن، جھنگ

ضرورت

- جو نام دل کی ڈائری پر نقش ہوا اسے کاغذوں کی ڈائری پر رقم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔
- جو یادیں جسم کا حصہ ہوں انھیں سجانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔
- جن حقیقتوں کو نگاہیں آشکار کرتی ہوں انھیں اظہار لفظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔
- جو تمنائیں بن مانگے مل جاتی ہوں انھیں دعاؤں میں مانگنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔
- اگر قسمت کی دیوی مہربان ہو تو پھر نجومیوں کو ہاتھ دکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔
- اگر خدا پر بھروسا ہو تو پھر کسی سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔
- اگر ماں کی دعائیں ساتھ ہوں تو پھر کسی اور دعا کی ضرورت نہیں ہوتی

لائبہ رضوان، فیصل آباد

قسمت

☆ قسمت وہ مارکیٹ ہے جہاں جدوجہد چیزوں کی قیمت کو بڑھاتی ہے اور کاہلی انھیں گھٹاتی ہے۔ (بیکر)
☆ قسمت انسان اور جدوجہد کے درمیان ایک متحرک لنگر ہے۔ (ہارون)
☆ قسمت ملکیت کے طور نہیں آزمائش کے طور پر تمھارے پاس آتی ہے۔ (رابن مور)
☆ قسمت ہم سے وہی کچھ چھینتی ہے جو ہم کو دیتی ہے۔ (انجیلا)

عطیہ شیخ، کہروڑ پکا

☆☆☆

ریاض

تسنیم گھاگھی

بشریٰ علوی ---- راولپنڈی

موج خوشبو کی طرح بات اڑانے والے
تجھ میں پہلے تو نہ تھے رنگ زمانے والے
کتنے ہیرے میری آنکھوں سے چرائے تو نے
چند پتھر میری جھولی میں گرانے والے

سعدیہ عمر ---- سرگودھا

دل میں اب اور کیا ہے جیسے ڈھونڈتی ہے
کافی ہے زندگی کو شکست انا کا دکھ
کیوں ان دنوں سوار ہے دو کشتیوں پہ دل
چاہت اک اجنبی کی تو اک آشنا کا دکھ

.....

یہ سوچ کر میں نے چنی ہے آخری آرام گاہ
میں تھا مٹی اور مجھے مٹی کا گھر اچھا لگا
منزلوں کی بات چھوڑو کسی نے پائی منزلیں
اک سفر اچھا لگا اک ہمسفر اچھا لگا

.....

دکھ کیسے اٹھاتا میرے نازک ہے جو اتنا
رو پڑتا ہے بے ساختہ ہر چھوٹے سے غم پر
کیا عمر بسر کرتی تھی اس نے میرے ہمراہ
سر کاندھے پر رکھ دیتا تھا ہر چار قدم پر

فریدہ خانم ---- لاہور

اب میں یہ کہہ سکتا ہوں
ہجر کے صدمے سہہ سکتا ہوں
تو بچھڑا تو میں نے جانا
میں تنہا خوش رہ سکتا ہوں

.....

احباب کو رہی میرے عیبوں کی جستجو
میں پرخلوص ان کے ہنر تولتا رہا

ارم ناز ---- شیخوپورہ

اگر مل گیا ہے کوئی ہم سے بہتر
بصد شوق ہم سے نگاہیں چرا لے
وہ ہرگز نہ ہوں گے انیس دل و جاں
تو غیروں سے چاہے مراسم بڑھا لے

.....

نہ پھولوں کی مالا، نہ کلیوں کی بارش
خس و خار ہی ہیں محبت کا حاصل

.....

نہ صورت ہی کچھ ہے نہ نقش نگاراں
وہی خوبرو ہے کہ جو دل کو بھائے

محمد ظفر اللہ ضیاء ---- کمالیہ

آج اک انسان سے مل کر مجھے محسوس ہوا
جیسے محصورو ہوں میں سینکڑوں انسانوں میں
فقط اتنا سا تغیر ہے کہ اس دور کے لوگ
جھانکتے پھرتے ہیں غیروں کے گریبانوں میں

.....

پلٹ کر آنکھ نم کرنا مجھے ہرگز نہیں آتا
گئے لمحوں کا غم کرنا مجھ ہرگز نہیں آتا
محبت ہو تو بے حد ہو جو نفرت ہو تو بے پایاں
کوئی بھی کام کم کرنا مجھے ہرگز نہیں آتا

فرحین ملک ---- دہوریہ

کچھ روز اور کر لو گوارا کہ دوستو!
ہم جیسے لوگ پھر کہاں دنیا میں آئیں گے

.....

پوچھنا چاہتا ہوں میں ان آنکھوں سے جمال
کس کو آباد کیا ہے مجھے بے گھر کر کے

.....

کون سا قہر یہ آنکھوں پہ ہوا ہے نازل
ایک مدت سے کوئی خواب نہ دیکھا ہم نے

امان اللہ انجم ---- چناب نگر

اجڑی ہوئی راحت کو آباد نہیں کرتے
بچھڑی ہوئی چاہت کو ہم یاد نہیں کرتے
اقبالِ زمانے میں وہ لوگ مزے میں ہیں
جو دل کے جزیرے کو آباد نہیں کرتے

.....

ناں نہیں کرتا وہ ہاں تک بھی نہیں
اس کے منہ میں کیا زباں تک بھی نہیں
تنہا تنہا میں ہوں اور تنہائی ہے
یعنی کوئی رازداں تک بھی نہیں

سباس گل ---- رحیم یار خان

رستے میں مل گیا تو شریک سفر نہ جان
جو چھاؤں مہرباں ہو اسے اپنا گھر نہ جان
ممکن ہے باغ کو بھی نکلتی ہو کوئی راہ
اس شہر بے شجر کو بہت بے ثمر نہ جان

فوزیہ غزل ---- رسالہ شیخوپورہ

زندگی میں جب کبھی سامنا اس سے ہوا
درد کے اک اور رنگ سے واسطہ مجھ کو ہوا
شاخِ دل سے اڑا دیئے سارے طائر
ویرانی چمن سے دکھ بھی سارا مجھ کو ہوا

.....

جیت کے سارے پتے اٹھا کے اس نے رکھ لیے
محبت میں پھر ہر خسارہ مجھ کو ہوا

.....

پڑاؤ ڈالنے کے موسم میں پاؤں بھی تھک گئے
اور گھر بھی میرے راستے میں اسی بیوفا کا تھا
بچھڑ کے اس سے سرشار رہنا ہے
فیصلہ یہ بھی اک انا کا تھا

فریحہ امید چوہدری ---- گوجرانوالہ

یہ قربتیں بھی بڑے امتحان لیتی ہیں
کسی سے واسطہ رکھنا تو دور کا رکھنا

.....

سورج کے ساتھ ڈوبا میرا دل بھی آج
اتنا اداس شام کا منظر کبھی نہ تھا

.....

اپنا پن بھی اس بے گانے پن میں ہے
پورا عالم ایک دیوانے پن میں ہے
یہ جو تم سے انجان بنا پھرتا ہوں
ساری بات اس انجانے پن میں ہے

فرخندہ تبسم ---- مظفر گڑھ

دامنِ شب میں جو تارے ہیں تمھارے ہیں سبھی
کوئی جگنو، کوئی تارہ ہی عنایت کر دو

.....

ٹوٹ جائے نہ کہیں ضبط کا بندھن مجھ سے
میں تو آیا ہوں تیری آنکھ کا دریا لینے

.....

ازل سے ابد تک حفیظ مسرت
جفاؤں کی بستی میں یادوں کے موسم
کٹے گا کڑی دھوپ کا یہ سفر بھی
گھڑی دو گھڑی ہیں عذابوں کے موسم

حنا ناز ---- پنڈ دادنخان

مری آہیں گلاب جلا گئیں سارے
یہ موسم بہار اڑا گئیں سارے
شہر کے شہر ہو ویران ہو گئے
آتش فشاں بھی بجھا گئیں سارے

.....

شبنم آنکھوں سے دیکھا موسم بھی اداس لگے مجھے
بہار خود کہتی ہے ہر سبز پیڑ خزاں لگے مجھے

علینہ طارق ---- لاہور

وفا تلاش نہ کر اپنے ہم نشینوں میں یہاں تو سانپ
بھی پلتے ہیں آستینوں میں

.....

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

.....

جب ہم سے ملو گے تو ہمیں پاؤ گے مخلص

ہر چند کہ اخلاص کا دعویٰ نہیں کرتے
معکنون شاہ ---- لاہور

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

.....

دو چار لفظ کہہ کے میں خاموش ہوگیا
وہ مسکرا کے بولے بہت بولتے ہو تم

.....

سن رہا ہوں فاصلے ہیں جو تیرے میرے درمیاں
میں نے تجھ کو کبھی خود سے جدا دیکھا نہیں
خاور اس کی راہ میں اک بار کیا رکھے قدم
عمر بھر پھر ہم نے گھر کا راستہ دیکھا نہیں
لائبہ رضوان ---- فیصل آباد

روشنی میرے اندھیروں سے الجھ سکتی ہے
مگر دکھ کے سورج نے جلایا ہے مجھے

.....

چند پایں چند آنسو چند شکوے اور عمر
عشق تو کیا تھا مگر اب یہ سلیقے بھی کہاں
دل لہو ہوتا ہے یارو بات یہ آساں نہیں
لحظہ لحظہ روتے گزری اور روئے بھی کہاں

.....

آج کے دریا نہیں رکھتے کسیکا کچھ بھرم
اب یہاں کچے گھڑوں پہ تیرنا اچھا نہیں
مہناز فاطمہ ---- خوشاب

صیاد نے اجازت فریاد دی تو ہے
میں پھر بھی ڈرا ہوا ہوں زبان کھولتے ہوئے

.....

تو لوٹ کے بھی اہل تمنا کو خوش نہیں
میں لٹ کر بھی وفا کے انہی قافلوں میں ہوں
مجھ سے بچھڑ کے تو بھی روئے گا عمر بھر
یہ سوچ لے کہ میں بھی تیری خواہشوں میں ہوں

.....

کیوں چپکے سے وہ لوگ اتر جاتے ہیں دل میں
جن لوگوں سے قسمت کے ستارے نہیں ملتے
شازیہ ثمن ---- جھنگ

عطا ہوتے نہیں ہر آنکھ کو انجم فروش آنسو
فقط چشم محبت ہی یہ موتی رول سکتی ہے

.....

خود کو یوں محصور کر بیٹھا ہوں اپنی ذات میں
منزلیں چاروں طرف ہیں راستہ کوئی نہیں

.....

روک سکو تو پہلی بارش کی بوندوں کو تم روکو
کچی مٹی تو مہکے گی ہے مٹی کی مجبوری
نعیمہ رانا ---- ملتان

ہم کو معلوم تھا انجام محبت ہم نے
آخری حرف سے پہلے قلم توڑ دیا

.....

یادوں کی آگ میں میری آنکھیں سلگ اٹھیں
راتوں کو سوچنے کی تو عادت نہ تھی مجھے
شاید وہ میرے عشق کی اک انتہا ہی تھی
کہ تیرے ہم سفر سے رقابت نہ تھی مجھے

.....

جانے والے کو نہ روکو کہ بھرم رہ جائے
تم نے روکا بھی تو کب اس کو ٹھہر جانا ہے
عطیہ شیخ ---- کہروڑپکا

ابھی تک اس نے کوئی بھی تو فیصلہ نہ کیا
وہ چپ ہے مجھ کو ہر طرح آزما کے بھی

.....

حسن بڑھا دے ذات کا وہ غم اچھا لگتا ہے
اس کی آنکھ میں ہلکا سا نم اچھا لگتا ہے
بڑی بڑی رنجش کی باتیں اس کو یاد نہیں
اور ذرا سی بات پر برہم اچھا لگتا ہے

.....

کس قدر مشکل ہے مگر حکم حاکم ہے
آنکھیں رکھتے ہوئے اندھا ہونا
رضوان علی ---- ساہیوال

یادوں کی آگ میں میری آنکھیں سلگ اٹھیں
راتوں کو سوچنے کی تو عادت نہ تھی مجھے
شاید وہ میرے عشق کی اک انتہا ہی تھی
کہ تیرے ہم سفر سے رقابت نہ تھی مجھے

.....

میری ہی عمر تھی جو میں نے رائیگاں سمجھی
کسی کے پاس نہ تھا ایک سانس بھی وافر

.....

سب کچھ لٹا دیا اس انجام سفر میں
حتیٰ کہ کہیں یاد کا گوشہ بھی نہ رکھا
دل یاد بھی کرتا تو کہاں ڈھونڈنے جاتے
آنکھوں نے تو محفوظ وہ منظر بھی نہ رکھا
ثوبیہ احمد ---- قصور

کسی سے ربط بہم استوار بھی نہ کیا
فرار بھی نہ ہوئے کھل کے پیار بھی نہ کیا
بہت اکیلا تو وہ بدنصیب ہے جس نے
تمام عمر کوئی انتظار بھی نہ کیا

.....

ابھی تو میرے بکھرنے کا کھیل باقی ہے
میں خوش نہیں ہوں ابھی اپنا گھر لٹا کے بھی

.....

دشت نامرادی میں ساتھ کون تھا کس کے
مرثیے سنائی ہے شہر کی ہوا کس کے
ہم تو کل نہیں ہوں گے دیکھنا کہ محفل میں
اب سخن سناتا ہے یار بے وفا کس کے
زاہد اقبال ---- کراچی

پھر سارے کھیل کھلونوں نے منہ پھیر لیا
پھر دل نے دکھ کو گھیر لیا پھر شام ہوئی

.....

شکوہ نہ کر دل ویراں کی ناسپاسی کا
ترا کرم ہی سبب بن گیا اداسی کا

.....

عشق نے زندہ و تابندہ رکھا ہے ورنہ
بہت سی دل میں ترازو ہے کوئی مدت سے
عفرا ثاقب ---- جہلم

گومگو کی کیفیت جب زندگی کا نام ہو
سوچئے تو فیصلہ پھر آخری کیسے کریں

ہار کر آئی ہے کتنے یہ ساگر زندگی
گزر گیا سال پھر پرانی ڈگر پہ آئی زندگی

اور کیا ہوگی سند پیار کی اس سے بڑھ کر
پھول چاہت کے تیری راہوں میں بکھرائے ہیں
بندشیں رسمیں زمانے کی بھلا کر ساری
دیکھ خود ہی تیری اور چلے آئے ہیں
الماس ارشد ---- سکھر

فقط اس کا تصور ہے اب متاع حیات
مجھے یہ ڈر ہے کہ یاد اس کی کھو نہ جائے کہیں

کس طرح بجھتی ہیں شمعیں ٹوٹتے ہیں کیسے خواب
دوستوں کی بے رخی کھا کر دیکھنا
کیسی کیسی حسرتوں سے یہ نگر آباد ہے
اک ذرا فرصت ملے تو دل میں آ کر دیکھنا

یقین کی راہ گزر سے گزر نہ جاؤں کہیں
کسی فریب کی حد میں بکھر نہ جاؤں کہیں
وہ چالباز ہے میں باشعور ہوں پھر بھی
یقیں اس کی محبت کا کر نہ جاؤں کہیں
نعمان خان ---- نورپور

وہ قتل ہوگیا بدصورتوں کی محفل میں
جو سارے شہر کے آئینے صاف کرتا تھا
قتیل اب تو ہزاروں کا بھی ہے وہ قائل
جو خدا سے بھی انحراف کرتا تھا

پرائے پن کی وسیع و عریض دنیا میں
یہ اک خوشی ہی بہت ہے کہ درد اپنا ہے

☆☆☆

بلقیس بھٹی

رنگ چنا

چیکنگ

خیر دین نے اپنے پڑوسی اللہ دتہ سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔

''سنا ہے ارشاد کی انگلیاں کٹ گئی ہیں یہ حادثہ کیسے ہوا؟''

''اس نے یہ دیکھنے کے لیے گھوڑے کے منہ میں ہاتھ ڈالا تھا کہ اس کے کتنے دانت ہیں؟'' اللہ دتہ نے کہا۔

''پھر کیا ہوا؟'' خیر دین نے دریافت کیا۔

''پھر گھوڑے نے یہ دیکھنے کے لیے منہ بند کرلیا کہ ارشاد کے ہاتھ میں کتنی انگلیاں ہیں۔'' اللہ دتہ نے جواب دیا۔

فریحہ امید چوہدری، گوجرانوالہ

پاگل

ڈاکٹر نے پاگل خانے میں نئے آنے والے مریض کا معائنہ کیا تو وہ مریض ڈاکٹر کو دماغی صحت مند دکھائی دیا۔

ڈاکٹر: ''کیوں میاں یہاں کیسے پہنچے؟''

مریض: (ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے)

''دراصل کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک بیوہ سے شادی کر لی تھی۔ اس عورت کی ایک جوان بیٹی تھی۔ اتفاق سے وہ لڑکی میرے باپ کو پسند آ گئی۔ میرے پاس نے اس سے نکاح کرلیا۔ یوں میری بیوی میرے باپ کی ساس بن گئی۔ کچھ عرصہ بعد میرے باپ کے گھر بچی پیدا ہوئی۔ یہ رشتے میں میری بہن ہوئی کیونکہ میں اس کے باپ کا بیٹا تھا۔ دوسری طرف وہ میری نواسی بھی لگتی تھی کیونکہ میں اس کی نانی کا خاوند تھا۔ گویا میں اپنی بہن کا نانا بن گیا۔ پھر کچھ مدت بعد میرے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ ایک طرف وہ لڑکی میرے بیٹے کی سوتیلی بہن لگتی تھی کیونکہ وہ بچہ اس کی ماں کا بیٹا تھا اور دوسری طرف وہ اس کی دادی بھی لگتی تھی۔ کیونکہ وہ میری سوتیلی ماں تھی۔ چنانچہ میرا بیٹا اپنی دادی کا بھائی بن گیا اور میں اپنے بیٹے کا بھانجا۔''

ڈاکٹر صاحب نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا اور چیخ کر بولے۔

''چپ ہو جاؤ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔''

فرحین ملک، دہوریہ

طلب

جج: ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم نے یہ حرکت کیوں کی؟ تم ایک اچھے عہدے پر فائز تھے۔ بھاری تنخواہ لے رہے تھے۔ مستقبل میں مزید ترقی کے امکانات تھے۔ اس کے باوجود تم نے غبن کیوں کیا؟''

ملزم: ''جج صاحب! بات یہ ہے کہ انسان کو جتنا زیادہ ملتا ہے اس کی ہوس اور طلب اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔''

جج: ''ٹھیک ہے میں تمھیں پانچ سال کی قید بامشقت دے رہا ہوں زیادہ کی طلب ہو تو بتا دینا۔''

فوزیہ غزل، رسالہ شیخوپورہ

پھوپھی

کالج میں بڑی عمر کی لڑکی نے داخلہ لیا۔ سب نے اسے پھوپھی کہنا شروع کیا۔ کچھ دن تو بیچاری نے برداشت کیا۔ آخر تنگ آ کر پرنسپل سے شکایت کر دی۔

''سر! ساری کلاس مجھے پھوپھی ..... پھوپھی کہی ہے۔''

پرنسپل صاحب کو بڑا غصہ آیا۔ کلاس روم میں پہنچے اور بولے۔

''جو طالب علم اسے پھوپھی کہتا ہے کھڑا ہو جائے۔''

آہستہ آہستہ ساری کلاس کھڑی ہوگئی۔ صرف ایک لڑکا بیٹھا رہا۔ پرنسپل صاحب بڑے حیران ہوئے کہ ساری کلاس اسے پھوپھی کہتی ہے یہ کیوں نہیں کہتا۔

انھوں نے ساری کلاس کو بیٹھنے کے لیے کہا اور اس لڑکے کو کھڑا کرلیا۔

''کیوں برخوردار تم اسے پھوپھی کیوں نہیں کہتے؟''

''سر! میں ساری کلاس کا ''پھوپھا'' ہوں۔''

محمد ظفر اللہ ضیا، کمالیہ

غزل

ہوا چلنے کی ہم کو یہ سزا ہے
ہو بجلی بند جہاں بھی واپڈا ہے
کوئی سو جائے نہ دو پل سکوں سے
انھیں یہ کب بھی اچھا لگا ہے
کہیں مچھر، کہیں مکھیوں کا ڈیرا
کہیں واپڈا کہیں یہ بلدیہ ہے
بڑھی جاتی ہے مہنگائی کچھ ایسے
کے کھانا پینا مشکل ہوگیا ہے
ادھر بٹوے سے نکلی ریزگاری
ادھر قصاب منہ کھولے کھڑا ہے
کرو اب دال دلیے پر گزارہ
کے یہ بھی گوشت کی صف میں کھڑا ہے
دکانداروں کی چاندی ہوگئی ہے
پرس اپنا ہی گل سونا پڑا ہے

سباس گل، رحیم یار خان

لڑکیاں

لڑکیاں تو کانچ کی
چوڑیاں ہوتی ہیں
سلامت رہیں تو شان
بڑھ جاتی ہے
اور اگر ٹوٹ جائیں
تو ان کی کرچیاں سمیٹ کر
کوئی اپنے آپ کو لہولہان نہیں کرتا

میاں منیر احمد انجم، فیصل آباد

کیک

بولا دکاندار کہ کیا چاہیے تمھیں
جو بھی کہو گے میری دکان پر پاؤ گے
میں نے کہا کہ کتے کے کھانے کا کیک ہے
بولا یہیں پہ کھاؤ گے یا لے کے جاؤ گے

سلیقہ

اک نوجواں اتنا کفایت شعار تھا
دیکھو وہ کس سلیقے سے پیسہ بچا گیا
شادی کے بعد اپنی ہنی مون کے لیے
شملہ کی وادیوں کو اکیلا چلا گیا

امان اللہ انجم، چناب نگر

اخروف

کم عمر لڑکوں کی ایک عدالت میں چار ایسے بچوں کو پیش کیا گیا جو قانون توڑنے کے مرتکب ہوئے تھے۔ مجسٹریٹ نے ایک لڑکے سے پوچھا۔

''تم پر کیا الزام ہے؟''

لڑکے نے بتایا۔

''میں نے مسٹر جون کے باغ سے ٹماٹر توڑے تھے، پبلک پارک میں آگ جلائی تھی اور اخروٹ کو تالاب میں پھینک دیا تھا۔''

''اور تم نے کیا کیا ہے؟'' مجسٹریٹ نے دوسرے لڑکے سے پوچھا۔

''میں نے بھی مسٹر جون کے باغ سے ٹماٹر توڑے تھے پبلک پارک میں آگ جلائی تھی اور اخروٹ کو تالاب میں پھینک دیا تھا۔''

''اور تم نے؟'' تیسرے سے پوچھا گیا۔

''میں نے بھی مسٹر جون کے باغ سے ٹماٹر توڑے تھے۔ پبلک پارک میں آگ جلائی اور اخروٹ کو تالاب میں پھینک دیا تھا۔''

چوتھے لڑکے سے پوچھا گیا تو وہ بولا۔

''میں نے بھی مسٹر جون کے باغ سے ٹماٹر توڑے تھے اور پبلک پارک میں آگ جلائی تھی۔''

''اپنے ساتھیوں کی طرح تم نے اخروٹ کو تالاب میں کیوں نہیں پھینکا؟''

لڑکے نے بتایا۔

''کیونکہ اخروٹ تو میں خود ہوں۔''

معکنون شاہ' لاہور

قابل دید

پڑوس میں نیا کرایہ دار جوڑا آ کر آباد ہوا۔ ایک روز بیگم آنسو نے کہا۔

''دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔ شوہر باہر جانے لگتا ہے تو دروازے پر کھڑے ہو کر بیوی کا ہاتھ دباتا ہے۔ پھر سڑک پر جا کر کئی بار پیچھے گھوم گھوم کر دیکھتا ہے۔'' بیگم آنسو نے سرد آہ بھری۔

''مجھے تو رشک آتا ہے دونوں پر۔'' بیگم آنسو نے دوبارہ کہا۔

''تم ایسا کیوں نہیں کرتے؟''

شوہر نے حیرت سے کہا۔

''میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں' میں تو اس عورت کو جانتا تک نہیں۔''

نازیہ عمر' پشاور

نااہل

دوسری جنگ عظیم کے دوران ایک نوجوان کو زبردستی فوج کی بھرتی کے دفتر لے جایا گیا۔ نوجوان کے معائنہ صحت کے ضروری مراحل سے بخیر و خوبی گزرنے کے بعد فوجی ڈاکٹر نے دیوار پر آویزاں چارٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھو سامنے چارٹ میں کیا لکھا ہے' پڑھ کر سناؤ۔'' نوجوان نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چارٹ کو دیکھا اور کہا۔

''کون سا چارٹ؟''

ڈاکٹر سمجھا نوجوان گھبرا گیا ہے بولا۔

''اچھا اس کرسی پر بیٹھو۔''

نوجوان نے اندھوں کی طرح ادھر ادھر دیکھا اور بولا۔

''جناب کون سی کرسی؟''

ڈاکٹر نے نوجوان کی کمزور بینائی پر اسے نااہل قرار دے دیا۔

نوجوان خوشی کے عالم میں رات فلم دیکھنے چلا گیا۔ اچانک اس کی نظر ساتھ والی کرسی پر پڑی جس پر وہی فوجی ڈاکٹر بیٹھا تھا۔ نوجوان کو اور تو کچھ نہ سوجھا' حواس پر قابو پاتے ہوئے ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔

''کیوں سر یہ بس سیدھی برما جاتی ہے؟''

علینہ طارق' لاہور

خطوط

ایک جانے پہچانے معزز تاجر نے پوسٹ آفس فون کر کے کہا۔

''کچھ عرصے سے مجھے نہایت دھمکی آمیز خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ کیا آپ یہ سلسلہ بند کروانے میں میری مدد کر سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں۔'' پوسٹ ماسٹر نے خلوص سے جواب دیا۔

''آپ کو اندازہ ہے کہ یہ خطوط کہاں سے آ رہے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' تاجر نے جواب دیا۔

''انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ سے۔''

لائبہ رضوان' فیصل آباد

آرام

موسلا دھار بارش میں ایک صاحب نے ایک خوبصورت لڑکی کو اپنی کار کا ٹائر بدلنے کی کوشش کرتے دیکھا۔ انھوں نے اپنی کار روکی اور لڑکی کی کار کا ٹائر بدلنے میں مصروف ہو گئے۔ خاصی دیر کی محنت کے بعد جب کام پورا ہوا تو انھوں نے جھک کر کہا۔

''لیجیے محترمہ آپ کا کام ہو گیا۔''

لڑکی بولی۔

''شش..... زور سے نہ بولیے نہیں تو میرے شوہر جاگ جائیں گے' وہ پچھلی سیٹ پر آرام کر رہے ہیں۔''

شایہ ثمن' جھنگ

چھری کانٹے کے ساتھ

ایک پادری کو آدم خور قبائلی پکڑ کر لے گئے اور اپنے سردار کے سامنے پیش کیا۔ پادری یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سردار اچھی انگریزی بول رہا تھا اور آکسفورڈ کا پڑھا ہوا تھا۔

اس نے سردار سے پوچھا۔

''آپ تو آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے ہیں۔ مجھے کھائیں گے کیسے؟''

سردار نے اطمینان سے جواب دیا۔

''چھری کانٹے کے ساتھ۔''

نعیمہ رانا' ملتان

لغو گفتگو

جج نے ملزم سے پوچھا۔

''ٹریفک کانسٹیبل کہہ رہا تھا کہ تم نے اس سے لغو گفتگو کی ہے؟''

''ہرگز نہیں جناب عالی۔'' ملزم بولا۔

''دراصل وہ مجھے اس طرح ہدایات دے رہا تھا جیسے میری بیوی دیتی ہے تو حسب عادت بے خیالی میں میرے منہ سے نکل گیا کہ ٹھیک ہے میری جان۔''

عطیہ شیخ' کہروڑ پکا

بیوی

ایک کلرک نے جھجکتے ہوئے اپنے مالک سے کہا۔

''سر میری بیوی نے کہا ہے کہ آپ سے تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کروں۔''

مالک نے جواب دیا۔

''خوب میں اپنی بیوی سے پوچھوں گا کہ میں تمھاری تنخواہ بڑھا سکتا ہوں یا نہیں۔''

رضوان علی' ساہیوال

گناہ

بیوی شادی کی سالگرہ کے موقع پر شوہر کو ساتھ لے کر ساری خریدنے گئی۔ جو بیاری اس نے پسند کی اس کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ شوہر نے بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو چونکہ قیمت بہت زیادہ ہے اس لیے یہ فضول خرچی ہی نہیں بلکہ گناہ بھی ہے۔''

بیوی نے یہ سن کر اطمینان سے جواب دیا۔

''فضول خرچی آپ کریں' گناہ کی فکر نہ کریں' وہ میرے ذمہ رہا۔''

ثوبیہ احمد' قصور

بڑھا چڑھا کر

''امی! دیکھیے ہمارے گھر کے باہر ایک بہت بڑا ابلا کھڑا ہے بالکل ہاتھی کے برابر۔'' ایک بچے نے اپنی ماں سے کہا۔ ماں بولی۔

''بات کو بڑھا چڑھا کر بیان نہ کرو' تمھاری اس بری عادت پر میں تمھیں پچاس کروڑ مرتبہ ٹوک چکی ہوں۔''

☆☆☆

میری ڈائری سے

فرحین ملک: کی ڈائری سے مرتضیٰ برلاس کی

غزل

جب لوگ جذبوں کی توقیر نہیں کرتے
ہم بھی کوئی دکھ اپنا تحریر نہیں کرتے
موسم اگر اکسائے جب چاہے چلے آنا
ہم رات کو دروازہ زنجیر نہیں کرتے
لکھتے ہیں وہ کچھ جو ہر اک پہ گزری ہے
پریوں کی کہانی ہم تحریر نہیں کرتے
دو گز ہی زمیں سب کا جب آخری مسکن ہے
ہم کوئی مکان اپنا تعمیر نہیں کرتے

شمع جبیں: کی ڈائری سے ایک نظم

صرف تم

نیلا اور آسمان
تاریکی کو چیرتا ہوا اجالا
اور سورج کی پہلی کرن
جب زندگی کا احساس بن کر
میرے ساتھ چلتی ہے
بس وہیں تم ہو.....صرف تم ہو
جب نیند
نینوں کے پردوں میں اترے
ٹھنڈی گیلی چاندنی
پردوں کی اوٹ سے جھانکے
اور خواب اب پلکوں پہ آ ٹھہرے
بس وہیں تم ہو.....صرف تم ہو

بشریٰ رشید علوی: کی ڈائری سے ایک نظم

بے بسی

کسی کھلی فضا میں چل کے
ساری شکایتیں اپنی رکھ دیں
ان ہواؤں کے سامنے
جو ہر نگر کی باسی ہیں
سارے درد کہہ دیں
ان ستاروں سے جو آسمان کے راہی ہیں
کیوں نہ کہہ دیں
اپنی ساری آزادیاں
ان دیواروں سے
جو چپ چاپ کھڑی ہیں
دل تنہا کی طرح
آؤ!!
گل رنگ و بو کو سنا دیں
وہ عذاب سارے
جو وہ روح میں اترے ہیں
کہیں دور آسمانوں کی وسعتوں میں
انڈیل دیں وہ ویرانیاں
جو چہروں کو سوگوار کر گئیں ہیں
کیا فائدہ ہے؟
اتنی حکایتوں کا' شکایتوں کا
آؤ!
اپنی آہوں کو
اپنے آنسوؤں کو
دل کے اندر ہی
لپٹ لیں
اور
چپ چاپ مر جائیں

میاں منیر: کی ڈائری سے ایک نظم

تم بن ہم جئیں کیسے

دنیا کی اس بھیڑ میں
دل کو بہلاؤں اب کیسے
تیری یاد کی شدت کو
روک پاؤں اب کیسے
تم ہی بتاؤ اب مجھے
زہر جدائی ہم پیش کیسے
تم کو تو پانا مشکل ہے
اور تم بن ہم جئیں کیسے
صبح شام تجھ کو ہی کیوں میں سوچتا رہتا ہوں
ہاتھوں کی لکیروں میں کیا میں کھوجتا رہتا ہوں
ہجر کی اس آگ میں خود کو بچائیں ہم کیسے
تم کو تو پانا مشکل ہے اور تم بن ہم جئیں کیسے
اک وہم سا ذہن میں رہتا ہے
کیوں ڈر سا لگتا ہے
کہیں تم سے بچھڑ نہ جاؤں میں
کہیں تم بن نہ مر جاؤں میں

سباس گل: کی ڈائری سے راؤ تہذیب حسین

تہذیب کی ایک غزل

حالت سنبھل نہ پائی بیمار زندگی کی
ڈھے جائے گی کسی دم دیوار زندگی کی
اس بار بچ سکوں گا ہرگز نہ میں یقیں تھا
مانگی دعا سبھی نے اس بار زندگی کی
جب روز و شب ہمارے سب رائیگاں گئے ہیں
پھر کیا کریں تمنا بیکار زندگی کی
اب پوچھتا نہیں ہے احوال کوئی رک کر
کچھ اس طرح بڑھی ہے رفتار زندگی کی
مفلس یہ پوچھتا ہے اے اہل علم و دانش
کب تک رہے گی سر پہ تکرار زندگی کی
اغیار کی کہیں کیا وہ سب تو غیر تھے پر
اپنوں نے کم کسی سے بیزار زندگی کی
تہذیب کیا خبر ہے کب ساتھ چھوڑ جائے
کھایا نہ کر قسم تو اے یار زندگی کی

فوزیہ غزل: کی ڈائری سے ایک غزل

وہ مجھ سے بچھڑا تو لوٹ کے نہ آیا پھر
جسم سے جدا ہو گیا سایا پھر
وہ تو خوشبو سا دل تھا جو
اس کی چاہ میں گنوایا پھر
بارش میں دھوپ نکل آئی
وہ شاید آج مسکرایا پھر
چاند کو دیکھا تو اپنی آرزو کا
سفر ہمیں یاد آیا پھر
تیرا رستہ تکتے تکتے سحر ہوئی
میری آنکھ نے خواب گنوایا پھر
اس رستے سے گزرے تجھ بن
یاد نے تیری آج غزل کو تڑپایا پھر

فریحہ امید چوہدری: کی ڈائری سے ایک نظم

او بے پروا سجن

او بے پروا سجن
میرے دکھ کے دن ہیں ہزار
میرے سینے میں ہیں سانسیں چار
میرے سپنے ہوئے ہیں تار تار
تجھے اس سے کیا ہو لگن
او بے پروا سجن
میری سوچوں پہ ہے کئی پہرے دار
مجھے دیتے ہیں سکھ ادھار
میری نیا ہو کیسے پار
تو بیٹھا ہے میلوں پار
تجھے اس سے کیا ہو لگن
او بے پروا سجن

فریدہ خانم: کی ڈائری سے ایک خوبصورت نظم

کامیاب لوگ

کامیاب لوگوں کو

دنیا خوش نصیب کہتی ہے
ہر چیز میں آگے ہوتے ہیں
عزت، دولت، شہرت
کہیں کوئی کمی نہیں ہوتی
ہر جگہ آگے ہی آگے ہوتے ہیں
لوگ جھک جھک سلام کرتے ہیں
لیکن ان لوگوں کے دلوں میں
آج تک کوئی جھانکا ہے
اور دیکھا ہے کہ
کیسے یہ دل میں روتے ہیں
کسی نہ کسی ناکامی سے
ٹوٹے ہوتے ہیں
محبت کے معاملے میں فقیر ہوتے ہیں
یہ کامیابیاں ان کے لیے کچھ نہیں
ہاں اک ناکامی سب کچھ ہے
ان کامیاب لوگوں کو
دنیا خوش نصیب کہتی ہے

علینہ طارق: کی ڈائری سے شبنم شکیل کی غزل

گئے برس کی یہی بات یادگار رہی
فضا غموں کے لیے خوب سازگار رہی
اگرچہ فیصلہ ہر بار اپنے حق میں ہوا
سزائے جرم بہرحال برقرار رہی
بدلتی دیکھیں وفاداریاں بھی وقت کے ساتھ
وفا جہاں کے لیے ایک کاروبار رہی
اب اپنی ذات سے بھی اعتماد ان کا اٹھا
وہ جن کی بات کبھی حرف اعتبار رہی
خبر تھی گو اسے اب معجزے نہیں ہوتے
حیات پھر بھی مگر محو انتظار رہی
نہ کوئی حریف ملا نہ کوئی کلمہ خیر
یہ زیست اب نہ کسی کے بھی زیر بار رہی
یہ اور بات کہ دل غم میں خود کفیل ہوا
مگر وہ آنکھ میرے غم میں اشکبار رہی

معکنون شاہ: کی ڈائری سے فیض احمد فیض کی نظم

گر مجھے اس کا یقیں ہو میرے ہمدم میرے دوست
گر مجھے اس کا یقین ہو کہ تیرے دل کی تھکن
تیری آنکھوں کی اداسی، تیرے سینے کی جلن
میری دلجوئی، میرے پیار سے مٹ جائے گی
گر میرا حرف تسلی وہ دوا ہو جس سے
جی اٹھے پھر تیرا اجڑا ہوا بے نور دماغ
تیری پیشانی سے ڈھل جائیں یہ تذلیل کے داغ
تیری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے!
گر مجھے اس کا یقیں ہو میرے ہمدم، میرے دوست
روز و شب، شام و سحر میں تجھے بہلاتا رہوں
میں تجھے گیت سناتا رہوں ہلکے شیریں
آبشاروں کے، بہاروں کے، چمن زاروں کے گیت
آمد صبح کے، مہتاب کے، سیاروں کے گیت
یہ میرے گیت تیرے دکھ کا مداوا ہی نہیں
نغمہ جراح نہیں، مونس و غمخوار سہی
گیت نشتر تو نہیں، مرہم آزار سہی
تیرے آزار کا چارہ نہیں نشتر کے سوا
اور یہ سفاک مسیحا میرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا

نازیہ عمر: کی ڈائری سے منیر نیازی کی غزل

میری ساری زندگی کو بے ثمر اس نے کیا
عمر میری تھی مگر اس کو بسر اس نے کیا
میں بہت کمزور تھا اس ملک میں ہجرت کے بعد
پر مجھے اس ملک میں کمزور تر اس نے کیا
راہبر میرا بنا، گمراہ کرنے کے لیے
مجھ کو سیدھے راستے سے دربدر اس نے کیا
شہر میں وہ معتبر میری گواہی سے ہوا
پھر اس شہر میں مجھے نامعتبر اس نے کیا
شہر کو برباد کر کے رکھ دیا اس نے منیر
شہر بھر پر میں یہ ظلم میرے نام پر اس نے کیا

لائبہ رضوان: کی ڈائری سے نوشی گیلانی کی نظم

پرانی کتاب میں رکھی تصویر سے باتیں
آج برسوں کے بعد دیکھا ہے
اب بھی آنکھوں کا رنگ گہرا ہے
وہ ماتھے پہ سانولی سی لکیر
دل میں کتنے دیے جلاتی ہے
تیری قامت کے سائے کی خوشبو
گفتگو میں بہار کا موسم
کیوں مجھ ڈھنگ یاد رہے
کتنی حیراں ہوگئی خود پر
میں تجھے آج تک نہیں بھولی
پچھلے موسم کی یاد باقی ہے

مہناز فاطمہ: کی ڈائری سے شہزاد احمد کی غزل

شامل نقش کارواں ہیں ہم
اب فقط یاد رفتگاں ہیں ہم
ہم وہ آنسو کہ جو چھلک نہ سکے
یعنی اک سعی رائیگاں ہیں ہم
جس سے کل زندگی میں نمی تھی
اب اسی آگ کا دھواں ہیں ہم
دیکھنے میں گرچہ شمع خموش
جگمگائیں تو کہکشاں ہیں ہم
سمٹ سکیں تو ایک قطرۂ اشک
پھیل جائیں تو بیکراں ہیں ہم
ہم کہ ارزاں ہوئے سر بازار
نہ ملیں تو بہت گراں ہیں ہم
دل کی دھڑکن بھی سو چکی شہزاد
کوئی آواز دو کہاں ہیں ہم

شازیہ ثمن: کی ڈائری سے امجد اسلام امجد کی نظم

چن لو اپنے اپنے خواب

چن لو اپنے اپنے خواب
اب ڈھیر لگا ہے خوابوں کا
گلابوں اور مہتابوں کا
ہر آنکھ طلب سے بوجھل ہے
ہر خواب کسی کی منزل ہے
یہ شام سمے کا دھندا ہے
ہر وقت یہاں پر مندا ہے
ایمان کی قیمت دو آنے
احسان کی قیمت دو آنے
توقیر ملے گی دو آنے
تشہیر کی قیمت دو آنے
ہر خواب کی قیمت دو آنے
چن لو اپنے اپنے خواب

عطیہ شیخ: کی ڈائری سے ساحر لدھیانوی کی نظم

خون اپنا ہو یا پرایا ہو
نسل آدم کا خون ہے آخر
جنگ مشرق میں ہو یا مغرب میں
امن عالم کا خون ہے آخر
بم گھروں پر گریں یا سرحد پر
روح تعمیر زخم کھاتی ہے
کھیت اپنے جلیں یا اوروں کے
زیست فاقوں سے تلملاتی ہے
فتح کا جشن ہو کہ ہار کا سوگ
زندگی میتوں پہ روتی ہے
جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی
بھوک اور امتیاج کل دے گی
اس لیے اے شریف انسانوں
جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے
آپ اور ہم سبھی کے آنگن میں
شمع جلتی رہے تو بہتر

☆☆☆

حنا کی محفل

امان اللہ انجم ---- چناب نگر

س: ع غ جی! لڑکیوں کو دیکھتے ہی لڑکوں کے ہاتھ فوراً اپنے سر کی طرف کیوں چلے جاتے ہیں؟

ج: پچھلے گومڑ یاد آ جاتے ہیں۔

س: یہ لڑکیوں کی عمر سولہ پر آ کے سٹاپ کیوں ہو جاتی ہے؟

ج: کیونکہ اس سے آگے پھر بس سٹاپ شروع ہو جاتا ہے۔

س: سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں کیا واقعی؟

ج: جی ہاں اس کا قد آنکھ جتنا جو ہے۔

س: ع جی غ جی! کیا کبھی الو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے؟

ج: نہیں ابھی آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔

سباس گل ---- رحیم یار خاں

س: کس قدر ستم ظریفی ہے کہ اتنی گرمی میں؟

ج: آئس کریم بھیج دی وہ بھی رحیم یار خاں؟

س: اف کس قدر کنجوس ہیں آپ، ڈٹ فرٹی نہ سہی ٹوٹی پھوٹی آئس کریم ہی پیش کر دیتے اتنے عرصے بعد حنا کی محفل میں آئے ہیں کچھ تو حق میزبانی ادا کیجیے۔

ج: آئس کریم بھیجی تو ہے مگر رحیم یار خاں کی گرمی میں پگھل گئی ہوگی۔

محمد بلال فیاض ---- ملتان

س: مناسب الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پُر کریں۔ انعام میں خیالی پلاؤ کی دس عدد دیکیں؟

ج: آپ سے کسی اور انعام کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔

س: وجود ''زن'' سے ہے اس کائنات میں..... (جنگ، بھنگ، سنگ)؟

ج: ہم تو رنگ کہتے ہیں تم جو مرضی سمجھو۔

س: سچائی اور ایمانداری ہم سے یوں دور بھاگ گئی جیسے اجڑے باغ سے ..... (طوطے، شتر مرغ، کوے)

ج: اب تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو یہ تو تم ہی بتا سکتے ہو۔

س: زبان کے بال بوتے پر زندہ ہے وہ ..... ہے۔ (کالج گرل، گھریلو خاتون، ملازم پیشہ عورت)؟

ج: جو بھی ہے وہ ہے تو عورت۔

س: ایک پولیس آفیسر ماہانہ..... روپے کماتا ہے۔ (ساٹھ ہزار، ستر ہزار، نوے ہزار)؟

ج: بس بس یہ [illegible] آفیسر کے ساتھ زیادتی ہے۔

س: بہادر شوہر اسے کہتے ہیں جو بیوی کے..... سے بچا رہتا ہے؟ (سینڈل، بیلن)

ج: اسے بہادر نہیں بھگوڑا شوہر کہتے ہیں۔

میاں منیر احمد انجم ---- فیصل آباد

س: گرمی سے بچنے کا آسان حل؟

ج: مری چلے جاؤ۔

س: اور اس سے فرق نہ پڑے تو؟

ج: سیاچن چلو جاؤ۔

س: ارے آپ تو خود گرم ہو گئے۔

ج: آپ کو کیسے اندازہ ہوا؟

س: شعر کا جواب دیں

کبھی حقیقت کبھی خواب ہے
عشق ہے یا عذاب ہے

ج: عشق نے زندہ و تابندہ رکھا ہے ورنہ موت سی دل میں ترازو ہے کوئی مدت سے

بشریٰ علوی ---- راولپنڈی

س: میں خودکشی کرنا چاہتی ہوں؟ آسان طریقہ بتائیں؟

ج: بازار سے اشیاء ضرورت کی قیمتیں معلوم کر لیں۔

س: آپ نے جو وعدے کیے وہ سارے جھوٹے نکلے کیوں؟

ج: میں جھوٹا وعدہ نہیں کرتا۔ آپ سے سمجھنے میں غلطی ہو گئی ہوگی۔

عابد محمود ---- ملکہ ہانس

س: ع غ جی بڑے بے مروت ہیں آپ میں کافی عرصہ آپ کی محفل سے غائب رہا ہوں لیکن آپ نے جھوٹے منہ بھی کبھی خبر تک نہ لی؟

ج: خبر تو لی تھی مگر ملکہ ہانس والوں کی خوشی دیکھ کر نہ پوچھنا ہی مناسب سمجھا۔

س: ایسا گم ہوں تیری یادوں کے بیابانوں میں
دل نہ دھڑکے تو سنائی دیتا نہیں کچھ بھی

ج: میں چند دن روؤں گی رو کر چپ کر جاؤں گی
تیری بے وفائی کے درد کو بھول جاؤں گی
دستور زمانہ کارساز قدرت ہی ہے
چند دن یاد رکھوں گی پھر بھول جاؤں گی

س: کہتے ہیں جانے والے کو نہ روکو کہ بھرم رہ جائے۔ یہ بات کہاں تک سچی ہے؟

ج: تم کوشش کر کے دیکھ لو سچ جھوٹ کا خود ہی پتہ چل جائے گا۔

ج: جب تک زندگی ہے تب تک انسانیت کی مات کی جا سکتی ہے۔

س: عظمیٰ اعجاز سے کہیے کہ ہمارا فون نمبر حنا کے آفس سے لے لیں بھیا اتنا سا کام بھی نہیں کریں گے کیا؟

ج: حنا کے آفس میں ہوگا تو عظمیٰ اعجاز لے گی۔

سہیلہ خان ---- جھنگ صدر

س: ہیلو عیار جی گنج پر بال نکلے یا پھر؟

ج: کس کی گنج پر؟

س: برا مت مانئے گا میری سہیلیاں پوچھ رہی تھیں؟

ج: میں کیوں برا مانوں برا تو وہ مانے گا جس کی تم نے مالش کی تھی۔

س: گدھے کے ساتھ آپ کو کھڑا دیکھا انتخاب کرنا مشکل تھا کہ ان میں سے آپ کون سے ہیں پلیز ذرا بتائیے گا کہ آپ کون سے والے تھے۔

ج: جو تمہاری طرف گیا تھا وہ میں نہیں تھا۔

س: دنیا میں اس سا منافق نہیں کوئی؟

ج: لیکن وہ تمہارے مقابلے میں کچھ نہیں۔

س: وہ دیکھ مجھے جب بھی ایک آنکھ دبا لیتا ہے کیا اس نے ابھی ابھی آپریشن کروایا ہے؟

ج: ہاں دوسری ابھی بند نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر واجد نگینوی ---- کراچی

س: دنیا میں انسان کو کیا کیا غم ہیں؟

ج: ایک تو محبت ہے اور دوسرے اور بھی ہیں آپ کو کیا غم ہے؟

س: صحت مند رہنے کا سب سے اچھا طریقہ کیا ہے؟

ج: غموں سے چھٹکارا حاصل کر لو۔

س: ''دور کے ڈھول سہانے'' کیا یہ سچ ہے؟

ج: بالکل ہم بھی ملیر گئے تھے مگر وہاں تو.....

☆☆☆

ثمینہ احتشامی

چند دستر خوان

اچار گوشت

اشیاء

گوشت	ڈیڑھ کلوگرام
لہسن، ادرک (پسا ہوا)	کھانے کا ڈیڑھ چمچ
پیاز	۲ عدد
دہی	ڈیڑھ پیالی
لال مرچ (پسی ہوئی)	کھانے کے ۲ چمچ
ہلدی	چائے کا ایک چمچ
دھنیا (پسا ہوا)	کھانے کے ۲ چمچ
نمک	کھانے کا ڈیڑھ چمچ
تیل	۲ پیالیاں
سونف	چائے کا ایک چمچ
رائی	چائے کا ایک چمچ
میتھی	چائے کا ایک چمچ
کلونجی	چائے کا ایک چمچ
زیرہ سفید	چائے کا ایک چمچ
ہری مرچیں بڑی	۸ عدد
لیموں	۱ عدد

ترکیب

سونف، رائی، میتھی، کلونجی اور زیرہ سفید کو باریک کوٹ کر ایک جگہ رکھ لیں۔ تیل گرم کر کے اس میں پیاز، بادامی رنگت ہونے تک تل لیں۔ اب اس میں گوشت، لہسن، ادرک، نمک اور تمام مسالے ڈال کر بھون لیں۔ پھر دو گلاس پانی ڈال کر ابال لیں اور آنچ دھیمی کر کے گوشت گلنے کے لیے ڈھانپ دیں۔ گوشت گل جائے تو اس میں دہی ڈال کر بھون لیں۔ تیل اوپر آ جائے تو مسالے بھری مرچیں ڈال دیں اور اس کے ساتھ ہی لیموں کا عرق چھڑک کر دس منٹ دم دے کر اتار لیں۔ لذیذ اچار گوشت، نان کے ساتھ پیش کریں۔

بھرے ہوئے ٹماٹر

اشیاء

سرخ ٹماٹر	آٹھ عدد
پیاز	ایک عدد
لہسن	دو تین جوے
پہاڑی مرچ	ایک عدد
ابلے ہوئے چاول	دو پیالی
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
پنیر (کدوکش کیا ہوا)	آدھی پیالی
نمک	آدھا چمچ چائے کا

ترکیب

سب سے پہلے اون کو ۱۸۰ ڈگری سینٹی گریڈ پر گرم کر لیں۔ ٹماٹروں کی اوپر سطح کو تیزی دھار چاقو کی مدد سے کاٹ لیں ارو اوپری سطح کے قتلوں کو ایک پلیٹ میں رکھ لیں۔ چمچے کی مدد سے ٹماٹر کے اندر سے گودا اور بیج وغیرہ نکلا دیں اور ٹماٹروں کے خول کو احتیاط سے رکھ لیں۔ ایک چوتھائی پیالی پانی میں لہسن اور پیاز چل کر ڈال دیں اور اسے پانچ منٹ تک پکائیں۔ پھر اس میں ابلے ہوئے چاول، پنیر اور نمک ملا دیں۔ جب کہ پہاڑی مرچ اور ہرا دھنیا بھی باریک کتر کر اس میں شامل کر دیں اور تمام اشیاء اچھی طرح آپس میں ملا دیں۔ اب یہ آمیزہ ٹماٹروں کے خول میں چمچے سے بھر دیں اور ٹماٹروں کی اوپری سطح کے قتلے ان پر ڈھانپ دیں۔ نان اسٹک بیکنگ ٹرے میں یہ بھرے ہوئے ٹماٹر رکھیں اور اون میں ۱۸۰ ڈگری سینٹی گریڈ پر پندرہ منٹ کے لیے بیک کر لیں۔ یہ بھرے ہوئے ٹماٹر سب ہی پسند کریں گے۔

آلو کے کٹلس، قیمے کے ساتھ

اشیاء

آلو	آدھا کلو
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
ہری مرچ	۶ عدد
پودینہ	ایک گٹھی
نمک	آدھا چمچ چائے کا
قیمہ (باریک پسا ہوا)	۲۵۰ گرام
لال مرچی (پسی ہوئی)	آدھا چمچ چائے کا
تیل (تلنے کے لیے)	حسب ضرورت
انڈے	دو عدد
پیاز	ایک عدد
ڈبل روٹی کا چورا	ایک پیالی

ترکیب

آلو ابالنے کے لیے رکھ دیں۔ دوسرے برتن میں دو یا تین چمچے تیل ڈال کر کٹی ہوئی پیاز کو سنہری رنگت ہو جانے تک تلیں۔ اس میں قیمہ دھو کر ڈال دیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں تھوڑی سی لال مرچیں اور نمک بھی ڈال دیں۔ اسے تھوڑی دیر تک بھونیں اور پھر ایک پیالی پانی ڈال کر آنچ ہلکی کر دیں۔ جب قیمہ تیار ہو جائے تو اس میں دھنیا، ہری مرچ اور پودینہ باریک کاٹ کر ڈال دیں۔ آلو ابلنے کے بعد انھیں چھیل کر پیس لیں اور بھرتا سا بنا لیں۔ اس میں نمک اور پسی ہوئی لال مرچیں اپنی مرضی کے مطابق لے کر شامل کریں۔

اب اس مرکب کو ہاتھ میں لے کر اس طرح پھیلائیں کہ یہ پوری ہتھیلی پر پھیل جائے اور جو قیمہ آپ نے پہلے سے تیار کر رکھا تھا، اس میں سے تھوڑا سا قیمہ لے کر ہتھیلی پر رکھے آلو کے بھرنے کے درمیان میں رکھیں اور اسے دوسرے ہاتھ کی مدد سے کباب کی شکل میں چپٹا کر لیں۔

جب اس طرح سارے کٹلس تیار ہو جائیں تو فرائی پین میں تیل گرم کریں۔ ایک پیالے میں انڈے توڑ کر پھینٹ لیں اور نمک شامل کر لیں۔ کٹلس کو پھینٹے ہوئے انڈے میں ڈبو کر ان پر ڈبل روٹی کا چورا اچھی طرح لگائیں اور پھر انھیں فرائی پین میں ڈال کر تل لیں۔ یہ کٹلس کسی بھی قسم کی چٹنی کے ساتھ کھانے میں بہت خوش ذائقہ محسوس ہوں گے۔

آلو کے بڑے

اشیاء

آلو	ایک کلوگرام
لہسن	دو تین جوے
پنیر	۱۰۰ گرام
سیاہ مرچ (پسی ہوئی)	ایک چمچ چائے کا
انڈے	دو عدد
نمک	ایک چمچ چائے کا
ڈبل روٹی کا چورا	آدھی پیالی

ترکیب

اون کو دو سو ڈگری سینٹی گریڈ پر گرم کر لیں۔ آلوؤں کو ابال لیں۔ جب گل جائیں تو ان کا چھلکا اتار کر انھیں چل لیں اور اس میں لہسن چل کر ملا دیں۔ پنیر کو کدوکش کر لیں اور نمک، سیاہ مرچ، کے ساتھ آلوؤں میں شامل کر دیں۔ تمام اشیاء آلوؤں میں اچھی طرح مل جائیں تو ان کے کوفتوں کی شکل کے گول گول بڑے بنا لیں۔ انڈوں کی سفیدی اچھی طرح پھینٹ لیں اور ان میں آلو کے بڑے ٹرے میں ڈبو کر روٹی کے چورے میں الٹ پلٹ کریں اور نان اسٹک بیکنگ ٹرے میں انھیں رکھ دیں۔ ٹرے کو اون میں دو سو ڈگری پر تیس منٹ کے لیے رکھیں یہاں تک کہ آلو کے بڑے بادامی رنگت اختیار کر جائیں۔ آلو کے بڑے خستہ اور مزے دار ہونے کے سبب بچے بہت شوق سے کھائیں گے۔

دہی پھلکیاں

اشیاء

بیسن	ایک پاؤ
سرخ مرچ، نمک	حسب ضرورت
زیرہ سفید	ایک تولہ
لہسن	ایک بڑی پوتھی
پیاز	دو چھٹانک
دھنیا سبز، پودینہ	دو تولے
سیاہ مرچ	دو ماشے
انڈا	ایک عدد
دہی	ایک کلو

ترکیب

پہلے پیاز کو باریک تراش لیجئے اور تمام چیزوں کو باریک پیس کر بیسن میں ملا لیجئے اور پانی ڈال کر بیسن کو اس قدر پھینٹ لیں کہ سفید ہو جائے پھر پیاز بھی ڈال دیجئے او گھی یا تیل میں پھلکیاں تل لیجئے۔ پانی میں تھوڑا نمک ڈال کر پہلے پاس رکھ لیجئے اور پھر پھلکیوں کو کڑھائی سے نکال کر پانی میں ڈالئے جب سب پھلکیاں تل لیں تو پانی سے نکال کر انہیں نچوڑ لیجئے اور دہی میں ڈال دیجئے۔ ضرورت ہو تو مزید نمک اور سرخ مرچیں پیس کر چھڑک لیجئے۔

پالک کے پکوڑے

اشیاء

پالک	ایک گٹھی
بیسن	ایک پاؤ
لہسن	چھ جوئے
سبز مرچ	چار عدد
نمک سرخ مرچ	حسب ذائقہ
زیرہ سفید	ایک چائے کا چمچ
کھانے کا تیل یا گھی	حسب ضرورت

ترکیب

پالک کے پتوں کو دھو کر اسے کاٹ لیں۔ اور بیسن گھول کر اس میں کٹی ہوئی پالک، سبز مرچ کاٹ کر اور لہسن، زیرہ پیس کر ملا دیں۔ نمک اور سرخ مرچ بھی گھلے ہوئے بیس میں اچھی طرح ملا لیں۔ تھوڑی دیر کے لیے اسے چھوڑ دیں اور پھر کسی کڑاہی میں گھی یا کھانے کا تیل ڈال کر گرم کر لیں۔ جب گھی یا تیل اچھی طرح گرم ہو جائے تو اس میں پکوڑے ڈالتی جائیں۔ اس دوران آنچ ہلکی رکھیں تاکہ پکوڑے جلنے نہ پائیں۔ لیجئے آپ کے لیے لذیذ پکوڑے تیار ہیں کھائیے اور برسات کا لطف اٹھائیں۔

اسی ترکیب سے آلو بینگن اور پیاز کے پکوڑے بھی اسی ترکیب سے بنائے جاسکتے ہیں۔

آلو مٹر کے سموسے

اشیاء

آلو	ایک پاؤ
مٹر کے دانے	آدھا پاؤ
میدہ	آدھا کلو
نمک گرم مسالہ	حسب ضرورت

ترکیب

مٹر اور آلوؤں کو الگ الگ ابال لیجئے۔ پھر آلوؤں کو چھیل کر ان کا بھرتہ بنائیے اور نمک، گرم مسالہ اور کالی مرچیں پیس کر بھرتے میں ملا دیجئے اور پودینہ بھی شامل کر دیجئے۔

میدے میں آدھا پاؤ گھی ڈال کر سخت گوندھئے اور اس کی پوریاں بنا کر ان کے سموسے بنائیے اور ان میں سے یہ بھرتہ اور مٹر کے دانے بھر کر گھی میں تل لیجئے۔ جب بادامی ہو جائیں تو سمجھئے کہ تیار ہیں۔

☆☆☆

عبداللہ

خبرنامہ

کافی کی خوبی

یورپ میں کافی پینے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔ یہاں یہ گرم مشروب چائے سے زیادہ استعمال ہوتا ہے اور طبعی نقطہ نظر سے یہ جگر کے کینسر کے خلاف زبردست حفاظتی اقدام رکھتا ہے۔ یہ بات گذشتہ دنوں ایک تحقیق کے ذریعے سامنے آئی ہے۔ یہ تحقیق مردوں اور خواتین پر کی گئی۔ جس کے تحت تقریباً سے نو سال تک اور چالیس سال سے زائد عرصے کے خواتین اور مردوں کو زیر تحقیق رکھا گیا۔ تاہم ابھی تک یہ بات سامنے نہیں آسکی کہ کافی میں موجود کون سا جز جگر کے کینسر کے خلاف مدافعت رکھتا ہے۔ کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ کیفین ہے تاہم سبز چائے میں کیفین کی موجودگی کے باوجود جگر کے کینسر کے خلاف حفاظتی قوت کی موجودگی کا انکشاف نہیں ہوا ہے۔ تاہم ڈاکٹرز کافی میں موجود ''مکور جنک ایسڈ'' کے متعلق خاصے پرامید ہیں کہ یہی جز جگر کے کینسر کے تدارک میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ یاد رہے کہ جگر کا کینسر، کینسر کی تیسری بڑی قسم ہے جس سے دنیا میں خاصی اموات واقع ہوتی ہیں۔ اب تک اس مرض کے علاج میں بہت کم پیش رفت ہو سکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کافی کی اس خاصیت کو طبی دنیا میں خاصی اہمیت دی جا رہی ہے۔

صائمہ تو ہے ہی نمبرون

گجروں، بدمعاشوں، جٹوں، ملنگوں اور چوہدریوں کی پسندیدہ فنکارہ صائمہ ہے۔ اب جبکہ انڈیا سے ہمارے تعلقات بہتر ہو گئے ہیں تو اکستان کا سب سے بڑا سرکٹ یعنی پنجاب کی بھی نمبرون ہیروئین وہی بنے گی اور تو اور سکھوں کی بھی پسندیدہ ہیروئین وہی بنے گی۔

صائمہ نے کوشش تو بڑی کی کہ کسی طرح وہ اردو کلاس کی بھی پسندیدہ ایکٹریس بن جائے مگر سب کوششیں یہاں تک کامیاب ہوئیں کہ سید نور کی ''چوڑیاں'' کے بعد اسے ''ڈاکو رانی'' سے زیادہ کچھ نہ بنا سکے۔

صائمہ کی فلم ''لڑکی پنجابن'' آئی اور ساتھ ہی صائمہ کو پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر گئی۔

جی ہاں! اب صائمہ کو پنجابی فلموں کے ساتھ ساتھ پشتو فلموں میں مکالمے بولنا پڑ رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ بھی نمبرون کی ہی مارکیٹ ہے تو پھر ہے نہ ہر طرف صائمہ نمبرون۔

کچھ تو ہے

اشمعل کراچی مرکز کی ایک معروف اداکارہ ہے اس کا شمار ان فنکاراؤں میں ہوتا ہے جو راتوں رات ترقی کرتی ہیں اور اچانک ہی جن پر ہن برسنے لگتا ہے۔ اشمعل جو آج سے محض چار پانچ سال پہلے شعبہ اداکاری میں دریافت کی گئی تھیں باپ کے نہ ہونے کی وجہ سے بہن بھائیوں کی تمام تر ذمے داریاں اس پر عائد تھیں۔ کرائے کا ایک چھوٹا سا گھر لاتعداد مسائل اور ایک اس کی ننھی سی جان۔ مگر پھر صرف چار سال کے عرصے میں وہ ایک لگژری فلیٹ اور شاندار قسم کی کار کے ساتھ ساتھ لاکھوں کے بینک بیلنس کی بھی مالک بن گئی۔ اب جبکہ وہ شاندار زندگی کے سارے مزے لوٹ رہی تھی کہ ٹی وی کے ایک فنکار عارف شیخ یہ واہ ویلا کرتے پائے گئے کہ اشمعل کے پاس جو کچھ ہے وہ سب کچھ اس کی محنت کی کمائی ہے جو اشمعل نے اسے شادی کے سبز باغ دکھا کر اس سے ہتھیالی ہے۔

دوسری طرف اشمعل ہے ان دنوں کراچی کے ایک نامی گرامی بزنس مین کے ساتھ دیکھی جا رہی ہے۔ اس بزنس مین نے پچھلے دنوں اشمعل کی بہن کی شادی شاہانہ انداز میں ''بیچ لگژری'' میں کروائی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اشمعل کی شخصیت میں واقعی کوئی ایسا جادو ہے جو یوں ہر کوئی اس پر اپنا سب کچھ لٹانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن یاد رہے کبھی کبھی لٹنے والے انتقام لینے کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ جیسے کہ ان دنوں عارف شیخ اشمعل پر لٹائی گئی دولت کا حساب کرنے میں مصروف ہیں۔ عارف شیخ نے ٹھان لیا ہے کہ وہ اشمعل کو اس کی بے وفائی کا سبق سکھا کر رہیں گے ..... گویا اس وقت عارف شیخ کا وہی حال ہے کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔

لوٹ کے بدھو گھر کو آئے

مشی خان شعبہ اداکاری کا ایک مقبول نام ''عروسہ'' کراچی مرکز کی وہ سیریل ہے جس نے مشی خان کو شہرت عطا کی۔ اس کے بعد کئی ڈراموں میں کام کیا پھر اداکاری ترک کر کے ایئر لائن جوائن کر لی۔ کچھ ہی عرصے بعد اس کی شادی اور پھر طلاق کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ اس تمام عرصے جو کہ تین چار سال پر مشتمل ہے وہ ٹی وی پر بالکل نظر نہیں آئی لیکن پھر ایک دن اچانک ایک پرائیویٹ چینل پر وہ پاپ سونگ گاتے ہوئے دکھائی دی۔ پتہ چلا کہ ان دنوں وہ دوبئی میں رہ رہی ہے۔ مذکورہ بالا گانا بھی دوبئی میں ریکارڈ ہوا تھا۔ اب جبکہ لوگوں کو وہ یقین ہو چلا تھا کہ مشی اب دوبارہ ٹی وی پر کام نہیں کرے گی کہ وہ دنیا بھر گھومنے اور زمانے بھر کے کام کرنے کے بعد دوبارہ اداکاری کی طرف لوٹ آئی ہے ان دنوں وہ ایک سیریل کی ریکارڈنگ کروانے میں مصروف ہیں۔ یہ سیریل ہٹ کام ہے جسے ایوریڈی والے بنا رہے ہیں۔ مشی خان نے اس میں ایک کامیڈی رول کیا ہے۔

مشی نے یہ اعلان کیا ہے کہ اب وہ باقاعدگی سے ٹی وی پر کام کریں گی۔

مشی کی اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان خواہ کتنے ہی دعوے کرے اسے آخر کار لوٹ کے اپنے گھر کو ہی آنا پڑتا ہے جو اس کی پہچان ہے۔

ABBY ایڈورٹائزنگ ایوارڈ عمران اشرف کیلئے

شعبہ اشتہارات میں ABBY ایوارڈز کی تعارف کے محتاج نہیں اور انکی مسلمہ اہمیت کسی طور پر بھی ہمارے خطہ میں آسکر ایوارڈز سے کم نہیں۔ اڑتیسویں ABBY ایوارڈز کا انعقاد بھارت کے شہر ممبئی میں ہوا جسکی اہمیت اسلئے اور بھی بڑھ گئی کہ اب اس کا دائرہ کار نیپال، بنگلہ دیش اور سری لنکا تک بڑھا دیا گیا ہے۔ ایوارڈز کے ان مقابلوں میں پاکستان کو ایک اہمیت حاصل رہی جہاں ہمارے پینسٹھ (65) اشتہارات مقابلہ میں شریک تھے اور تین اشتہارات نے اس شاندار ایوارڈ کے حصول میں کامیابی بھی حاصل کی۔ ان مقابلوں میں پاکستان کی شمولیت PAPC کی محنت اور جدوجہد کا ثمر ہے جس سے ہماری اشتہاری صنعت کو بین الاقوامی سطح پر اپنی کارکردگی کو پیش کرنے کا موقع میسر آیا۔ نہ صرف یہ بلکہ ہندو پاک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ترانہ ''ورلڈ آف ایڈورٹائزنگ'' کے عنوان سے پیش کیا گیا جس کی تیاری پاکستان کے جناب عمران اشرف کی تخلیقی کاوش کا نتیجہ تھی اس نغمہ کو شرکاء جن کا تعلق مختلف ممالک سے تھا اور ایوارڈز کے منتظمین میں بے تحاشا پسندیدگی اور پزیرائی حاصل ہوئی۔ عمران اشرف ہماری اشتہاری صنعت کیلئے گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں مارکیٹنگ کے شعبے میں مختلف کورسز کرنے کے علاوہ وہ اپنے آپ کو اس تیز رفتار تبدیلیوں کے دور میں نئے خیالات اور رجحانات سے ہم آہنگ رکھنے کیلئے متعدد سیمینارز اور کانفرنسز میں بھی بڑھ چڑھ کر شریک رہتے ہیں۔ ADASIA جو اپنی نوعیت کا ایک بہت بڑا فورم ہے اسکے جے پور بھارت میں ہونے والے اجلاس میں بھی انکی بھرپور شرکت کو بڑا سراہا گیا وہ نہ صرف انسٹیٹوٹ آف پروفیشنل ایڈوانسمینٹ سے ٹیلی ویژن پروڈکشن اینڈ ڈائریکشن کا کورس کیئے ہوئے ہیں بلکہ انڈس ویلی اسکول آف آرٹس اینڈ آرکیٹکچر سے فلم میکنگ اور سینماٹوگرافی کے کورسز میں بھی فارغ التحصیل ہیں اور آجکل ایک اہم منصوبہ یعنی ''پاکستان کی اشتہاری صنعت کے پچاس سالہ دور'' پر ایک دستاویزی فلم کی تیاری میں مصروف ہیں جسمیں مختلف ایجنسیوں کی کارکردگی نمایاں اور راہیں متعین کرنے والے اشتہارات بھی شامل ہیں۔ عمران اشرف ملکی اور بین الاقوامی سطح پر جانے پہچانے اور شہرت یافتہ کاسمیٹکس بنانے والے FMCG ادارے سے وابستہ ہیں جہاں انکے کام میں اشتہارات کیلئے چاہے وہ A.T.L کی سطح کے ہوں یا B.T.L یا پھر میڈیا کیلئے فلموں کی تیاری ہو نئے افق نئے انداز اور نئے زاویوں کی تلاش ایک اہم عنصر ہے۔

ABBY ایوارڈز کی اس تقریب میں پاکستان کی جانب سے P.A.P.C کی بھرپور اور سرگرم نمائندگی کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور اس کے اعتراف کے طور پر عمران اشرف صاحب کو ایک یادگاری اعزاز سے بھی نوازا گیا اور ایڈورٹائزنگ کلب آف ممبئی اور دیگر شریک ممالک کی جانب سے اس امید کا بھی اظہار کیا گیا کہ اگلے یعنی انتالیسویں ABBY ایوارڈز میں بھی وہ پاکستانی اشتہاری صنعت کی اسی جوش وجذبہ کے ساتھ شرکت کو یقینی بنائیں گے۔

کس قیامت کے یہ نامے

جولائی کے شمارے کے آپ کے خطوط کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم خطوط کی طرف بڑھیں قارئین کرام سے ایک گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ہر سلسلے کے لیے علیحدہ علیحدہ کاغذ کا استعمال کریں لیکن بھیج ایک ہی لفافے میں دیں۔ ایک صفحے پر دوسرے سلسلوں کے لیے بھیجی جانے والی تحریریں ضائع کردی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بہنیں جو ہمیں افسانوں یا ناولٹ وغیرہ بھیجنا چاہتی ہیں وہ ایسی ایڈریس یعنی (ماہنامہ حنا ۲۰۵ سرکلر روڈ لاہور) پر اپنی تحریریں ارسال کریں۔

آیئے اب آپ کے خطوط کی طرف چلتے ہیں۔ یہ سب سے پہلا خط ہمیں فرحین ملک کا دہوریہ سے ملا ہے وہ لکھتی ہیں۔

دل خوشی سے جھوم اٹھا جب حنا ہاتھوں میں آیا اور دل کو اطمینان ہوا کہ آپ مجھ سے ناراض نہیں۔ میری تحریر دیر سے اس لیے پہنچی ہے کہ مجھے حنا ملتا ہے۔ ۹ یا ۱۰ کو۔ آج دوسرا موقع ہے کہ ۹ تاریخ سے پہلے ملا ہے۔

باجی آپ میرے افسانے یا ناولٹ کا انتظار کیجیے گا انشاء اللہ میں جلد بھیج رہی ہوں اور اگر قابل اشاعت نہ بھی ہوا تو کوشش کروں گی کہ میں اتنا لکھوں کہ حنا میں مستقل شرکت کرسکوں اور اس کی مصنفہ بن جاؤں۔ آہستہ آہستہ ہی سیکھا جاتا ہے ناں۔

جون کا حنا ملا تو خوشی دوبالا اس طرح سے بھی ہوئی کہ ایک تو یہ جلد مل گیا اور دوسرا میری سالگرہ بھی تھی۔ جس وقت یہ مجھے ملا اور مزہ تو مجھے مریم عزیز کے ناول ''ہم کو ہے تیری نظر میں رہنا'' نے دیا ہے۔ صرف یہی نہیں اب کسی ایک افسانے یا ناول کا بتاؤں گی تو دوسروں کی باری دوسرے نمبر پر آئے گی یعنی جون کا حنا مجھے الجھن میں ڈال گیا ہے کہ کس کی تعریف کروں اور کس ناولٹ یا افسانے کی نا کروں؟ ''ساحلوں کی اداسی'' ناول اچھا جا رہا ہے اور امید ہے اینڈ تک اچھا ہی رہے گا۔

''حاصل مطالعہ'' پڑھ کر علم میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ ''رنگ حنا'' میں سب بہن بھائیوں نے خوش کر دیا بلکہ لب خود ہی مسکرا دیئے۔ ''بیاض'' میں لگتا ہے سبھی نے میری پسند کے اشعار بھیجے ہیں۔ لائبہ رضوان آپ کی شاعری مجھے ہمیشہ پسند آتی ہے۔ اس کے علاوہ دسترخوان کو وہ کیا حنا کی محفل نے آج پہلی دفعہ مجھے کھل کر ہنسنے کا موقع دیا ہے۔ قیامت نامے میں حاضر تمام بہن بھائیوں سے ملاقات اچھی رہی۔

فرحین ملک! بے حد شکریہ پسند یدگی کا۔ ہمیں آپ کی یہ بات بے حد پسند آئی۔ اگر افسانہ شائع نہ بھی ہوا تو آپ پھر بھی اپنی تحریریں ارسال کرتی رہیں گی۔ ہم آپ کی تحریر کے منتظر ہیں آپ کی طرح ہمیں بھی یقین ہے کہ کسی بھی کام میں مستقل مزاجی کامیابی کا پہلا زینہ ہے۔ اگلے ماہ آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

فریحہ امید چوہدری: گوجرانوالہ سے لکھتی ہیں۔

اس دفعہ کا حنا اپنے ٹائٹل سے لے کر آخری صفحے تک بہت ہی اچھا تھا۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا۔ انٹرویو میں سمیع خان سے مل کر اچھا لگا اور پھر جلدی سے سلسلہ وار کہانی پڑھ کر خطوط تک پہنچے اور سب کی باتیں سن کر اچھا لگا۔ فریدہ آپی آپ کا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی حفاظت میں رکھتے۔

ناول تو دونوں ہی شاندار تھے۔ لیکن ''ہم کو ہے تیری نظر میں رہنا'' بہت اچھا تھا۔ لیکن مرتضیٰ کا کھلا اظہار کچھ برا لگا مانا کہ وہ اس کی بیوی تھی لیکن پھر حدود کا کچھ خیال رکھنا چاہیے۔ ناولٹ سو سو تھے۔ افسانے بھی اچھے تھے۔ سلسلہ وار سلسلوں میں ''رنگ حنا'' میں فرحین ملک آپ کا بھیجا ہوا رنگ تو ہماری مسکراہٹوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ ''بیاض'' میں اشعار کا انتخاب اب اچھا شائع ہو رہا ہے۔

فریحہ امید! اتنا عرصہ کہاں غائب رہیں آپ؟ جون کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ۔ مریم عزیز تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچا دی گئی ہیں۔

محمد ظفر اللہ ضیاء: کمالیہ سے لکھتے ہیں۔

جون کا شمارہ وقت مل گیا تھا۔ مگر مصروفیات کے باعث پڑھ نہ سکا۔ اس لیے خط لکھنے میں دیر ہوگئی۔ ہاکی پلیئر خالد سلیم کی باتیں پسند آئیں۔ ''پیارے نبی کی پیاری باتیں'' پڑھ کر دینی معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ اگر ممکن ہو تو ایک آدھ اسلامی کہانی بھی شامل اشاعت کرلیا کریں۔ افسانوں میں رخ چوہدری کا افسانہ ''میں تجھے چاہتا ہوں'' اور سعدیہ وحیدہ عالم کا افسانہ ''ہم بہت روئے'' قابل تعریف ہے۔

مستقل سلسلوں میں ''حاصل مطالعہ' رنگ حنا'' اور ''میری ڈائری'' قابل تعریف ہیں۔ ''بیاض'' پہلے سے بہت بہتر تھا۔ ''حنا کی محفل'' میں عین غین کے جوابات اچھے تھے۔ حنا کا دسترخوان میں شائع شدہ تراکیب عام سی تھیں۔

بھائی محمد ظفر صاحب! جون کے شمارے کے لیے پسند یدگی کا شکریہ۔ لیکن ایک بات کی وضاحت کیجیے جن افسانوں کی آپ نے تعریف کی ہے وہ تو شائع ہی نہیں ہوئے تو پھر؟ آپ اپنی رائے سے ہمیں نوازتے رہیے گا شکریہ۔

امان اللہ انجم: چناب نگر سے لکھتے ہیں۔

جون کا حنا اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ملا۔ دیکھتے ہی طبیعت خوش ہوگئی۔ ''انشاء نامہ'' میں ''پھر دیکھ بہاریں'' پڑھنے کے بعد کرکٹر نوید قریشی سے ملاقات ہوئی۔ بہت اچھی رہی۔ زرنین آرزو کا سلسلہ وار ناول ''ساحلوں کی اداسی'' دلچسپی اور خوبصورتی سے منزل کی طرف گامزن ہے۔ ناولٹ سبھی مزے کے تھے۔ افسانے بھی سارے دلچسپ تھے۔ اچھے لگے۔ رائٹرز کو دلی مبارکباد۔ مکمل ناول ''محبت مسکراتی ہے'' اور ''بچھڑنے سے ذرا پہلے'' دونوں ناول انتہائی دلچسپ تھے۔ ثمینہ نشاط اور مدیحہ تبسم کو مبارکباد پہنچا دیں۔

''میری ڈائری سے'' ہمیشہ کی طرح عمدہ غزلوں اور نظموں سے سجا ہوا تھا۔ عینا سحر کی تحریر پسند آئی۔ عظمیٰ اعجاز! شادی کی مبارک ہو۔ اب حنا کو بھول نہ جانا۔ آخر میں ایک تجویز کہ ''قیامت نامے'' کے صفحات بڑھا دیجیے تاکہ ہر ماہ سبھی بھائی بہن اپنی آراء تفصیل کے ساتھ پہنچا سکیں۔

بھائی امان! آپ کی آمد اور پسند یدگی کا شکریہ۔ اس مرتبہ آپ کی تحریریں دیر سے موصول ہوئی۔ اس لیے بقیہ سلسلوں میں آپ شامل نہیں ہو سکے کوشش کیا کریں کہ سترہ تاریخ تک آپ کی تحریریں ہمیں مل جائیں۔ اگلے ماہ بھی آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

☆☆☆

۔ اب بھی جینز شرٹ میں سکون محسوس کرتی ہوں۔ کپڑے چھوٹے بڑے پہننے سے فرق اس لیے نہیں پڑتا کہ شرم وحیا آپ کے دل میں ہوتی ہے لیکن منگنی کے بعد سے حقان کا کہنا تھا کہ میں دوپٹہ لوں تو میں نے کہا ٹھیک ہے۔ مجھے اچھا لگا کہ حقان کو میرا خیال ہے۔

○ انڈیا میں پاکستانی اداکاراؤں کے کام کرنے کے حوالے سے آپ کی کیا رائے ہے؟

☆ دیکھیں کلچرڈ آرٹ کے حوالے سے انڈیا میں کام کرنے کے متعلق ہمارے اختلافات نہیں ہونے چاہئیں۔ لیکن ایک فنکار کو یہ ضرور ذہن میں رکھنا چاہیے کہ وہ اپنے ملک کا سفیر ہوتا ہے۔ آرٹ کی کوئی حدود نہیں ہوتی۔ لیکن اس کا ملک اس کی شناخت ہوتا ہے۔ مثلاً میرا نے جو کام انڈیا میں کیا وہ کر سکتی ہیں لیکن میں اتنا بولڈ کام نہیں کر سکتی۔

○ ہمارے آرٹسٹ کے متعلق انڈین رویہ کیوں برا ہوتا ہے؟

☆ عزت لینا اور دینا آپ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ میں دو مہینے انڈیا میں رہی ہوں۔ لیکن میں نے وہاں بغیر بازوؤں کی قمیض تک استعمال نہیں کی حالانکہ ایسی ڈریسنگ میں پاکستان میں کر لیتی ہوں لیکن میں نے وہاں شلوار قمیض پہنی اور انھوں نے مجھے اتنی پذیرائی دی کہ میں نے اپنے ملک کی نمائندگی بہترین طریقے سے کی۔ میں نے دہلی میں فیشن شوز بھی کیے۔

○ انڈین موویز کیوں چھا گئی ہیں؟

☆ سیدھی سی بات ہے کہ وہ سرمایہ لگاتے ہیں اور لگانے والے کو ہی ملتا ہے محنت کرتے ہیں اور ایک فلم کے اندر ہر طرح کی تفریح دیتے ہیں ان کی کارکردگی اتنی اچھی ہے۔

○ انڈیا میں کوئی فلم سائن کی؟

☆ میں پہلی پاکستانی لڑکی ہوں جس نے انڈیا میں فلم سائن کی۔ لیکن ابھی وہ منظر عام پر نہیں آئی اور میں نے اس کی کہانی دیکھتے ہوئے اسے سائن کیا۔

○ اگر آرٹسٹ نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟

☆ اگر فلمسٹار نہ ہوتی تو کھلاڑی ہوتی۔ بچپن سے باسکٹ بال اور والی بال میں بہت انعامات جیتے۔ اس سوال کے ساتھ ہی ہم نے جیا علی سے اجازت چاہی۔

☆☆☆